سیاسی

مکتوباتِ رئیس الاحرار

مولانا محمّد علی

مُرتّبہ

ابو سلمان شاہجہان پوری

موڈرن پبلشرز
صدر کراچی

کتاب :- مکتوبات رئیس الاحرار مولانا محمد علی

مرتّب :- ابوسلمان شاہجہان پوری

طابع :- سندھ آفسٹ پرنٹرز کراچی

فون : ۲۱ ۷۴ ۵۴

اشاعت اوّل :- ۱۰ دسمبر ۱۹۷۸ء بہ تقریب صدسالہ یوم پیدائش

قیمت :- ۳۸
اڑتیس روپئے

ناشر

"موڈرن پبلشرز، ۸۶ گول ایمپریس مارکیٹ۔ کراچی۔ فون نمبر ۷۴۲۷۲"

محمد علیؒ

یک نفس جانِ نزار او تپید اندر فرنگ
تا مژہ برہم زنیم از ماہ و پرویں در گزشت
اے خوشا مشتِ غبارِ او کہ در جذبِ حرم
از کنارِ اندلس و از ساحلِ بربر گزشت
خاکِ قدس او را بآغوشِ تمنّا در گرفت
سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت
می نہ گنجد جز باں خاکی کہ پاک از رنگ و بوست
بندۂ کو از تمیزِ اسود و احمر گزشت
جلوۂ او تا ابد باقی بچشمِ آسیاست
گرچہ آں نورِ نگاہی خاور از خاور گزشت

(اقبال)

فہرست

پیش لفظ

مولانا محمد علی جوہر ہندوستان پاکستان کی ایک عظیم اور نامور شخصیت تھے۔ ان کی ایک ذات میں کئی شخصیتیں جمع ہوگئی تھیں۔ وہ انگریزی زبان کے صاحب طرز انشا پرداز تھے، وہ اردو کے شاعر تھے، وہ ایک بے مثال صحافی تھے اور ایک تاریخ ساز انگریزی ہفتہ وار کامریڈ اور روزنامہ ہمدرد کے مدیر تھے اور ساتھ ہی وہ برصغیر پاک و ہند کے صفِ اوّل کے سیاسی رہنماؤں میں تھے۔ وہ اردو زبان میں اپنے رشحاتِ قلم اور ادبی خصائص کی بنا پر بھی ادبا کی پہلی قطار میں جگہ پائیں گے۔ انھوں نے کئی شعبہ ہائے زندگی میں اپنے گہرے نقوش چھوڑے۔ وہ ایک عہد آفریں اور تاریخ ساز شخصیت تھے۔ ان کے اندر متعدد کمزوریاں ہونے کے باوجود بہت سی خوبیاں تھیں۔

مولانا محمد علی پر اردو اور انگریزی میں متعدد کام ہوئے ہیں۔ ان کے مضامین کے مجموعے چھپے ہیں، ان کی تقریریں جمع ہوئی ہیں اور ان کے خطوط بھی مدوّن کیے گئے ہیں۔ خود ان پر بھی چھوٹی بڑی متعدد تصنیفات آئی ہیں، ان کے اسفار کی روداد مرتب ہوئی ہے۔ ان پر مضامین کے مجموعے اور کئی رسالوں کے ان پر خصوصی نمبر شائع ہوئے ہیں لیکن کام کی وسعت، ضرورت، اہمیت اور معیار کو دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ ابھی بہت تھوڑا کام ہوا ہے یہ تمام کام تالیف و ترتیب کی قسم سے تعلق رکھتا ہے۔ تحقیق و تنقید کے لحاظ سے شاید ایک مقالہ بھی نہیں لکھا گیا۔ ان پر ایک جامع تحقیقی تصنیف کی ضرورت ہے، جو محمد علی کی ہمہ جہت اور ہمہ صفت شخصیت، ان کے افکار اور ان کی خدمات کے تعارف کا ذریعہ ہو، اور جس کے ذریعے ان کے عہد میں ان کے واقعی مقام کو متعین کیا جاسکے۔ مختلف موضوعات کے تحت ان کی تحریروں کو بھی اس طرح مرتب کرنے کی ضرورت ہے کہ ان کے عہد اور گرد و پیش کے آئینے میں ان کی فکر اور سیرت کے صحیح اور حقیقی خد و خال دیکھے جاسکیں۔ ان کی تقریروں اور خطبوں کو

از سرِ نو مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک اچھا نیا مجموعہ ان کی منتشر تقریروں اور بیانوں سے تیار کیا جا سکتا ہے جو ابھی تک "ہمدرد" کے اوراق میں چھپے ہوئے ہیں، اور کسی مستعد صاحبِ ذوق کی توجہ کے محتاج ہیں۔ ان کے خطوط کی تلاش اور ان کی ترتیب و اشاعت بھی وقت کی ایک اہم ادبی اور تاریخی ضرورت ہے۔ ہمدرد اور کامریڈ ایک بڑا اور سا اہم موضوع ہیں اور یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ابھی تک ایک مقالہ بھی ایسا نہیں آیا جس سے ان کی تاریخی اہمیت اور عظیم الشان قومی و ملی خدمات کا نقش واقعی اجاگر ہو سکے۔

مکتوباتِ محمد علی کا یہ مجموعہ اسی سلسلے کے کاموں میں سے ایک کام ہے۔ ان کے مکتوبات کے ابھی تک دو مجموعے منظرِ عام پر آئے ہیں۔ پہلا مجموعہ ۱۹۴۰ء میں پروفیسر محمد سرور جامعی نے مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع کیا تھا۔ اس مجموعے میں محسن الملک (۲ ۱/۲)، گاندھی جی (۱)، بی اماں (۲)، مولانا عبد الباری فرنگی محلی (۱)، سید محفوظ علی بدایونی (۱۳)، عبد الماجد دریابادی وغیرہ (۲۸)، سید سلیمان ندوی (۴)، قاضی عبد الغفار (۳)، مسعود علی ندوی (۱)، نواب جاورہ (۱)، میں سے ہر کسی کے نام، اس کے نام کے آگے قوسین میں مصرحہ تعداد میں اور مجموعی طور پر ناقص و کامل کل ستاون خط ہیں۔ دوسرا مجموعہ "خطوطِ مشاہیر" کے نام سے مولانا عبد الماجد دریابادی نے مرتب کیا اور اب تک اس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ہمارے پیشِ نظر نسیم بک ڈپو کا ۱۹۵۴ء کا ایڈیشن ہے۔ اس مجموعے میں مرتب کے نام علامہ شبلی نعمانی، لسان العصر اکبر الہ آبادی اور مولانا محمد علی جوہر کے خطوط ہیں۔ اس کا ایک حصہ محمد علی کے خطوط پر مشتمل ہے۔ یہ خطوط تعداد میں اکتیس ہیں۔ ان میں سے تین خط ایسے بھی ہیں جن میں مولانا دریابادی کے ساتھ ظفر الملک علوی اور سید محمد جعفری بھی مخاطب ہیں۔ یہ تینوں خط ۲، ۶ جون اور ۱۹ اگست ۱۹۲۸ء کے ہیں۔ جب مولانا محمد علی بغرضِ علاج یورپ تشریف لے گئے تھے۔ اور مولانا دریابادی ہمدرد کے ادارتی امور کے نگراں، ظفر الملک انتظامی معاملات کے ذمہ دار اور جعفری مرحوم ایڈیٹر تھے۔ چونکہ عبد الماجد دریابادی کے نام کے اٹھائیس خط سرور صاحب کے مجموعے میں بھی شامل ہیں اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ مجموعہ متن کی صحت، حواشی کی افادیت اور دریابادی کے ندرہ کار قلم سے ایک مختصر مگر گراں قدر

دیباچہ کے باوجود محمد علی کے خطوط کا مستقل بالذات مجموعہ نہیں ہے۔ اس کے نقص کا یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ جولائی تا ستمبر کے دس خطوط جو مولانا دریابادی اور ارکان ادارہ ہمدرد کے نام مشترکہ تھے، اس میں شامل نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ خطوط ہمدرد میں اشاعت کے لیے دے دیے گئے تھے۔ اور ان کا مسودہ مکتوب الیہ و جامع "خطوط مشاہیر" کے پاس محفوظ نہیں رہا تھا۔

ان دونوں مجموعوں میں خطوط کی کل تعداد چھیاسی ہے لیکن اگر تکرار کو نکال دیا جائے تو یہ تعداد صرف اٹھاون رہ جاتی ہے۔ مولانا محمد علی نے اپنی زندگی میں بلاشبہ ہزاروں خطوط لکھے ہوں گے اور ان کے بیشتر حصے کے ضائع ہو جانے کے خطرے کے باوجود یہ بات بھی بے شک کہی جا سکتی ہے کہ اب بھی سیکڑوں کی تعداد میں خطوط مختلف لوگوں کے پاس خصوصاً ان کے اہلِ خاندان کے پاس ضرور محفوظ ہوں گے اور ایک اچھی خاصی تعداد مختلف اخبارات و جرائد میں بھی منتشر ہوگی۔

ضرورت تھی کہ کوئی محقق اس موضوع کو اپنی تحقیق کی جولان گاہ بناتے۔ لیکن اپنے گرد و پیش اور معلومات کی حد تک "کسی اہل" کو اس جانب بڑھتے نہ دیکھ کر خود کچھ کام کرنے کا ارادہ کیا اور اب یہ مجموعہ اسی ارادے کے مطابق تگ و دو کا نتیجہ ہے۔ چونکہ ابھی سفر جاری ہے اس لیے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ منزل پر پہنچ گئے ہیں البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم نے اس سفر کی کچھ منزلیں ضرور قطع کی ہیں۔

مولانا محمد علی کے منتشر و غیر مدوّن خطوط کے لیے ہم نے جو سعی کی اس کے ابتدائی حاصل کے طور پر انتالیس (۳۹) خطوط کا یہ مجموعہ آپ کے سامنے ہے۔ اس سلسلے میں صرف مکاتیب جمع کر کے چھاپ دینا ہی مقصد نہیں رہا بلکہ متن کی صحت کا اہتمام بھی کیا ہے اور مجمل بیانات و اشارات کی وضاحت بھی کی ہے۔ اور جن مسائل کے تمام پہلو آج کے قاری کے لیے معلوم اور روشن نہیں ہیں ان پر ضروری حواشی اور آخر میں خطوط کی شخصیات پر نوٹس بھی شامل کیے ہیں۔ اب سے پچاس ساٹھ سال پہلے کی معروف شخصیات کو بھی آج کا قاری نہیں جانتا۔ نیز اس وقت کی بعض معمولی شخصیات، سیاسی کارکنوں اور علم و ادب کے مبتدیوں نے بعد میں کافی شہرت حاصل

کی ۔ ان سے واقف ہونا آج کی علمی و تاریخی ضرورت ہے ۔ اس مجموعے میں ان شخصیات کے سوانحی نقوش اُجاگر کرنے کے ساتھ ان کے افکار اور سیرت کے خصائص اور مولانا محمد علی سے ان کے تعلقات پر روشنی ڈالی ہے ۔

اس مجموعے کی اس خصوصیت پر بھی نظر رہنی چاہیے کہ مذکورۃ الصدر مجموعوں کا کوئی خط اس میں شامل نہیں کیا ہے اور اس کی یہ خوبی بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ اس کی زبان کو جدید اصول املا کے مطابق کر دیا ہے لیکن صرف اس حد تک کہ جہاں کہیں کسی لفظ کی تذکیر و تانیث مسلمہ و متفقہ قاعدے کے خلاف تھی اسے درست کر دیا ہے مثلاً ملامت، وکالت وغیرہ کہ متفقہ طور پر مونث تھے ، ان کے فعل یا اضافت میں "کی" کی بجائے "کیا" یا "کا" بنا دیا ہے ۔ اس اصلاح کے بعد بھی کئی الفاظ ایسے ہیں جو میری رائے کے مطابق مختلف جنس کے ہیں لیکن محمد علی کے حق اختلاف کی بنا پر انھیں جوں کا توں چھوڑ دیا ہے ۔ ایک زمانے میں دو لفظوں کو ملا کر لکھنے کا رواج تھا بلکہ آج بھی اس کی مثالیں مل جاتی ہیں لیکن صحیح یہ ہے کہ ہر لفظ الگ الگ لکھا جائے اس لیے جہاں کہیں "اس لیے" "کے لیے" "جاؤں گا" "کروں گا" وغیرہ الفاظ ملا کر لکھے گئے تھے ، انھیں آج کے صحیح اصول املا کے مطابق کر دیا ہے ۔ اسی طرح اعراب کو حروف کے اضافے سے ظاہر کرنے کا ایک زمانے میں رواج عام تھا اور مولانا محمد علی کے زمانے تک بعض بزرگ اس پر عمل پیرا تھے ۔ اس کی جھلک کہیں کہیں ان خطوط میں بھی نظر آتی تھی مثلاً اُس ، اُن کا املا اوس ، اون یا پہنچنا اور اس کے افعال کو "واو" کے ساتھ لکھنا ۔ آج چونکہ اس روایت کو ترک کر دیا گیا ہے ۔ اس لیے اس مجموعے کے مرتب نے بھی آج کے اصول املا کی پابندی کی ہے ۔ شروع میں اس اصول کی پابندی کی کوشش بھی کی کہ جس لفظ میں یائے مجہول سے قبل زیر آیا ہو وہاں ہمزہ کی بجائے یا کے نقطے دیے جائیں مثلاً لیے ، دیے ، پیے لکھا جائے ۔ کتابت میں ہ اور ھ کے محل استعمال کے فرق کو بھی محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے ۔ لیکن شروع ہی میں کاتب صاحب کو چونکہ ان اصول سے روشناس نہیں کرایا تھا اور مسودہ خطوط کی کتابت کے بعد یہ امر عسیر الحصول معلوم ہوا اس لیے پوری کتاب میں کامل طور پر ان اصول کی پابندی نہیں کی جا سکی ۔

میں یہاں تین صاحبوں کا خاص طور پر شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں عزیزم سید خالد سلمہٗ کا جن سے مجھے متعدد کتابیں استفادے کے لیے مل گئیں اگر یہ کتابیں عزیز موصوف سے دستیاب نہ ہو جاتیں تو ان سے استفادے کے لیے بڑی پریشانیاں اٹھانی پڑتیں۔ عزیزم عبدالغفار ہاشمی کا، جنھوں نے متعدد خطوط کی نقل میں اور بعض شخصیات کے متعلق معلومات کی تلاش اور نقل و اقتباس میں میری مدد فرمائی۔ برادرم محمد صابر ہمارے شکریہ کے خاص طور پر مستحق ہیں۔ اگرچہ ان سے تعارف ایک عرصہ پہلے ہو چکا تھا اور پہلی ہی ملاقات میں ان کی سلامت روی کا اندازہ ہو گیا تھا لیکن ان کے قرب و تعلق نے ان کے اخلاص اور ذوقِ علم و تاریخ کا جو نقش دل پر ثبت کیا اس کی تاریخ زیادہ طویل نہیں ہے۔ علم و تاریخ کے کئی موضوعات سے دلچسپی کے علاوہ انھیں مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد اور دیگر بزرگوں سے عقیدت بھی ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت کے لیے انھوں نے جو اہتمام کیا اور جس ذوق و شوق کا ثبوت دیا اس میں علمی و تاریخی ذوق اور مولانا محمد علی سے عقیدت، دونوں کا حصہ ہے۔ برادرِ موصوف اس سے قبل بھی کئی سو علمی و تعلیمی کتابیں چھاپ چکے ہیں اور اب اس مجموعۂ خطوط سے اسلامیانِ ہند کی تاریخ اور تحریکِ آزادی پر ایک سلسلۂ اشاعت کا آغاز کر رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مساعی کو مشکور اور اہلِ علم و نظر میں مقبول فرمائے گا۔

مقدمہ

مکتوبات رئیس الاحرار

ابتدائی ادبی ماحول:۔

مولانا محمد علی جوہر بنیادی طور پر انگریزی زبان کے انشا پرداز تھے۔ لیکن وہ اردو کے بھی کوئی معمولی ادیب نہ تھے۔ اردو ان کی مادری زبان تھی۔ انھوں نے شعر و ادب کے ماحول میں آنکھ کھولی تھی اور اسی ماحول میں وہ پروان چڑھے تھے۔ مولانا دریابادی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"(میں) رام پور میں اس زمانے میں پیدا ہوا تھا جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا۔ داغ، امیر، تسلیم، عروج، دہلی اور لکھنؤ کے آسمان کے ٹوٹے ہوئے ستارے سب رام پور کے آسمان سے نور افشانی کر رہے تھے۔ خود میرے خاندان میں بھی شعر گوئی کا ذوق ہوا۔ تین چار عزیز استاد داغ کے شاگرد ہوئے جن میں ایک میرے حقیقی بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر اور میرے چچا زاد بھائی اور خسر عظمت علی خاں اور ان کے بھائی حافظ احمد علی خاں صاحب شوق شامل تھے۔ گھر پر بارہا مشاعرہ ہوا۔ ذوالفقار علی روزانہ داغ کے گھر جاتے تھے۔ جو ہمارے مکان سے دور نہ تھا اور مجھے بھی لے جاتے تھے۔ داغ نے پہلے دن پوچھا کہو کچھ شعر بھی یاد ہیں۔ میری عمر بہت کم تھی۔ مگر بھائی نے کچھ شعر یاد کرا دیے تھے۔ جنھیں میں نہایت شان اور زور سے کڑک کر پڑھا کرتا تھا۔ میں نے داغ ہی کے چند شعر انھیں سنا دیے۔ سن کر پھڑک اٹھے اور اس کے بعد ہمیشہ اصرار رہا کہ اس بچے کو ضرور لایا کرو۔

جناب والا! اس کے بعد اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں تو بے جا نہ ہو گا۔ مگر میرا دعویٰ تو اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے۔ سنیے! میں نہ صرف شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں بلکہ اس کی توند پر کودا ہوں۔ اس کو ہاتھی بنا کر پیٹھ پر سوار رہا ہوں۔ غرض کوئی بے ادبی و گستاخی باقی نہیں رہی ہے جو میں نے شعر و سخن کی شان میں نہ کی ہو۔

شاعری کا شوق:۔

ابھی ان کی عمر صرف دس برس کی تھی کہ شعر گوئی کا انھیں خود بھی شوق پیدا ہو گیا۔ گیارہ برس کی عمر میں علی گڈھ گئے۔ وہاں کا ماحول ادبی اور شعر و سخن کی پرورش کے لیے نہایت موزوں تھا۔ وہاں بھی یہ شوق پروان چڑھتا رہا اور رفتہ رفتہ انھیں زبان پر قدرت حاصل ہوتی گئی اور فصاحت و بلاغت کے کے اصول و قواعد ان کے ذہن میں راسخ ہوتے گئے۔ اگرچہ ان کی ملّی زندگی کی مصروفیات نے بعد میں انھیں شعر و سخن کی طرف پوری توجہ کرنے کی فرصت نہیں دی لیکن شعر گوئی کا ذوق ان میں چونکہ فطری تھا۔ اس لیے یہ منہ سے لگی ہوئی کبھی چھٹ بھی نہ سکی۔ خصوصاً ۱۹۱۵ء کے بعد نظر بندی اور قید کے ایّام فرصت میں تو انھوں نے شعر و سخن کا اچھا خاصا ذخیرہ فراہم کر دیا۔ اگرچہ بہ حیثیت شاعر وہ کسی بلند مقام کے حامل نہیں بن سکے لیکن ان کی شاعری نہ صرف اسلامی افکار اور شخصی احساسات کی بنا پر قابل توجہ ہے بلکہ شاعرانہ محاسن کے لحاظ سے بھی اہمیت رکھتی ہے۔

محمد علی کے خطوط:۔

اسی طرح ان کی نثر کی بھی ایک ادبی حیثیت ہے اور خطوط نگار کی حیثیت سے تو ان کا مرتبہ ان کی دوسری حیثیت سے بہت بڑا ہے۔ ان کے جو خطوط مدوّن اور غیر مدوّن ہمارے سامنے ہیں اور اب تو منتشر و متفرق خطوط بھی دو

مدوّن و مرتّب مجموعوں کی شکل میں آپ کے سامنے آرہے ہیں، ان کی بنیاد پر انھیں اردو کے مشہور مکتوب نگاروں کی صف میں جگہ دی جائے گی۔

ان کے یہ خطوط نہ صرف سیاسی معلومات و افکار اور تاریخی اہمیت کی بنا پر قابل توجہ ہیں بلکہ اپنی ادبی خوبیوں کی بنا پر بھی یہ خطوط اہل ذوق کی نظروں کو اپنی طرف فوراً متوجہ کرلیتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ ان کی بنیادی حیثیت ادبی خطوط کی نہیں، سیاسی خطوط کی ہے، ان میں زبان کی شگفتگی، لطافت، روانی سادگی اور صحت کی خوبیاں بھی موجود ہیں اور محمد علی کے مزاج کی شگفتگی، طبیعت کی نکتہ رسی، ذہن کی دراکی اور ان کے مزاح، ظرافت اور زندہ دلی اور شوخی کے شاہکار موجود ہیں۔ ان کی نثر کی خوبیوں کا سب سے زیادہ اور کامل درجہ میں اظہار ان کے خطوط ہی میں ہوا ہے۔

ان کے خطوط کی لسانی اور ادبی خوبیوں اور محاسن کے علاوہ اہمیت کے اور بھی کئی پہلو ہیں مثلاً

محمد علی کا نقطۂ نظر:۔

یہ خطوط ہندوستان کی سیاسی تاریخ کے مطالعے کا ایک نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں۔ یہ نقطۂ نظر محمد علی کا نقطۂ نظر ہے۔ محمد علی کا نقطۂ نظر تجربے کے بعد خواہ کچھ ثابت ہو لیکن سرسری مطالعے ہی سے یہ صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ نقطۂ نظر نہ پورا کانگریس کا نقطۂ نظر ہے نہ لیگ کا۔ محمد علی کو ملک کے پیش آمدہ مسائل کے تصفیے میں کانگریس سے متعدد اختلافات تھے، لیکن وہ مسلم لیگ کی پالیسی سے بھی متفق نہ تھے۔ ہندوستان کی سیاسی تاریخ کے مطالعے میں محمد علی کے نقطۂ نظر کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لیے کہ یہ ایک آزاد نقطۂ نظر ہے۔

شخصیت کے مطالعہ کے نقطۂ نظر سے:۔

ان خطوط کی اہمیت کا دوسرا پہلو خود محمد علی کی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی ان خطوط کے آئینے میں محمد علی کی شخصیت اپنے تمام محاسن اور اپنی

تمام کمزوریوں کے ساتھ پوری طرح جلوہ گر ہے۔ اس شخصیت پر نہ کوئی ملمع ہے نہ اس کے چہرے پر غازے کی تہیں ہیں۔ اگر اس آئینے میں محمد علی کی شخصیت حسین نظر آتی ہے تو یہ اس کا فطری حسن ہے اور اگر ان کے چہرے پر کوئی داغ دھبّہ معلوم ہوتا ہے تو یہ ان کے اپنے چہرے کا دھبّہ ہے۔ ان کے خطوط میں ان کے اخلاق و سیرت، دوستی و مروّت، اخلاص و محبّت، دشمنی و نفرت، غصّہ اور اشتعال، مزاج کی شدّت، رویے کی سختی، ان کی انتہا پسندی کے نہایت پسندیدہ اور ناپسندیدہ نمونے ہیں۔ نیز اس آئینے میں ان کے قومی اور ملّی احساسات اور اسلامی اور قومی جذبات کی تصویریں نہایت خوبصورت نظر آتی ہیں۔ خطوط کے آئینے میں ان کی شخصیت کی جو تصویر دکھائی دیتی ہے اس کو دیکھنے والوں کا تاثر اور ان کی رائے مختلف ہوسکتی ہے، لیکن تصویر اپنے اصلی خدو خال اور حقیقی رنگ میں ہے۔ جہاں تک تصویر کا تعلق ہے ہر تحریر اپنے لکھنے والے کی سیرت و شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے۔ خصوصاً خطوط میں جو اشاعت کے لیے عام طور پر نہیں ہوتے۔ شخصیت کے نقش و نگار اور واضح ہوجاتے ہیں۔ اس کے باوجود بے تکلف دوستوں کی مجلس میں کہی جانے والی بات بھی زبانِ قلم پر آتی ہے تو اس میں کسی نہ کسی حد تک صنعت کاری ضرور پیدا ہوجاتی ہے۔ یہ صنعت کاری اگرچہ بالکل فطری ہوتی ہے لیکن بہرحال صناعت اور بناوٹ کی چھاپ اس پر لگ جاتی ہے لیکن اردو کے تمام مشہور اہل قلم کے خطوط کو اٹھا کر دیکھ لیجیے ان میں کامل درجے کی صنّاعی اور کاری گری صاف کارفرما نظر آتی ہے۔ بعض کے خطوط میں یہ نمایاں ہے۔ بعض کے خطوط میں یہ صنّاعی فطرت کا حسن اور بول چال کی زبان کا کمال بن گئی ہے اور اس وجہ سے اس کا احساس کم ہوتا ہے۔
محمد علی کے خطوط کو تمام دوسرے اہلِ علم کے خطوط میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ ان میں صنّاعی کا عمل بالکل نہیں۔ ان کی زندگی کا انداز، ان کی شب و روز کی مصروفیات اور ان کی خطوط نویسی کا طریقہ ہمیں معلوم ہے۔ انھوں نے فرصت کے اوقات گذاری کے لیے خطوط نہیں لکھے۔ بلکہ شب و روز کی انتہائی مصروفیتوں اور ہنگاموں میں ضرورتاً بلکہ مجبوراً قلم اٹھایا۔ پھر یہ بات نہایت

وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ انھیں دوبارہ اس خط پر نظر ڈالنے کی بھی فرصت نہ ملی ہوگی۔ اس کے علاوہ کسی سے محبت یا نفرت، اخلاص یا اشتعال کا اظہار جس انداز میں ہوا ہے اس میں صناعت اور بناوٹ کا شائبہ تک نہیں، مجھے یقین ہے کہ اگر انھیں سوچنے کا موقع ملتا یا وہ خط کے مضمون پر نظرِ ثانی فرما سکتے تو بعض اکابر کے متعلق وہ مضمون ضرور بدل دیتے۔ اسلوب تبدیل کر دیتے یا ممکن ہے وہ خط ہی روک لیتے۔ اس کے باوجود کہ انھوں نے غصّے اور اشتعال کا اظہار نجی کے خطوط میں کیا ہے اور وہ خطوط بھی ایک مدّت کے بعد شائع ہوئے۔ مثلاً مولانا غلام رسول مہرؔ کے نام خط میں علمائے اہل حدیث پنجاب کے متعلق انھوں نے جس سخت رویے کا اظہار کیا ہے۔ وہ خط بلاشبہ محمد علی کی زندگی میں یا متعلقہ حضرات میں سے کسی کی زندگی میں شائع نہیں ہوا۔ اس لیے اس خط کی بنا پر ان حضرات کے کسی ردِعمل کا سوال پیدا نہیں ہوتا لیکن مکتوب الیہ بھی تو اسی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ کیا یہ بات بھی اسی طرح وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ مہر و سالک کے قلب و دماغ پر بھی اس کا کوئی اثر نہیں ہوا ہوگا اور آیندہ ان کا رویہ اس اثر سے محفوظ رہا ہوگا؟ کیا محمد علی کی یہ جلی کٹی کہ تم میری شہرت سے جلتے ہو، حسد کرتے ہو، اشتعال انگیز نہیں ہے؟

مجھے صاف صاف کہنا چاہیے کہ ردِعمل ہوا اور بہت شدید ہوا۔ اس سے نہ علی برادران بچے نہ ان کے پیر و مرشد بخشے گئے۔ محمد علی کے اس رویے کی بدولت علمائے فرنگی محل کے خاندان اور ان کے محلے کے عرف "دار العلم والعمل" کو "دار الزنا والحمل" لکھا گیا اور سلطان ابن سعود سے منقول ایک روایت تحریر کی گئی کہ مولانائے فرنگی محل کے انتقال کی خبر سن کر انھوں نے کہا "مات الکلب" اگر یہ صحیح ہے تو اس کا ثواب محمد علی کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا اور یہ بات درست نہیں ہے تو یقین رکھنا چاہیے کہ میری رائے مہر و سالک کے بارے میں بہت خراب ہے۔

ان خطوط سے ان کی زندگی کے بعض سوانح پر بھی بڑی قیمتی روشنی پڑتی ہے کچھ عرصہ ہوا کراچی کے ایک روزنامہ میں محمد علی کے پٹھان یا غیر پٹھان ہونے کے

بارے میں بحث چلی تھی۔ ان کے ایک خط کے یہ جملے اس بحث میں برہان قاطع کی حیثیت رکھتے ہیں۔

"میں شیخ ہوں گو، رام پور افغانان میں پیدائش اور عرصے تک سکونت کے باعث کبھی کبھی "پٹھن ولی" پر اتر آتا ہوں لیکن پھر بھی شیخ ہوں۔"

اسی طرح عبدالماجد دریابادی کے نام یکم اگست ۱۹۱۶ء کے خط میں ان کا اپنے بارے میں یہ لکھنا ان کے مصنف کے لیے بڑی قیمتی شے ہے۔

"آپ نے مجھے رائے دی ہے کہ میں اس جبریہ تعطیل کے کے زمانے میں کوئی کتاب لکھنا شروع کردوں اور مجھ سے اس کی توقع بھی کی جا رہی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو جن لوگوں نے مجھ سے اس کی توقع کی ہے، وہ مجھ سے واقف نہیں ہیں۔ اولاً تو مجھ میں وہ صبر و تحمل اور استقلال ہی نہیں ہے۔ جو ایک عالم محقق میں ہونا چاہیے دوسرے جو کچھ علم و عقل رکھتا بھی ہوں، اس پر میرے جذبات کہیں زیادہ غالب ہیں۔"

یہی نہیں محمد علی کی زندگی، ان کی شب و روز کی مصروفیات، ان کے گرد و پیش، ان کے اسفار، معاصرین و متعلقین کے بارے میں معلومات، تفصیلات اور ان کی آرا کا ان خطوط سے پتہ چلتا ہے۔

دوسری شخصیات کے مطالعے میں خطوط کی اہمیت:۔

ان خطوط کے آئینے میں دوسروں کے چہروں سے بھی کہیں کہیں نقاب ہٹ جاتا ہے اور کبھی کبھی وہ اپنے اصلی خد و خال میں نظر آنے لگتے ہیں مثلاً مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے نام خط میں قاضی عزیز الدین کے بارے میں یہ انکشاف کہ انھوں نے حکومت برطانیہ سے یہ التجا کی تھی کہ وہ حجاز پر قبضہ کرکے سارے انتظامات کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔ لیکن خواجہ صاحب کی اس التجا اور خواہش و فکر پر تعجب نہ کرنا چاہیے، اس لیے کہ یہ سرسید احمد خاں کی تعلیم و تربیت کا لازمی نتیجہ تھا۔ اگر انگریز حکمراں ملت

اسلامیہ ہند پاکستان کا ''اولوالامر'' تھا تو قاضی صاحب کی خواہش اور برٹش استعمار کے حجاز پر قبضہ اور بلد امین اور مدینۃ النبی (علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات) کو اپنے زیر انتظام لے لینے کا بھی شرعی جواز موجود ہے۔

غرضیکہ یہ خطوط محمد علی کے مصنف کے لیے ان کے سوانح و افکار اور ان کے عہد کے اکابر و مشاہیر کے بارے میں بعض حقائق اور ان کے بارے میں محمد علی کے آرا کا نہایت قیمتی سرمایہ اور بہت اہم ماخذ ہیں۔

ادبی نقطۂ نظر سے خطوط کی اہمیت :۔

ان کے خطوط میں اسلوب کی ندرت کاری، تحریر کی شگفتگی، زبان کی سادگی و پرکاری اور بیان کی لطافت و دلکشی کی ایک نہیں متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن سید محفوظ علی بدایونی کے نام خط میں ان خوبیوں کے علاوہ اخلاص و محبت کی فراوانی اور انتظار کی بے تابیوں کے اظہار کی جو کیفیت ملتی ہے اس کی مثالیں دوسرے خطوط میں کم ملیں گی۔ سید صاحب کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

" سارا خط تمھارا میں نے پڑھا اور خوش ہوا۔ مگر بتاؤ وہ کون سا فقرہ تھا جس نے وجد کی حالت طاری کر دی ؟ سوچو، غور کرو اگر یاد نہ ہو تو پڑھو" عجب نہیں کہ مئی کی ابتدائی تاریخوں میں تم مجھے نوساری ہیں دیکھو"، ہائے اس فقرے نے وہ صحبتیں یاد دلا دیں جنھوں نے اب ایک عرصے سے بمبئی مجھ سے چھڑا دیا ہے۔ ارے کمبخت آ اور جلد آ۔ ع

بیا بیا کہ مرا طاقت جدائی نیست

خدایا ! وہ دن کب آئے گا کہ ایک جوان بھائی کے موٹے موٹے چکنے چپڑے گنھے ہوئے گال ایک بوڑھے بھائی کی چھوٹی داڑھی سے وابستہ ہوں گے ؎

خوشا وقتے و خرم روزگارے

کہ یارے۔ برخورد از وصل یارے

ظالم بس اب ظلم نہ کر۔ آہ کیوں نہیں آتا۔ آتش شوق شعلہ افگن ہے۔ آج سے ہر روز تیرا انتظار رہے گا۔ اگر ۱ر مئی کو نہیں آیا تو ۲ر مئی کو ضرور آجانا۔ اپریل سے بیزار مئی کا منتظر تیرا ہمدرد بھائی"

ایک زمانے میں محمد علی اور شوکت علی پر معافی مانگ کر جیل سے جان چھڑا لینے کا الزام تھا۔ اس میں ان کے ایک مخلص دوست رنگا ایر نے بھی شبہ کیا۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد رنگا ایر گرفتار ہوگئے۔ محمد علی نے انھیں ان کی گرفتاری کے بعد جو دلچسپ خط لکھا اس میں لکھتے ہیں۔

"میرے پیارے رنگیلے! کیا تمھارا خیال ہے کہ ہم لوگ باوجود اس نام نہاد معافی نامہ کے تم سے زیادہ دنوں تک جدا رہیں گے۔ میں سوچتا تھا کہ جب دوبارہ تم سے ملوں گا تو تمھارے جھریاں پڑے چہرے کو اس جرم کی سزا میں کاٹ کھاؤں گا کہ تم نے انڈی پنڈنٹ کے نام رنگا ایر کے خط میں ہم لوگوں کی بزدلی پر اس بال برابر شبہ کی بھی گنجائش کیوں رکھی۔ لیکن چونکہ تم موجود نہیں ہو اور ہمارا تمھارا سنگم آگرہ جیل ہی کے اندر ممکن ہے بشرطیکہ ہم کو سزائے قید دینے کے بعد حکامان بالا دست ہم تینوں "بدمعاشوں" کو تاج کے اس قدر قریب رکھنا پسند کریں۔ اس لیے میں تم سے اس خط کے ذریعے سے جو کبھی پوسٹ نہ ہوگا، یہ سوال کرتا ہوں کہ کیا اب بھی تمھارا خیال ہے کہ دو بڑے بڑے اور موٹے موٹے جسموں کی ایسی نشانیاں کبھی موجود ہیں جیسے کہ ہم ؛ اور شوکت علی جو اس بات کی کوشش میں سرگرم ہیں کہ معافی کے تنگ دروازے سے بھاگ کر رہائی حاصل کرلیں اور وہ دروازہ ایسا ہے جس سے تم نے خود اپنی نجات پسند نہ کی۔"

اگرچہ یہ ایک نہایت سنجیدہ مسئلہ تھا۔ محمد علی پر ایک الزام لگایا گیا تھا۔ اس کی وجہ خواہ شرارت ہو، خواہ ناواقفیت، محمد علی کو اس کا جواب دینا تھا، اور اگرچہ وہ جلسۂ عام میں جواب دے چکے تھے۔ لیکن جلسۂ عام کا بیان عوام کے لیے تھا

دوست کے لیے نہیں۔ دوست کو نامۂ محبت میں ٹوکنا تھا۔ محمد علی نے اسے ٹوکا لیکن اس میں بھی وہ اپنے فطری حسِ مزاح کو دبا نہیں سکے اور اس کے بعد کی سطروں کو پڑھ کر تو ممکن ہی نہیں رہتا کہ کوئی شخص اس سبک خرام نسیم مزاح سے اپنے دل کی کلی کو پھول بننے سے روک سکے اور شمیم مزاح کی عطر بیزی سے لب و رخسار، گلنار و معطر نہ ہو جائیں۔ محمد علی کے یہ جملے ملاحظہ ہوں۔

"شوکت علی نے ہر سوال کرنے والے کو قابلِ اطمینان جواب دے کر یہ یقین کرا دیا ہے کہ جنگ کے موقع پر وہ میدان میں کھڑے ہو کر مردانہ وار لڑیں گے اور ہرگز پشت نہ پھیریں گے۔ کیونکہ ان کا جواب یہ ہوتا ہے۔ آہ! آپ دیکھتے ہیں کہ میں اس قدر موٹا ہوں کہ بھاگ نہیں سکتا۔"

شوکت علی کے اس جملے پر ایک جملہ خود بھی جڑ دیتے ہیں۔ اتنا اچھا جملہ کہنے سے وہ اپنے آپ کو باز بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔

"اگر وہ اس قدر موٹے ہیں کہ بھاگ نہیں سکتے تو اس فربہی کی وجہ سے وہ بچ بھی نہیں سکتے۔"

محمد علی کی زندہ دلی، شگفتہ مزاجی اور شوخی کی کیسی عمدہ مثال ہے۔ اب ذرا اس جملے کی لطافت پر غور کیجیے اور سر دھنیے۔ بہت کم جملے ایسے ملیں گے جو زبان کی شگفتگی، بیان کی تازگی، زبان کی سادگی، اسلوب کی رنگینی و دلکشی اور لطافتِ مزاح میں اس چھوٹے سے جملے کی برابری کر سکیں۔

".... ہم لوگ (علی برادران) ایک ساتھ نظر بند کیے گئے اور ہم دونوں کا جرم یہ تھا کہ ہم معصوم تھے۔"

زبان کے حسن و لطافت کی بات زبانِ قلم پر آ گئی ہے تو اس جملے کی بھی داد دیجیے۔ شوکت علی سے محبت کے اظہار اور مفارقت کے عدم امکان پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"مصیبتوں نے ہم دونوں کو عجیب طرح سے ایک ہی بستر پر ڈال دیا ہے۔"

مولانا محمد علی نے لندن سے ۱۹؍اگست ۱۹۲۸ء کو جو خط عبدالماجد دریابادی ظفرالملک علوی اور محمد جعفری کے نام مشترکہ لکھا تھا یہ خط نہ صرف نہایت مفید معلومات پر مشتمل ہے بلکہ محمد علی کی شگفتہ نگاری، ذوقِ مزاح اور زندہ دلی کی بھی بہترین مثال ہے۔

"ہم یہاں سے چلے تو لڑکوں کو بھوک لگی تھی۔ اس لیے ووکنگ میں داخل ہوتے ہی کا پیرج ہوٹل ملا۔ وہاں موٹر روکی اور ہوٹل میں داخل ہو کر خانساماں یا "خانم ساماں" کی تلاش کی۔ ایک میم صاحبہ جو غالباً مالکہ تھیں نکل آئیں اور پہلے تو چائے دینے کا وعدہ فرمایا لیکن جب میں آگے بڑھا تو میں نے پوچھا کہ ع

کہیے کچھ اور بھی ہمّت ہو گی!

یہ لڑکے بھوکے ہیں۔ لنچ اب تک نہیں کھایا ہے تو انھوں نے گھبرا کر چائے دینے سے بھی انکار فرما دیا۔ ہم سب کا خیال ہے کہ انھیں "شیخ" سے خوف آیا اور ان کو اندیشہ ہوا کہ کہیں شیخ اپنی عبا میں ہوٹل کے چھری، کانٹے اور چمچے دبا کر نہ لے جائے اور کہیں مالکہ ہی کا مالک نہ بن بیٹھے۔ میں نے دو تین دن ہوئے اپنے مکان سے قریب ہی سینما میں وہ فلم دیکھا جس کا THE SHAIKH'S SON عنوان ہے اور جس میں ..... مراقش کے ایک نوجوان "شیخ زادہ" کا پارٹ ادا کرتا ہے۔ ان فلموں کو دیکھ کر تعجب نہیں۔ اگر ان ممالک والے اس اندیشے سے متردد ہوں کہ اگر شیخ زادوں کی دراز دستیاں یہ ہیں تو نہ معلوم خود "شیوخ" کی دراز دستیاں کیسی ہوں گی۔ جی میں آیا کہ ہوٹل کی مالکہ صاحبہ کو مجبور کیا جائے کہ قانون کی رو سے وہ ہمارا مطالبہ مسترد نہ فرمائیں لیکن ان کی سراسیمگی پر رحم آیا اور قصبے میں آگے جا کر رسٹوران میں چائے پی گئی۔"

تصدق احمد شیروانی کے نام محمد علی کا پورا خط ہی مزاح، زبان کی لطافت زندہ دلی، دوستانہ بے تکلفی اور کمال اخلاص و محبّت کا شاہکار ہے۔ اس سے ہر

طرح کے الگ الگ اقتباسات نقل کرنے کی بجائے صرف ایک اقتباس نقل کر دینا کافی ہے۔ اس لیے کہ یہ اقتباس تمام خصوصیات تحریر کا جامع ہے۔ محمد علی لکھتے ہیں۔

"اس کے بعد بلا میری رہنمائی کے تم نے وہ قبیح جرم کیا جس سے زیادہ ناجائز فعل کا ارتکاب اس زمانے میں غیر ممکن تھا جب کہ گورنمنٹ صلح، خاموشی اور عدم اشتداد کے لیے منت وسماجت کر رہی ہے اور تم نے یہ غضب کیا کہ صلح وامن واقعی قائم رکھا۔ میرے پیارے تصدق! کیا تم شوکت سے سبق نہیں سیکھ سکتے تھے۔ شوکت تمام ایشیا میں سب سے زیادہ قابل نفرت ہستی ہے اور یہ شخص محض اس لیے کہ ۷ x ۵ فٹ کے رقبے کے باوجود وہ عدم اشتداد کی پالیسی پر عمل کرتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ خراب بات یہ ہے کہ وہ واقعی ایک صلح کن شخص ہیں اور اس قدر امن پسند کہ ایک مرتبہ انھوں نے ایک چڑیا کو کھانے کے لیے اور شکار کے لطف کے لیے مار ڈالا اور اس کے لیے اب تک برابر پچھتایا کرتے ہیں اور اپنے اس فعل پر افسوس کیا کرتے ہیں۔ وہ کوئی شکاری نہیں ہیں اور نہ انھوں نے اب تک شکار کو ختم کیا ہے۔ اس بات کو بخوبی سمجھ کر کہ شوکت کی اس صلح وامن کی پالیسی نے دفتری حکومت میں کس قدر نفرت پیدا کر دی ہے۔ تم نے اس کے کرنے کی جرأت کیسے کی۔ تم خود ۷ x ۴ فٹ ہو اور اس وقت جب تم کو شیر نیستاں کی طرح گرجنا چاہیے تھا تم فاختہ کی بولی بول رہے تھے۔ جب کہ علی گڑھ کے خوش خلق کلکٹر کے لیے جس نے تم کو اپنے پہلے ہی خط میں "آپ کا نیازمند" تحریر کیا تھا جب کہ تم کو ان کا مخالف ہونا بھی گوارا نہ تھا۔ ایک چھوٹی سی، خونریز لڑائی کا انتظام پلیٹ فارم اور لکچروں کے ذریعے سے ہو رہا تھا۔ تم نے یہ منادی کرا دی کہ اس چھوٹے کرک شیتر کے بہادر سورما اپنی دلیری وبہادری کا ثبوت اپنی کامل غیر حاضری سے پیش کریں۔ اور اس سے بھی قابل لحاظ

بات یہ ہے کہ تم خود "علی گڈھ" سے جہاں اس جنگ کا انتظام ہو رہا تھا۔ دس میل کے فاصلے کے اندر ہی اندر تھے۔ اور جب تم لوٹ کر علی گڈھ آئے تو تم نے ایک سچے غیر تشدد آمیز تارک موالات کی طرح یہ گستاخی کی کہ شہر کے ان باشندوں کو ملامت کیا جو ناجائز خواہش و رغبت کے اثر سے کچہری کے حدود میں محض تماشے کی غرض سے چلے گئے تھے۔

خیال تو کرو کہ باوجود ان تمام خطاؤں کے تم نے یہ جرأت کی کہ عدالت میں کہا کہ "میں مجرم نہیں ہوں" تم مجرم تھے اور ضرور مجرم تھے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کیونکہ کیا تم عین شرارت کے وقت گرفتار نہیں کیے گئے۔ میں تم سے دریافت کرتا ہوں کہ یہ سچ ہے یا نہیں؟ جب کہ تم خود اپنے وکالت کے زمانے میں ان جھوٹے گواہوں سے دریافت کرتے رہے ہوگے جو بیشتر عدالت میں جھوٹی گواہی نہ دینے کی وجہ سے جھوٹ کہنے کی کافی جرأت رکھتے تھے۔ ہاں ہاں! میں تم سے یہ دریافت کرتا ہوں کہ کیا یہ سچ ہے کہ تم دوبارہ پولیس کو شکار کرنے سے روک رہے تھے۔ اور دنیا کا سب سے زیادہ قبیح جرم کر رہے تھے۔ یعنی امن وامان کی کوشش میں معروف تھے اور اس سے ان لوگوں کی مخالفت ہوتی تھی جو فساد و خونریزی کا عزم کر چکے تھے اور کیا یہ تم سمجھتے ہو کہ ایک سال کی قید سخت کی سزا جو تم کو کمشنر، کلکٹر، پولیس اور مجسٹریٹ کی امداد سے پرانے ساتھیوں اور دوستوں نے خوشی خوشی دی ہے۔ وہ ایسے جرم کے لیے جس کو کبھی کانوں نے بھی نہ سنا ہوگا، بہت زیادہ تھی۔

نہیں، پیارے تصدق! حقیقت یہ ہے کہ تم ایسے بدمعاش اور اخلاقی حیثیت سے اس قدر ذلیل تھے کہ تم کسی صورت سے اب آزاد رکھے نہ جا سکتے تھے۔ تم اور مجسٹریٹ جس کی لمبی داڑھی

کا تم نے اپنے خط میں ذکر کیا ہے جو تم نے اپنی گرفتاری، پیشی، اور سزا کے وقت لکھا تھا، مل کر ایک ہو گئے تھے اور یہ ہرگز ممکن نہ تھا کہ تم دونوں ایک ہی مقام پر رہتے تم اس قدر امن پسند تھے کہ امن سبھا تمھارے وجود کو برداشت نہیں کر سکتی تھی اور تم قانون کی پابندی میں اس قدر مبالغہ کرتے تھے کہ قانون و انتظام کے قائم کرنے والے تمھارے دشمن ہو گئے تھے۔ اور اس کے بعد ذرا اپنی صورت پر بھی غور کرو کیا تمھاری صورت سے ہمارے اس بیان کی تصدیق نہیں ہوتی جو ہم لوگوں نے تمھارے متعلق کہا تھا یعنی ان ڈاکوؤں کے گروہ کا ایک فرد جو راج شاہی جیل سے بھاگ گئے تھے۔ ورنہ تمھارے اس قدوقامت، تمھاری اس قلیل داڑھی جو نئی اگی ہوئی گھاس معلوم ہوتی تھی اور تمھارے اس چھوٹے کھدر کے کرتے سے جس سے پتا چلتا تھا کہ شاید کیمبرج کے بدمعاشوں سے تم نے اسے بدل لیا ہے، اور کس قسم کے انسانوں کا پتا چلتا تھا۔ سرکار، قومی سرکار کے معقول پائنیر کے بڑے لمبے لمبے ہاتھ ہیں اور وہ ڈاکو جو راج شاہی جیل سے بھاگا اس کو سنٹرل جیل نینی تال کے پاگل خانے میں بند کر دیا گیا ہے اور یہی اس کے لیے موزوں ہے۔ امن و سکون کی محبّت تمھارے دل میں بہت زیادہ تھی اور تم نے عقل سے کام نہیں لیا۔ اس لیے اسی میں تم کو امن و سکون سے رہنا ہے۔"

حکومت کے اعلان، پالیسی اور رویے پر محمد علی نے کیسا لطیف اور بھرپور طنز کیا ہے۔ نیچے کے چھ جملے اس دعوے کے ثبوت میں پیش کر رہا ہوں۔ ان میں "امن سبھا" سے اشارہ عدالت کی طرف ہے جس نے "عدم تشدد" کے ایک مجرم کو "نقضِ امن" کے الزام میں ایک سال قید بامشقت کی سزا دی تھی اور قانون وانتظام کرنے والوں سے مراد پولیس اور سول حکام ہیں محمد علی لکھتے ہیں۔

"تم اس قدر امن پسند تھے کہ" امن سبھا" تمھارے وجود

کو برداشت نہیں کرسکتی تھی اور تم قانون کی پابندی میں اس
قدر مبالغہ کرتے تھے کہ قانون وانتظام کے قایم کرنے والے تمھارے
دشمن ہو گئے تھے۔

محمد علی کی یہ معلوم خصوصیت ہے کہ وہ محبت ونفرت میں انتہا پسند تھے۔ انھوں نے جس سے محبت کی ٹوٹ کے محبت کی اور جس سے نفرت کی دل سے نفرت کی۔ وہ خاموش رہ سکتے تھے؟ اگرچہ ایسا اتفاق بہت کم ہوا، لیکن جب کبھی انھوں نے کسی کے خلاف قدم اٹھایا تو اس کا پیچ بلکل لگا نہیں رکھا۔ یہاں صرف ان کے کمال اخلاص و محبت کی مثال میں چند سطریں پیش کرنا چاہتا ہوں مولوی محمد عرفان کے نام خط میں لکھتے ہیں۔

"ہفتہ وار نہ سہی تو دو ہفتے میں ایک بار تو تم براہِ راست
چھ سطور ہی مجھے لکھ سکتے تھے۔ اگر یہ بھی نہیں کرسکتے تو پھر یرانا
سلسلہ بند یوں بھی میں چند دن کا مہمان ہوں۔ یہ کہنا کہ فرصت
نہیں ملتی۔ پیسہ نہ ہونے کے باعث بہت پریشان تھے وغیرہ وغیرہ
بے کار کے عذرات ہوں گے اور بدتر از گناہ۔ تم گپ بازی اور
سیر سپاٹے کے عاشق ہو۔ کام سے وقت ملا تو اس میں صرف کیا
بھلا ایک دور افتادہ مریض کو دو سطریں لکھنے کے لیے وقت کس
طرح ملتا۔

نیاز فتح پوری نے مولانا ابوالکلام آزاد کی زبان کی شگفتگی، لطافت اور شیرینی کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی زبان سے تو گالیاں بھی بھلی لگیں گی۔ یہاں بات صرف لبوں کی شیرینی کی ہے۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

محمد علی کے کمال اخلاص وحسن محبت کی یہ ایسی مثال ہے کہ اگر موقع ملتا تو کبھی خط نہ لکھ کر، کبھی جواب میں تاخیر کرکے، کبھی کسی ضروری خط کو گما کر اور کبھی کوئی اور حکم عدولی اور غیر ذمہ داری کا ثبوت دے کر انھیں چھیڑا جاتا پھر ان

کی محبت آمیز خفگی سے لطف اندوز ہوا جاتا۔ مجھے مولوی عرفان کی قسمت پر رشک آتا ہے کیسے محبت کرنے والے بزرگ ملے تھے۔

خطوط کی اہمیت کے چند اور پہلو :۔

محمد علی کے ان خطوط کی نوعیت اور قسم کا تعین کیا جائے تو یہ نجی کے خطوط ہیں، نہ ادبی خطوط ہیں اور نہ انھیں کاروباری خطوط میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ یہ تمام خطوط سیاسی ہیں۔ اگرچہ ان میں بہت سی باتیں نجی کی بھی ہیں اور بیشتر خطوط کا ادبی پایہ بھی بہت بلند ہے۔ ان خطوط میں محمد علی کے آخری خط جنوری ۱۹۳۱ء سے قبل پندرہ بیس سال کی سیاسی تاریخ کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ ان میں نہایت قیمتی معلومات اور بلند پایہ اور نادر افکار ہیں۔ نیز ان میں حالات کا ایسا تجزیہ ہے جو صرف انہی خطوط میں ملتا ہے۔ خصوصاً غلام بھیک نیرنگ کے نام خط میں مسلم لیگ کا رویہ اور محمد علی جناح کے چودہ نکات سے مروتاً مفاہمت، غلام رسول مہر کے نام خط میں خلافت کمیٹی کی اندرونی کش مکش اور پنجاب کے بعض علما کے بارے میں محمد علی کا رویہ نیز خود مہر صاحب کے بارے میں ان کی رائے، شوکت علی کے نام خط میں ذاتی حالات کی تفصیلات اور امان اللہ خاں کی جلاوطنی کے وقت سفرِ ہند کی معلومات، محمود احمد عباسی کے نام خط میں ہمدرد کی حالت، عرفان صاحب کے نام خط میں گول میز کانفرنس میں محمد علی کے ساتھ دوسرے مسلمان ہندوستانی زعما کا رویہ، اسی طرح ایک اور خط میں نواب رامپور سے علی برادران کے روایتی تعلقات نیز دونوں بھائیوں کی سیرت پر اس سے جو روشنی پڑتی ہے وہ بایں وجہ کہ ان کی اپنی "آپ بیتی" ہے، بہت اہمیت رکھتی ہے۔

تاریخی اہمیت :۔

اب تاریخی اہمیت کے چند مباحث پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے تاکہ ان خطوط کی سیاسی اہمیت واضح ہو سکے۔

نیرنگ کے نام خط میں محمد علی لکھتے ہیں۔

"مسلم لیگ کی کونسل اور مسلمانوں کا جو اجتماع جنوری ۱۹۲۹ء گزشتہ میں یہاں (یعنی دہلی میں) ہوا تھا۔ وہ صرف اسی غرض سے تھا کہ ہندوؤں کے مقابلے میں "مسلم لیگ کے خداوند" ہماری تائید حاصل کریں اور چونکہ ہم ان کے تمام خیالات سے (جو ۱۴ نکات کی شکل میں سامنے آئے تھے) متفق نہ تھے اس لیے یہ تو نہ ہوا کہ وہ ہماری مکمل تائید حاصل کرلیں، لیکن پھر بھی ہمیں کو جھکنا پڑا اور مروت کے خیال سے ہم نے کہہ دیا کہ بہت اچھا۔ آپ اپنے مطالبات کو مسلمانوں کی طرف سے پیش کریں۔ ہم آپ کو پورا موقع دیں گے کہ آپ ہندوؤں کو ان کے پورا کرنے پر راضی کرلیں تاکہ کل کو یہ نہ ہو کہ آپ شکایت کریں کہ ہندو تو ہمارے مطالبات پورے کرنے پر راضی تھے مگر تمہاری مخالفت نے ان کو روک دیا جناح صاحب اور ان کے ساتھیوں کو پورا موقع دیا گیا ہے کہ وہ اپنے مطالبات پیش کرکے ہندو کو راضی کرلیں لیکن اس میں انھیں مطلق کامیابی نہ ہوئی۔ اور اجتماع کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اس کے بعد نہ لیگ کے سکریٹری صاحب نے، نہ صدر صاحب نے اس ریزولیوشن پر توجہ کی جسے شوکت صاحب نے لیگ میں پیش کرکے منظور کرایا تھا اور مسلمانوں کی آل پارٹیز کانفرنس آج تک نہ ہوسکی۔

عرفان صاحب کے نام خط میں گول میز کانفرنس میں آغا خاں وغیرہ کی انھیں نظر انداز کرنے کی کوشش۔ نیز ہندو اور خصوصاً مسلمان رہنماؤں کے رویے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"ہاں اتنا اور لکھ دیتا ہوں کہ نہ ہندو لیڈر قابلیت کا ثبوت دے رہے ہیں اور نہ مسلمان۔ سب سے زیادہ اہم کمیٹی وہ ہے جو ترکیبی حکومت کا ڈھانچہ تیار کررہی ہے اور اس میں اس

قدر وقت ان کی بدلیاقتی اور عدم تدبر سے ضائع ہو رہا ہے کہ خدا کی پناہ۔ مگر باوجود میرے پہلے سے کہلانے کے آغا خان، شفیع اور جناح نے میرا نام نہیں رکھا۔ حالانکہ پہلی کمیٹی میں صرف میری موجودگی جلسہ کے باعث میرا نام تھا اور اس پر آغا خاں کے ذریعے سے مجھے کہلوایا گیا کہ تمھاری صحت اس کی متحمل نہ ہو سکے گی۔"

محمد علی کی سیرت کا ایک پہلو:۔

ایک خط میں نواب رام پور سے اپنی ملاقات کے سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

"....چیف سکرٹیری صاحب نے فرمایا کہ سرکار نے آپ کو اپنے استراحت کے کمرے میں طلب فرمایا ہے۔ چنانچہ جوتا اتار کر میں ان کے ہمراہ سرکار کی خواب گاہ میں حاضر ہوا۔ حسب معمول دو تین حکام اور دو تین مصاحبین اس کمرے میں موجود تھے اور سرکار پلنگڑی پر تشریف فرما تھے۔ چونکہ مجھے پونے دو برس سے شرف باریابی حاصل نہیں ہوا تھا۔ اس لیے میں نے اپنے آباء و اجداد کے طریقے پر قدم بوسی کی اور سلام کرنے کے بعد حسب الحکم سرکار کی پلنگڑی کے پاس بیٹھ گیا۔"

"....نواب صاحب سب و شتم فرماتے رہے۔ جس کی وجہ سے میں نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ مگر اسی سلسلے میں سرکار نے فرمایا کہ تو نمک حرام ہے۔ اس پر میں نے کہا یہ درست نہیں۔ اس پر اور بگڑ کر سرکار نے فرمایا کہ تو نمک حرام اور تیرا باپ نمک حرام۔ میں نے عرض کیا جو کچھ میرے باپ نے کیا وہ ان کا فعل تھا اور اس کا عذاب و ثواب ان کی گردن پر، میں ذمہ دار نہیں۔ لیکن اپنے متعلق پھر عرض کروں گا کہ میں نے کبھی نمک حرامی نہیں کی ہے۔ اس پر سرکار اور برافروختہ ہوئے اور کہا کہ میرے سامنے جواب دیتا ہے۔ میں نے عرض کیا سرکار نے اس سے قبل بھی بہت کچھ برا

بھلا کہا۔ مگر میں نے گردن نہیں اٹھائی۔ البتہ نمک حرامی کے الزام
کا جواب دینا میرا فرض ہے۔ میں سرکار کے سامنے پھر عرض کروں گا
کہ یہ الزام بالکل غلط ہے۔ اور جس کسی نے سرکار سے یہ کہا وہ
جھوٹ بکتا ہے۔ رہا قلعہ میں مقیّد ہونا تو یہ کوئی چیز نہیں ہے۔
اگر سرکار جیل بھی بھیج دیں تو ایک مرتبہ اپنی اطاعت شعاری
ثابت کرنے کے لیے اور سرکار کا کہنا نیچے نہ ڈالنے کے خیال سے میں
خود بیڑیاں پہن کر جیل خانہ چلا جاؤں گا۔ میرے خاندان میں
جو کچھ دولت و ثروت، جو کچھ عزت ہے وہ سرکار اور سرکار کے
آبا ر و اجداد کی دی ہوئی ہے۔ اور ان کی خدمت میں حاصل
ہوئی ہے۔ اگر سرکار سب کچھ لے لیں گے تب بھی اپنی دی ہوئی
چیز لے لیں گے، ہم یہ چیز کہیں اور سے نہیں لائے تھے اور میری تو
تعلیم بھی سرکار ہی کے قرض دیے ہوئے روپیہ سے ہوئی تھی۔
اس کی بدولت جو کچھ تھوڑی بہت قابلیت یا عزت حاصل ہے،
وہ سرکار ہی کا طفیل ہے۔"

اس مجلس میں محمد علی کی سیرت کا جو پہلو سامنے آتا ہے اس کی عظمت کا صحیح اندازہ اس وقت ہوگا جب ان کی وہ تقریر بھی سامنے لائی جائے جو انھوں نے ۱۹۲۶ء کی موتمر عالم اسلامی کے اجلاس مکہ میں سلطان عبدالعزیز کی موجودگی میں کی تھی۔ جس کے بارے میں مولانا عبدالقدوس ہاشمی نے لکھا ہے کہ یہ تاریخی تقریر اس قدر مدلّل، اتنی تلخ اور اسی طرح حق گوئی کا کمال ہے کہ سارا مجمع انگشت بدنداں رہ گیا ہے۔ ہاشمی صاحب کے بقول یہ صداقت کا جلال شاہی سے ٹکراؤ تھا جس میں ان کی حق گوئی و بے باکی میں "جان کا نہیں تو اعزاز و اکرام کے ضیاع کا خطرہ تھا، ذلّت و حقارت کا خطرہ بھی موجود تھا۔ سید رئیس احمد جعفری کے گہربار قلم نے یہ تقریر بھی اپنی تصنیف میں پیش کر دی ہے۔ فرماتے ہیں کہ موتمر میں عالم اسلامی کے اکثر نمایندے شریک ہوتے تھے۔ خود سلطان ابن سعود نے موتمر کا افتتاح کیا تھا۔ اکثر نمایندے

"جلالتہ الملک" کے جلال و جبروت سے متاثر و مرعوب تھے۔ لیکن محمد علی کا "ایک حق گو" وجود ایسا تھا جو سلطان کے خدم وحشم سے، جاہ و جلال، عظمت و جبروت کسی چیز سے بھی متاثر نہیں ہوا۔ اس نے وہیں موتمر میں سلطان ابن سعود سے پورے آزادانہ لہجے میں تخاطب کیا۔ جعفری صاحب نے محمد علی کی اس تقریر کو "آوازۂ حق" لکھا ہے۔ یہ جملے اسی آوازۂ حق کی یادگار ہیں۔

"یہ ملوکیت کیسی؟ اسلام میں تو شخصیت کی بیخ کنی کی گئی ہے۔ شوریٰ اور جمہوریت کو تفوق حاصل ہے۔ تم کتاب و سنت کے تمسک کے مدعی ہو پھر یہ قیصر و کسریٰ کی پیروی کیوں؟"

محمد علی کی شخصیت اور سیرت کی یہ دو انتہائیں ہیں۔ ایک طرف وہ یوپی کے ایک انگریز پرست نواب کی بارگاہ میں داخل ہوتے ہیں تو بحکم "فاخلع نعلیک انک بالوادی المقدس طوی" اپنے جوتے چوکھٹ کے باہر اتار دیتے ہیں اور آبار و اجداد کے طریقے پر آداب و کورنش بجالاتے ہیں اور آخری سلام جو "سجدہ زمین بوس" کہلاتا ہے، کے بعد فریضۂ قدم بوسی ادا کرتے ہیں اور حسب الحکم تختِ عظمت و اجلال کے پاس حضور کے قدموں میں فرش پر ڈھیر ہو جاتے ہیں اور سلطان عبدالعزیز ابن سعود سے اسلامی جمہوریت اور شورائیت کا مطالبہ کرنے والے، کتاب و سنت کے دعویٔ تمسک پر طنز کرنے والے اور "آوازۂ حق" بلند کرنے والے، سلطنت انگلشیہ کے فرزند دل پذیر کے سامنے سر جھکا کر اس کا "سب وشتم" سنتے ہیں، گالیاں کھاتے ہیں۔ نمک حرامی کے طعنے سہتے ہیں اور مزاج یار کے خلاف سر تسلیم کو جنبش نہ دینے کے عہد سے سرمو انحراف کرنے کا کبھی دل میں خیال نہیں لاتے۔ اور غلام رسول مہر کو نغمۂ سرمدی "ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ واللہ واسع علیم" سنانے والی زبان کو خداوند ارض رام پور کی ثنا اور اس کی قدرت و کبریائی کی توصیف میں نغمہ ریز پاتے ہیں "خداوندا! میرے خاندان میں، جو کچھ دولت و ثروت و جاہ و عزت ہے، وہ تیری ہی دی ہوئی ہے۔ تیری ہی خدمت گذاری اور خوشنودی نے ہمیں تیری ان عنایات کا مستحق بنایا ہے۔ پس اگر یہ سب کچھ تو مجھ سے چھین لے گا تو اپنی ہی

دی ہوئی چیز لے گا جو تیری شان سے بعید ہے۔ ہم یہ چیزیں کہیں اور سے نہیں لائے تھے۔ اور یہ میری تعلیم تیرے ہی خزانے کی تو رہین منت ہے اور یہ قابلیت اور عزت جو مجھے حاصل ہے۔ خداوندا! وہ تیرے ہی طفیل اور تیرے ہی کرم کا صدقہ ہے۔" اللھم مالک الملک توتی الملک من تشار وتنزع الملک ممن تشار وتعزمن تشار وتذل من تشار بیدک الخیر انک علیٰ کل شی قدیر"

اگر محمد علی کا یہ خط ہمیں دستیاب نہ ہوتا تو ہم ان کی شخصیت کے اس پہلو کا مطالعہ کرنے سے محروم رہتے۔ اس خط سے ان کی اس خوبی کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان تہذیبی و مجلسی روایات کے بڑی سختی سے پابند تھے جو مسلمان امراء و ملوک کے درباروں میں تاریخ اسلام میں عہد ملوکیت کے آغاز ہی سے نظر آنے لگی تھیں۔ اور جہاں تک مسئلہ حجاز میں مکہ مکرمہ کی اولین موتمر عالم اسلامی کے موقع پر محمد علی کے رویے اور ان کی بے باکانہ تنقید کا تعلق ہے تو مولانا مہر صاحب کے نام خط کے شروع میں وقت کے ان حالات کی طرف اشارہ موجود ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ محض ایک کانفرنس تھی اور اس میں ہر ملک اور ہر جماعت کے نمایندوں نے نہایت آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ خیالات کی صحت یا عدم صحت کی بحث نہیں۔ اگر سلطان عبدالعزیز کا کوئی دربار ہوتا اور وہاں کے آداب و رسوم شاہانہ ہوتے، اور محمد علی کو باریاب ہونے کا شرف حاصل ہوتا تو کیا ان کی روایت پرستی اس بناپر آداب و کورنش بجالانے سے انکار کر دیتی کہ اس کا بوریۂ سلطانی انگریز کے فرزند دل پذیر اور حضور نواب صاحب رامپور کے تخت اجلال کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا؟ کم از کم مجھے اس بارے میں محمد علی کے بارے میں کوئی بدگمانی نہیں۔

محمد علی کا کمال تدبّر:-

محمد علی کے خطوط سے ان کے فکر و تدبر کے بھی نہایت عمدہ ثبوت ملتے ہیں۔ اس میں اہمیت ان کے فکر کی بھی ہے اور انداز فکر کی بھی۔ گرد و پیش کے حالات اور مسائل سے متاثر ہوکر یا مسائل کے تمام پہلوؤں پر نظر حاوی نہ ہونے

کی وجہ سے انسان کے فکر کو کبھی ٹھوکر بھی لگ جاتی ہے اور وہ فیصلے کے غلط مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ لیکن اندازِ فکر کی صحت اور سلامتی انسان کی ہمیشہ صحیح فیصلے تک رہنمائی کرتی ہے۔ حالات کے غلط تجزیے کی عادت اور غیر صحت مند اندازِ فکر انسان کو ہمیشہ گمراہ کرتا ہے۔ ایسے شخص کا درست موقف بھی محض ایک اتفاق اور حادثہ ہوتا ہے۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ فکر سے اندازِ فکر کی اہمیت زیادہ ہے۔ نیرنگ کے نام خط میں محمد علی نے بعض مسائل کا تجزیہ کیا ہے اس سے ان کے صحت مند اندازِ فکر کا پتا چلتا ہے۔ اگر مسلمان چاہتے تو اس اندازِ فکر کو اپنا کر بعد کے حالات کو خراب ہونے سے بچایا جا سکتا تھا۔ اس سلسلے میں نیرنگ کے نام خط میں یہ سطریں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔

"آپ کو یاد ہو گا کہ آپ ہی نے مجھے یہ راستہ بھوالی میں بتایا تھا اور فرمایا تھا کہ" لڑائی ہندو مسلمان کی نہیں بلکہ مالویت اور گاندھیت کی ہے۔ میں گاندھیت کا ساتھ دے کر ہندوستان اور اسلام کی خدمت کرنا چاہتا ہوں"۔ ایک مسلمان کے لیے محض مالویت کی مخالفت کرنا اس کو ہنود میں تقویت پہنچانا ہے اور اس میں نہ اسلام کی بہتری ہے نہ ہندوستان کی اور نہ خود ہندوؤں کی۔ ممکن ہے آپ کا خیال ہو کہ مہاتما گاندھی سے خود بہت سی غلطیاں ہوئی ہیں۔ ایک حد تک میں اس خیال کی تائید کر سکتا ہوں۔ لیکن گاندھی انسان ہیں، فرشتہ نہیں، نہ خدا ہیں۔ ان پر ہنود کا اور بالخصوص ہنودِ پنجاب کا ایک عرصے سے نرغہ رہا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے خود آپ سے سالِ گزشتہ میں مسلمانوں کی BRIEF مانگی تھی۔ مگر جس جس سے اس چیز کے لیے کہا گیا اس نے سوائے ہندو اخباروں کے پلندوں کے جو میرے سر پر کھینچ مارے گئے، مجھے مشکل ہی سے کوئی چیز بھیجی جس کو میں پڑھ کر مہاتما جی کے سامنے مسلمانوں کا کیس پیش کر سکتا یا جس کو مہاتما جی کو دے سکتا۔ ہم میں جوش

زیادہ ہے مگر کام کرنے کا طریقہ نہیں جانتے'' نہ پتہ مارنا ہم کو آتا ہے۔ بہرحال جو کچھ بھی مہاتما جی نے مسلمانوں کے کیس کے متعلق سنا ہے وہ زیادہ تر مجھی سے یا میری ہی معرفت سنا ہے۔ اگر مسلمانوں کی بے صبری، اشتعال پذیری، اور پھر صحیح طریقہ کار سے ناواقفیت کے باعث مہاتما گاندھی کے دل پر جو ہندو ہیں اور ہندو رسم ورواج اور طریق بود و ماند کا پیدائش سے لے کر اس وقت تک بہت کچھ اثر پڑا ہے، اثر ہوا اور انہوں نے مسلمانوں کے متعلق ایک حد تک غلط فیصلہ کیا تو زیادہ تعجب کی بات نہیں۔ ان کے خیالات کی اصلاح کرنا اب بھی ہمارا فرض ہے لیکن اس کے لیے وہ سوقیانہ طریقہ ہرگز مفید نہیں ہو سکتا جس کو مولانا ظفر الملت والدین ظفر علی خاں صاحب نے اختیار کیا ہے۔ بھائی نیرنگ صاحب افسوس ہے کہ مسلمان پھر اسی طریقے پر چلنے لگے ہیں جو ابتدائً انھوں نے اختیار کیا تھا۔''

محمد علی کا حسنِ استدلال :۔

ادب، فلسفہ، تصوّف اور اسی قسم کے کئی ایسے موضوعات ہیں جس میں بے دلیل و نظیر بھی بات کرنے کی بڑی گنجائش ہے۔ مصنّف اور متکلم اپنے خیالات، تاثرات، احساسات، تصورات پیش کر سکتا ہے لیکن جس طرح تاریخ نویسی میں واقعات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اسی طرح سیاسی مسائل و مباحث میں کوئی بات دلیل کے بغیر ناقابل قبول ہوتی ہے۔ محمد علی کے خطوط میں یہ خوبی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ یہ خوبی اگرچہ ان کے سیاسی مباحث کے تمام خطوط میں پائی جاتی ہے لیکن سر جیمس مسٹن اور سر ریجنرے میکڈانلڈ کے نام خطوط میں تو ان کے استدلال کی خوبی اور نظائر کے بیان کا کمال تحسین و توصیف سے ماورا نظر آتا ہے۔ ساتھ ہی ان کے خطوط میں خصوصاً مذکورۃ الصدر

ہر دو اشخاص کے نام خطوط ہیں" بحث کے اطراف و جوانب کی جامعیت" حد کمال کو پہنچی ہوئی نظر آتی ہے۔ محمد علی کے مباحث میں قوت استدلال اور اطراف و جوانب کی جامعیت کی خوبی کا خیال میرے ذہن میں مولانا عبدالماجد دریابادی کے ایک مضمون کے بعض جملوں سے پیدا ہوا۔

حفظِ مراتب:۔

محمد علی نے اپنے ہر مکتوب میں اپنے مخاطب کے مقام اور مرتبے کا لحاظ رکھتے ہوئے زبان و بیان اور اسلوب اختیار کیا ہے۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی ایک عالم دین تھے ان کے نام خطوط میں القاب و آداب اور زبان و بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک عالم دین اور مقتدر مذہبی شخصیت اور دینی پیشوا سے تخاطب تھے۔ نواب وقار الملک ایک قابل احترام تہذیبی شخصیت تھے۔ ان کے نام خط میں ان کی حیثیت کا لحاظ و احترام موجود ہے۔ مہاراجہ محمود آباد نواب جاورہ کی شخصیات کی دنیاوی عزت و وجاہت رکھتی تھیں اس کے ان کے نام خطوط میں روایتی انداز موجود ہے۔ جیمس مسٹن اور ریمزے میکڈانلڈ انگریز حکمراں تھے ان کے نام آغاز و اختتام سرکاری یا دفتری خطوط نگاری کے دستور کے مطابق ہے۔ لیکن ان تمام لوگوں کے نام خطوط کے مضمون میں کوئی بڑا اور بنیادی فرق نظر نہیں آیا۔ یعنی مخاطب کرنے کے بعد محمد علی نے ہر کسی کے نام اپنے خط میں اپنی بات پوری وضاحت اور دلائل کے ساتھ صاف صاف بیان کر دی ہے۔ انھوں نے اپنی بات اور اپنی منشا بیان کرنے میں کسی ادنا تکلف سے کام نہیں لیا، ان کا قلم کہیں کسی مقام پر بھی مکتوب الیہ کی دنیاوی وجاہت یا بلند منصب سے متاثر نظر نہیں آتا۔ چونکہ ان تمام حضرات سے تعلقات کی نوعیت بھی مختلف تھی، ذوق و مشاغل کے دائرے الگ الگ تھے جو خطوط لکھے گئے وہ کسی خاص مقصد سے لکھے گئے۔ اس لیے تمام خطوط پیش نظر مقصد اور مطلوب مبحث کے دائرے تک محدود ہیں۔ اس بیان سے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے خطوط کو مستثنیٰ کر دینا چاہیے اس لیے کہ ان سے تعلقات

مختلف حیثیوں سے تھے اور نہ صرف ان سے بلکہ ان کے گرد و پیش کی متعدد شخصیات سے بھی محمد علی کے روابط تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نام خطوط کے مضامین و مباحث کا دائرہ حکام و نوابین کے خطوط سے زیادہ وسیع ہے۔

مظلومیت کا افسانہ :۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی نے ان کے خطوط کے بارے میں لکھا ہے کہ ابتدا کے خطوط کیسی زندہ دلی و شگفتگی کے مرقع ہیں اور آخری خطوط کیسی اداسی اور مظلومیت کے خاکے۔ جلے ہوئے دل سے اگر کچھ کلمات بعض معاصرین کے باب میں تند و تلخ و ناملائم نکل گئے ہوں تو شاید وہ زیادہ قابل ملامت نہ ہوں۔ لایحب اللہ الجہر بالسوء من القول الا من ظلم۔" الا من ظلم" کا استثنا آخر اللہ ہی کا تو فرمان ہے۔ اس پر بھی جن صاحبوں کا دل دکھے ان سے دست بستہ معافی کا خواست گار ہوں"۔ جہاں تک بعض معاصرین کے بارے میں تند و تلخ اور ناملائم کلمات کا تعلق ہے تو اب نہ محمد علی ہیں نہ ان کے معاصر۔ وہ سب اللہ کے حضور ہیں۔ وہ اپنے اخلاص و عمل اور اپنی مظلومیت کے اجر کے سزاوار ہوں گے اور جہاں تک کسی کلمے یا فعل کے قابل ملامت ہونے کا تعلق ہے۔ اگر ایک ناپسندیدہ بات وقوع میں آئی ہے تو یہ کیوں کر ممکن ہے کہ وہ قابل مذمت نہ ہو لیکن محمد علی کا معاملہ تو ایک بیمار اور معذور شخص کا ہے۔ قاضی عبدالغفار جو ہمدرد میں اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے اور انھیں محمد علی کا قرب اور صحبت حاصل تھی، لکھتے ہیں عتاب اور غصہ آخر میں اعصابی امراض کی وجہ سے بہت زیادہ ہو گیا تھا"۔ بیمار و معذور تو یوں بھی قابل عفو و درگزر ہوتا ہے۔ لیکن اب یہ بات قطعاً غیر متعلق ہے۔ ۱۹۴۴ء میں جب مولانا عبدالماجد دریا بادی نے خطوط محمد علی یا جوہر نامہ مرتب کیا تھا، ان کے کئی متعلق معاصر زندہ تھے۔ اب تو سب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ البتہ ان کے افسانۂ مظلومیت کی صدائے بازگشت آج بھی ہندوستان اور پاکستان کی ادبی دنیا میں سنائی دیتی ہے۔ گو مولانا عبدالماجد

دریابادی کا خیال ہے کہ محمد علی کا سب وشتم ان کی زیادتی نہیں بلکہ ان کی مظلومیت کی چیخ اور معاصرین کی جانب سے ان پر ستم ناروا کے خلاف ان کا ردِ فعل ہے ۔ لیکن دریابادی مرحوم نے یہ نہیں بتایا کہ مفتی کفایت اللہ احمد سعید، عبدالقادر قصوری اور غزنوی خاندان کے اکابر نے ان پر کون سا ظلم روا رکھا تھا ؟ اور علمائے اہلِ حدیث کا وہ کون سا غیر معقول رویہ تھا جس پر کمینہ پن اور پا جیانہ حرکت کا اطلاق کیا گیا تھا اور جس کی بنا پر انھیں اخوان الشیاطین کے خطاب سے نوازا گیا تھا ۔ ظفر علی خاں، خواجہ حسن نظامی، محمد علی جناح، اقبال، سرشفیع، مہر و سالک وغیرہ کے معاملے میں تو یقین کیا جاسکتا ہے کہ ان سے اینٹ اور پتھر کا تبادلہ اور مقابلہ تھا اور اس مقابلے میں ممکن ہے زیادتی محمد علی کے ساتھ ہوئی ہو ۔ حالانکہ اس معاملے پر بھی ہمیں اس طرح نظر نہیں ڈالنی چاہیے بلکہ بطور اصول وہ حدیث سامنے رکھنی چاہیے کہ قاتل و مقتول دونوں جہنمی ہو سکتے ہیں ۔ اگر مقتول کا مقصد محض اپنا دفاع نہ ہو بلکہ نیت اس کی بھی اپنے مخالف و مقابل کو قتل کرنا ہو پھر ان میں کسی کا مقتول بن جانا اور کسی کا قاتل کہلانا محض بخت و اتفاق تھا ۔ اس لیے جب تک یہ بات ثابت نہ ہو کہ ظالم اقبال، جناح اور شفیع تھے اور ظلم صرف ظفر علی، نظامی اور مہر و سالک کی طرف سے ہوا تھا اور محمد علی نے تو صرف اپنا بچاؤ اور الزامات کی صفائی کا فرض انجام دیا تھا ۔ نیز یہ کہ ان کی زبان سے اپنے دفاع و صفائی کے سوا کوئی نا ملائم جملہ نہیں نکلا تھا ۔ انھیں مظلوم کیوں کر تسلیم کیا جاسکتا ہے ۔ لیکن نا ملائم کلمات تو ان کے خطوط میں موجود ہیں اور مولانا عبدالماجد دریابادی کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ "مزاج کے تیز تھے . . . . . اشتعال بہت جلد قبول کرلیتے تھے ۔ خصوصاً آخر کے چند سالوں میں کثرت آلام و امراض اور ہجوم افکار کے باعث اور بات بات میں غصہ میں آجاتے ۔ زبان پر قابو باقی نہ رہا تھا ۔ جوش میں خدا معلوم کیا کیا زبان پر آجاتا" نیز وہ لکھتے ہیں کہ "شدید جسمانی آزار، شدید ذاتی صدمات، شدید ہجوم اعدا میں مبتلا ہو کر اگر زبان میں حدت اور مزاج میں غلظت آگئی

ہے تو یہ عین فطرت بشری ہے"۔ اگر یہ بات ہے تو محمد علی معذور تھے لیکن محمد علی خود اسے "موسوی غیظ و غضب" کا نام دیتے ہیں۔ اور توقع رکھتے ہیں کہ ہم ان کے "غیظ و غضب" کے حق ہونے پر ایمان لے آئیں۔ اس لیے قرآن پاک کی آیت پیش کرنے اور "الامن ظلم" کے استثنا کا سوال تو از خود خارج از بحث ہو گیا۔ بہر حال یہ ایک الگ بحث ہے کہ ان کا غیظ و غضب خدا کا ناپسندیدہ غیظ و غضب تھا۔ یا موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سچا لائحہ عمل تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ محمد علی نے خود اپنے لیے غضب ناک، سخت گیر، سخت دل، سخت زبان کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اگر سیرت موسوی پر بھی ان الفاظ کا اطلاق ہو سکتا ہے تو کل نفس سیرت کی حد تک نہ سہی کم از کم الفاظ کی حد تک تو محمد علی بھی حامل سیرت موسوی ثابت ہو جائیں گے۔

لیکن محمد علی کی مظلومیت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک حقیقت ہے اور اسے تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں۔ البتہ ان کی مظلومیت کا تعلق واقعات سے نہیں احساسات سے ہے۔ واقعات کی دنیا میں تو انھوں نے اپنے ہر مخالف کی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا ہے اور اگر ان پر کسی تقریر و تحریر میں تنقید کی گئی تو انھوں نے بھی اپنے مخالفین کی رو رعایت نہیں کی البتہ ان کے احساس مظلومیت کا نہ اس وقت کوئی علاج تھا نہ آج اس کا کوئی جواب ہے۔ وہ پنجاب کے اہل حدیث کو اپنا ذاتی مخالف سمجھتے تھے۔ مولانا مہر کو انھوں نے حاسدوں کی فہرست میں رکھا تھا۔ ۱۹۲۷ء میں پنجاب کونسل کے اجلاس شملہ میں علامہ اقبال کی ایک تجویز پر نہیں نہیں کا ہنگامہ برپا ہوا۔ اور انھوں نے ان ممبران کے رویے پر جھوٹی قوم پروری کا جملہ کسا تو محمد علی نے اسے اپنے اوپر پھبتی سمجھا۔ مسئلہ خلافت کے بارے میں مولانا آزاد کے مشہور سلسلہ مضمون کا تعلق محمد علی کی ذات اور ان کے افکار کی تردید سے دور دور کا بھی تھا۔ پورے مضمون میں محمد علی کا نام بھی نہ آیا تھا۔ لیکن پنڈت جواہر لال نہرو کے نام خط سے ان کے اس احساس کا پتا چلتا ہے کہ یہ سلسلہ مضمون انہی کی مخالفت میں لکھا گیا۔ یہ احساس ان کا

نہ اس وقت مٹایا جاسکتا تھا نہ آج ان حضرات میں سے کسی کے معتقد کے لیے ان کے احساس مظلومیت کا جواب دینا ممکن ہے، نہ اس سعی کا کچھ حاصل۔

انتہا پسندی :-

اگر ان کے دشمن تھے تو یہ دشمن انھوں نے خود بنائے تھے اور اگر ان کے مخالفین تھے تو یہ ان کے اپنے انتہا پسندانہ رویے نے پیدا کیے تھے۔ وہ پھبتی کسنے میں، نام دھرنے میں، چھینٹے اڑانے میں ماہر تھے لیکن خود مخالفت ادنا سی برداشت نہ کرسکتے تھے۔ عفو و درگذر کے الفاظ ان کی لغت میں نہ تھے۔ اپنے سوا انھوں نے کسی کو کسی معاملے میں نہ مخلص سمجھا نہ صائب الرائے گردانا۔ زود رنج وہ پہلے ہی تھے۔ ان کی تنگ مزاجی فطری تھی۔ تحمل کی کمی ان میں شروع سے تھی۔ حالات سے جلد متاثر ہوجانا ان کی فطرت تھا۔ انتہا پسندی ان کے مزاج میں شامل تھی۔ مزاج و طبیعت میں اعتدال ان کی زندگی کے کسی دور میں نہ تھا یا کم از کم پیش نظر خطوط سے ان کی اس خوبی کا پتا نہیں چلتا جذبات پر انھیں قابو نہ تھا۔ ان کی زبان اور ان کا قلم ان کے اپنے قبضے میں نہ تھے۔ اور جوں جوں عمر بڑھتی گئی۔ عوارض لاحق ہوتے گئے۔ اور اعصابی امراض کی وجہ سے ان کے غصے میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔

اس مزاج و طبیعت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے مخلصین ان سے ڈرنے لگے، ان کے نیاز مندان سے دور بھاگنے لگے۔ بلاشبہ مخلصین و محبین کے لیے اخلاص و محبت سے ان کا دل کبھی خالی نہیں رہا۔ لیکن زندگی میں نباہ کے لیے صرف اخلاص و محبت ہی کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ برتاؤ میں توازن، عمل میں اعتدال، زندگی میں میانہ روی، طبیعت میں نرمی، رفق اور عفو و درگذر کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن یہ کمی ان کی تحریروں میں، ان کی تقریروں میں اور اس سے کہیں زیادہ ان کے خطوط میں موجود ہے۔ اور ان کی زندگی کی یہ خامی ان کے خطوط کی خوبی بن گئی ہے۔ یعنی ان کے خطوط، ان کے جذبات، احساسات، ان کی زندگی کے انقلابات اور ان کی طبیعت اور مزاج کے مد و جزر کا آئینہ ہیں۔ مولانا

عبدالماجد دریابادی نے ان کے خطوط کی اس خوبی پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے۔

"خطوط محمد علی کی روح کے ترجمان تو سب کے سب ہیں۔ محمد علی کی خطوط نویسی کا طریقہ بھی یہی تھا۔ وہ خط زیادہ نہیں کم لکھتے۔ زیادہ لکھنے کی انھیں فرصت ہی کب ملتی؛ لیکن جب بھی لکھتے تو دل کھول کر رکھ دیتے دل کو بند رکھنا، زبان کو روک رکھنے کی طرح وہ جانتے ہی نہ تھے۔"

مولانا عبدالماجد دریابادی نے یہ بات اپنے نام محمد علی کے خطوط کے بارے میں کہی تھی لیکن یہی بات ٹھیک ان کے تمام خطوط کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ ان کے خطوط کی اس خوبی کا ذکر پروفیسر محمد سرور جامعی نے بھی کیا ہے "خطوط محمد علی" کے دیباچے میں لکھتے ہیں "یہ خطوط صحیح معنوں میں ان کی زندگی کے آئینہ دار ہیں .... مرحوم نے ان خطوط میں اپنے دل کے تاثرات بلا کم و کاست بیان فرمائے ہیں۔"

محمد علی کی چند کمزوریاں :-

محمد علی کے خطوط ان کے جوش و جذبات سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان میں مخلصانہ تمنائیں اور سچی آرزوئیں ہیں اور ان سے ان کی ذہانت کا کامل اظہار ہوتا ہے۔ نامناسب نہ ہوگا کہ عملی زندگی میں سے مجرّد جوش، اور مطلق ذہانت کی اہمیت اور محمد علی کی زندگی میں ان کی کارفرمائی پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔

جوش و جذبات :-

جوش و جذبات انسانی زندگی میں بڑی قیمت رکھتے ہیں، اسی سے زندگی کا اظہار ہوتا ہے۔ زندگی جوش و جذبات ہی سے عبارت ہے۔ افراد کے جوش و جذبات سے قوم کی زندگی میں حرارت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن سیاست اور

ملک و قوم کے فیصلوں میں یہ متاع بے بہا خزف ریزوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ جوش کی ضرورت جسم و جان کو سرگرم رکھنے کے لیے ہوتی ہے نہ کہ فیصلوں تک پہنچنے کے لیے تدبیر و سیاست کے میدان جوش و جذبات سے فتح نہیں کیے جاسکتے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر میدان میں کامیابی محمد علی کے قدم چومتی لیکن تاریخ کا فیصلہ اس کے خلاف ہوا۔ جوش و جذبات بڑی قیمتی شے ہیں۔ لیکن تفکر و تدبّر، غور و فکر اور تحمل و بردباری کی اہمیت زندگی میں جوش و جذبات سے زیادہ ہے۔ محمد علی جناح مرحوم کے سامنے بنگال کے ایک مشہور رہنما آئے اور مسلمانوں کی حالت زار بیان کرتے ہوئے ان پر رقت طاری ہوگئی۔ تمام حاضرین ان سے متاثر ہوئے لیکن جناح صاحب قومی رہنمائی میں ان پر اعتماد کرنے کے لیے راضی نہ ہوئے۔ ان کے نزدیک طبیعت کی اس افتاد سے اچھے نتائج حاصل نہیں کیے جاسکتے۔ محمد علی کی جذباتیت نے صرف انھیں کو نقصان نہیں پہنچایا، بلکہ اس سے ملک کی سیاسی زندگی پر بھی ناخوشگوار اثر پڑا ہے۔ سیاست میں ان کی جذباتیت سے ایک غیر صحت مند روایت پڑی اور ایک غیر مفید رجحان پیدا ہوا۔ اس دنیا میں کیا ایسا سپہ سالار ہوش مند کہلا سکتا ہے جو فوج جمع کرنے اور سامان حرب و ضرب کی فراہمی سے پہلے جنگ چھیڑ دے۔ محمد علی اگرچہ پٹھان نہ تھے لیکن انھوں نے جنگ شروع کرنے سے پہلے اپنے سپاہیوں کے اسلحہ اور ان کی تعداد کا کبھی جائزہ نہیں لیا۔ کوئی اپنے جاں نثاروں کا ایک مضبوط حلقہ پیدا کرلینے سے پہلے اپنے دشمن کو نہیں للکارتا۔ لیکن محمد علی نے اپنے ممدوحوں اور نیاز مندوں کو للکار کر اپنے مخالفین کو ہوشیار کیا۔ محمد علی کے خطوط سے ان کی اس عادت کی متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

رومان پسندی :-

مخلصانہ تمنائیں اور سچی آرزوئیں بھی بڑی اچھی چیز ہیں۔ لیکن قوم کی رہنمائی میں وقت کے مصالح اور گرد و پیش کے تقاضوں کو کیوں کر نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کے مطابق ایک فرد بھی اپنی زندگی

نہیں گزار سکتا۔ ایک رہنما کی بے تابیوں کا ساتھ پوری قوم کیوں کر دے سکتی ہے۔ قوم کی رہنمائی کے لیے سچی آرزوؤں اور تمناؤں کے ساتھ قوم کے حالات ان کی قوت عمل، صلاحیت کار اور صبر و برداشت کی خوبیوں کا اندازہ لگانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ سیاسی رہنما کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ آرزوؤں اور تمناؤں کے نشاط باغ سے نکل کر عمل کے خارزار میں آئے اور قوم کو لے کر آگے بڑھے۔ محمد علی کا مزاج شاعرانہ تھا اور ان کی سیاست کا آغاز بھی رومان پسند دور میں ہوا تھا لیکن جنگ عظیم میں اتحادیوں کی فتح، جرمنی کی شکست ترکی کے انقلاب، نام نہاد خلافت کی بجائے جمہوری حکومت کے قیام، حجاز سے شریف حسین کے تبضہ و تسلط کے اعتزال اور ایک نئی دنیا کے وجود میں آنے کے باوجود وہ قدیم دور کے انسان تھے اور اسی دور کے شب و روز میں سانس لے رہے تھے اور دماغ کے عیش کو عملی زندگی کا سہارا بنانے کی سعی موہوم میں مبتلا تھے

ذہانت محض:۔

محمد علی نہایت ذہین تھے اور ان کے فکر کا پیمانہ بہت بلند تھا لیکن ان کے پاس کوئی جماعت نہ تھی۔ پہلی جماعت کے لوگ ان سے اور وہ ان لوگوں سے خوش نہ تھے، دوسری جماعت کے لوگوں کو نہ انھوں نے اعتماد میں لیا نہ ان لوگوں نے محمد علی پر اعتماد کیا۔ خود محمد علی کا بیان ہے کہ وہ لوگ ان سے فیصلے سے پہلے مشورہ نہیں لیتے فیصلے کے بعد ان کا تعاون حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ایک تیسری جماعت بھی تھی وہ اس کے روح رواں تھے۔ لیکن اس جماعت کے لوگ بھی ان کے ساتھ نہ تھے۔ ان میں کوئی "قصوری" تھا یا نہیں لیکن محمد علی نے انھیں قصوری بنا کے چھوڑا۔ پنجابی ٹولی کوئی واقعی تھی ؟ معلوم نہیں۔ لیکن ہوا یہ کہ دیوانے سے کہا آگ نہ لگانا۔ اس نے کہا اچھا کیا مجھے یاد دلا دیا" کے مصداق محمد علی کے رویے نے یہ احساس دلایا، اور زمیندار نے اپنے عمل سے دیوانگی کی اس سنت کو تازہ کر دیا۔ دو جماعتیں اور ہیں اور ان کا صاف صاف نام لیجیے خدام الکعبہ اور خدام الحرمین۔ دونوں جماعتیں

ان کے ممدوحین کے زیر صدارت اور ان کے معتقدین پر مشتمل تھیں۔ اور دونوں میں اعلا اور ادنا عہدوں سے لے کر معمولی ارکان تک ان کے معتقدوں اور نیازمندوں کی اکثریت تھی۔ لیکن وہ ان حلقوں اور ان کے وسائل سے بھی کام نہ لے سکے۔ آخر اس میں قصور کس کا تھا؟ محمد علی اپنی تمام تر ذہانت کے باوجود ناکام کیوں رہے۔ کیا اس کی وجہ ان خصائص سے محرومی تھی جن کا ذکر اوپر کیا گیا۔

اجتماعی زندگی کے مراحل محض ذہانت و فطانت کے بل بوتے پر تنہا طے نہیں کیے جا سکتے۔ اس حقیقت کو ان کے ہم نام بزرگ نے خوب سمجھا تھا وہ اپنی جیب کے سارے سکّوں کو پرکھ چکے تھے۔ انھوں نے جانچ لیا تھا کہ زیادہ سکے کھوٹے ہیں لیکن وہ جانتے تھے کہ بساطِ سیاست پر جیب کے وزن کی بھی اہمیت ہے۔ انھوں نے ان کھوٹے سکّوں سے اپنی جیب کو خالی نہیں کر لیا۔ رزم بازارِ سیاست میں خاصیت کی نہیں تعداد کی اور کیفیت ہی کی نہیں کمیّت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ انھوں نے ان کھوٹے سکّوں کو بھی چلا لیا اور ان سے ایک سلطنت کے وجود کی متاع بے بہا حاصل کر لی۔
محمد علی نے کھرے سکّوں سے بھی اپنی جیب کو خالی کر لیا۔ اپنے جاں نثاروں، مخلصوں اور اپنے دست و بازو کو اپنے جسم سے جدا کر دیا اور جو صرف کسی بات میں ان سے اختلاف رکھتے تھے انھیں مبارزت طلبی اور اظہار دشمنی پر مستعد کر دیا۔ جو ان کے پاس تھے وہ دور ہو گئے اور جو دور تھے وہ اور دور ہو گئے اور انھوں نے پاس آنے کی جرأت نہیں کی۔ احباب و مخلصین کا نیا حلقہ پیدا نہیں ہوا تھا کہ پرانا حلقہ توڑ دیا۔ اس طرح کاروبارِ محبت میں بھی ہمدرد کا مریڈ کی تجارت کی طرح ہمیشہ وہ نقصان ہی اٹھاتے رہے، منافع کبھی نہیں ہوا۔

محمد علی کی شخصیت کی ان کمزوریوں کا پورا پورا اظہار خطوط میں ہوتا ہے۔ اور اس طرح نہ صرف تاریخ و سیاست کے مطالعے میں ان خطوط کی اہمیت ہے بلکہ محمد علی کی شخصیت کا مطالعہ بھی ان کے خطوط کو دیکھے بغیر نامکمل رہے گا محمد علی کے مضامین و تقاریر میں ان کے افکار کا اظہار ہوتا ہے لیکن ان کے

حقیقی خیالات کے ساتھ ان کی شخصیت کے بہترین محاسن اور ان کے مزاج و طبیعت کی کمزوریوں کا کامل اظہار ان کے خطوط میں ہوا ہے۔ اس لیے ان کے خطوط کی اہمیت نہ صرف ادبی نقطۂ نظر سے بلکہ تاریخی، سیاسی، فکری اور معلوماتی لحاظ سے بھی ان کی دوسری تحریروں اور تقریروں سے بہت زیادہ ہے

محمد علی کی بنیادی حیثیت :-

حق و صداقت کے لیے معیار اور کسوٹی نہ تو محمد علی کے محض جوش و جذبہ اور اظہار و بیان کو بنایا جاسکتا ہے اور نہ کسی اور کے۔ اور اگر یہی معیار ہو تو محمد علی صحیح اور ساری دنیا غلط۔ ان کے عزیزوں، استادوں اور مرشدوں مخلصوں اور نیازمندوں، معاصروں میں کوئی بھی حق پر نہ تھا۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ سچائی خواہ تاریخی ہو خواہ سیاسی ہو۔ کسی ایک ہی جماعت میں اور صداقت مذہبی کو بھی آج کے دور میں، کسی ایک ہی مسلمان میں یا کسی ایک ہی دینی مکتبۂ فکر میں محدود نہ سمجھ لینا چاہیے۔ کیا محمد علی کی عقیدت اور محبت میں ہم آنکھیں بند کرکے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ اقبال اپنے عمل سے، ابوالکلام اپنے فکر سے اور جناح اپنے افکار و حیات دونوں سے مسلمان نہ تھے۔ یا ملک کی آزادی اور اسلام کے باب میں وہ مخلص نہ تھے۔ ظفر علی خاں اور خواجہ حسن نظامی غلط کار تھے۔ عبدالقادر "قصوری" تھے۔ علمائے اہل حدیث متعصب پنجابیوں کی ایک ٹولی تھی، بریلوی، بدایونی، فرنگی محلی چھوٹی چھوٹی تنگ نظر اور حالات حاضرہ سے بے خبر جماعتیں تھیں اور دیوبندی ایک محدود الفکر اور متقشف جماعت کا نام تھا؟

لیکن سوچنا چاہیے کہ یہ مخالفت کس شخصیت نے کی تھی۔ محمد علی کی ذات میں کئی شخصیتیں جمع ہوگئی ہیں۔ وہ ایک مدبّر تھے جنھیں کسی حال میں سررشتۂ فکر و تدبر ہاتھ سے نہیں چھوڑنا تھا، وہ ایک سیاسی رہنما تھے جنھیں ملک کی رہنمائی میں کسی لمحے بھی مصالح وقت اور گرد و پیش کے حالات کو نظر انداز نہیں کرنا تھا وہ مصلح تھے اور بہترین نتائج کی توقع سے انھیں نہ کبھی مایوس ہونا چاہیے تھا

اور نہ کبھی دست بردار۔ اگر ان میں سے کسی حیثیت سے محمد علی کو ان اکابر کے سامنے ان کے مخالف کی حیثیت میں لا کھڑا کیا جائے تو یہ محمد علی کے ساتھ بھی زیادتی ہوگی اور دوسروں کے ساتھ بھی۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ انھوں نے مدبّر کی حیثیت سے یا مصلح کی حیثیت سے ہرگز قلم نہیں اٹھایا۔ ہاں! محمد علی ایک صحافی بھی تھے۔ جنھیں ہر صبح نئے حالات میں ایک رد عمل کی طرف ہدایت کرنی تھی۔ ہر مسئلے پر دو ٹوک رائے دینی تھی اور یمین و یسار کے تذبذب میں قوم کو مبتلا نہیں چھوڑنا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ان کی ان تمام حیثیتوں میں بنیادی حیثیت بھی یہی تھی۔ اور اگر کسی شخص یا کسی جماعت کے بارے میں ان کی رائے بدلتی رہی ہے تو اسے ان کی صحافیانہ مجبوری سمجھنا چاہیے۔ ہمدرد اور کامریڈ آزاد صحیفے تھے اس لیے کسی خاص جماعت یا مکتبۂ فکر کی ترجمانی اور اس کے عقائد کے مطابق بنائی ہوئی پالیسی کی لکیر کے فقیر بنے رہنے کی توقع محمد علی سے نہیں کرنی چاہیے۔ انھوں نے اگر کسی کے خلاف قلم اٹھایا تو وہ صرف انہی گرد و پیش میں ان کی وقتی جذباتی رائے تھی۔ صحافیانہ دیانت داری کا تقاضا ہوتا ہے کہ کوئی دوست نہیں، کوئی دشمن نہیں۔ صرف صحافی کی رائے سے ہم آہنگی یا اختلاف اس کی تائید و اختلاف کی بنیاد ہوتی ہے اور یہ بنیاد ہر صبح و شام بدل سکتی ہے اور صحافی کو اتنی جلدی رائے تبدیل کرنے کا الزام نہیں دیا جا سکتا۔ اس کی آخری رائے بھی آخری نہیں ہوتی۔ جن بزرگوں کے بارے میں محمد علی کی آخری رائے ہمارے سامنے آئی ہے اور جن دوستوں کی حمایت میں وہ علم بلند کیے نظر آتے ہیں ان کی زندگی میں چند ہی دن کے بعد معاملہ اس کے برعکس بھی نظر آ سکتا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اسی بنا پر توقع کی تھی کہ اگر وہ زندہ رہتے اور ہندوستان لوٹتے تو کانگریس کے نقطۂ نظر سے انھیں مطمئن کیا جا سکتا تھا۔

محمد علی کا سیاسی مسلک:۔

محمد علی کے بارے میں ایک معرکہ آرا بحث ان کے سیاسی مسلک کی ہے پاکستان میں آج تک جس انداز میں پیش کیا گیا ہے اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ وہ

مسلم لیگ کے رہناؤں میں سے تھے اور کانگریس کے اصول ومقاصد کے شدید مخالف اور اس کی مسلم دشمنی سے سخت بیزار تھے۔ لیکن جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں کانگریس سے ان کا اختلاف مسائل میں تھا یا اشخاص کے رویے کے بارے میں تھا۔ ان کا اختلاف اصول ومقاصد کا اختلاف نہ تھا۔ اس لیے تمام اختلافات کے باوجود انھوں نے ایسا رویہ اختیار نہیں کیا جس سے "تیسری طاقت" کے ہاتھ مضبوط ہوتے۔ ۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے باب میں کانگریس کی رائے تھی کہ محمد علی یا دوسرے مسلمان اور ہندو ممبران کانفرنس میں شریک نہ ہوں لیکن کانفرنس کے ہندوستانی شرکا، کے رویے سے بیزاری اور خود ان کی کوششوں نے یہ ثابت کردیا کہ ملک کی آزادی اور ہندو مسلم تصفیے کے بارے میں ان کے خیالات کانفرنس کے دوسرے مسلمان نمایندوں سے قطعی مختلف ہیں۔
یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے آزاد، کانگریسی اور نیشنلسٹ اخبارات ان کی کوششوں کو سراہنے میں پیش پیش تھے۔ اس لیے محض اس بنا پر کہ محمد علی نے کسی مسئلے میں کانگریس سے اختلاف کیا تھا یا کسی ہندو، مسلمان کانگریسی لیڈر کے رویے کے خلاف اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا انھیں مسلمان قوم پرور مکتبۂ فکر سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر اس کے باوجود وہ کانگریسی نہیں تھے تو یہ بھی صحیح نہیں کہ وہ لیگی تھے۔ لیگ کی پالیسی، لیگی لیڈروں کی اکثریت کے نظریے ان کے افکار اور ان کے سیاسی رویے سے انھوں نے اس سے بھی شدت کے ساتھ اختلاف کیا۔ اگر انھوں نے کانگریس کے بعض رہناؤں کے رویے پر شدید تنقید کی ہے تو لیگی لیڈر بھی ان کے نزدیک "نام نہاد ملت پرور اور دراصل نفس پرور تھے"۔

محمد علی اور کانگریس:۔

محمد علی کے سیاسی مکتبۂ فکر کے بارے میں جو رائے قائم کی ہے اس کے ثبوت میں یہی خطوط پیش کیے جا سکتے ہیں۔
نامناسب نہ ہوگا کہ یہاں کانگریس کے سیاسی اسکول کی اس بنیاد کو

بھی واضح کردیا جائے جس بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ وہ کانگریسی تھے۔

کانگریس کے مکتبۂ فکر کی بنیاد متحدہ قومیت، ہندو مسلم اتحاد، ملک کی آزادی کے بعد مستقبل میں جمہوری حکومت کے قیام کے نظریے پر مبنی تھی۔ یعنی ہندوستان میں بسنے والے تمام ہندوستانی ہیں جس طرح کہ قائداعظم محمد علی جناح کے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کے اعلان کے مطابق پاکستان میں رہنے والے تمام لوگ بلا تفریق مذہب وملت پاکستانی ہیں۔ ہندو مسلم (جو ہندوستان میں بسنے والی دو بڑی تہذیبی، مذہبی جماعتیں یا گروہ ہیں) دونوں میں اتحاد قومی زندگی کے قیام و استحکام اور ملک کی ترقی کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہندو مسلم اتحاد نہ صرف ملک کی آزادی کے لیے ضروری ہے بلکہ آزادی کے بعد جمہوری حکومت کے قیام کے لیے بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کے بعد ملک کی آزادی ہندوستان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اس کی حیثیت جسم کے لیے روح کی سی ہے۔ لیکن آزادی کے بعد ایک پائیدار جمہوری حکومت کا قیام جس میں تمام مذہبوں، تمام تہذیبوں اور مذہب کی بنیاد پر قائم ہونے والی تمام جماعتوں اور گروہوں کو ان کے تمام مذہبی شعائر اور واجبات کی ادائیگی کے حق کے ساتھ آزادی حاصل ہو۔ مولانا محمد علی اپنی زندگی کے آخری لمحے تک ان اصول چہارگانہ پر یقین رکھتے تھے اور ان کے حصول و قیام کے لیے جدوجہد میں مصروف رہے۔ متحدہ ہندوستانی قومیت پر ان کے ایمان، ہندو مسلم اتحاد کے لیے ان کی بے چینیوں، ملک کی آزادی کے لیے ان کی جدوجہد اور مستقبل میں جمہوری حکومت کے قیام کے مقصد پر ان کے غیر متزلزل یقین کے مضامین سے ان کے خطوط بھرے ہوئے ہیں۔

میں یہاں ان کی تحریر سے چند جملے نقل کرتا ہوں جس سے متحدہ ہندوستانی قومیت اور ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں ان کے خیالات پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ محمد علی "سوراج پارٹی" کے قیام و مقاصد پر تبصرہ کرتے ہوئے ہمدرد کے ایک اداریے "انڈین نیشنل یونین" (۵ اکتوبر ۱۹۲۶ء صفحہ ۲) میں لکھتے ہیں۔

"جہاں تک اس جماعت کے اوّلین مقصد یعنی ہندوستان

کی مختلف ملتوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے اور نفاق و انتشار دور کرنے اور ایک مختلف الاجزا مگر "متحدہ ہندوستانی قومیت" کے پیدا کرنے کا سوال ہے کوئی وطن پرور اور کوئی ذی عقل ہندوستانی اس سے اختلاف نہیں کرسکتا"

اس اداریے میں اختتام کے قریب وہ لکھتے ہیں:۔

"بے سوچے سمجھے کمال تعمیم کے ساتھ یہ کہہ دینا کہ کمیونلزم یا ملّیت، نیشنلزم یا قومیت کے منافی ہے۔ اس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا کہ کوئی شخص قوم پروری یا ملّت پروری کے جوش میں لوگوں کو اپنے کنبے اور خاندان کی پرورش اور ان کی تعلیم سے منع کرتا پھرے"

محمد علی اور مسلم لیگ:۔

ان کے خطوط یا مضامین میں مجھے کوئی ایسی چیز بھی نظر نہیں آئی جس سے معلوم ہو کہ انھوں نے ہندوستان میں حکومت الٰہیہ کے قیام کا خواب دیکھا تھا یا وہ ہندوستان میں اسلام کی اجتماعی قوت کو کسی خاص علاقے تک محدود کردینا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک اقبال کا "ترانہ ہندی" صحیح تر خیالات کی تعلیم دیتا ہے۔ انھیں "نیا شوالہ" کے شاعر اقبال سچی قوم پروری کے ترجمان اور نمائندہ نظر آتے ہیں اور وہ خود بھی اقبال کے نئے شوالے سے اونچی تیرتھ کی تلاش کے لیے احرام سفر باندھ چکے تھے۔

سوال آج ان کے سیاسی مکتبۂ فکر کو متعین کرنے اور فن منطق سے کام لے کر کسی بات کو ثابت کردینے کا نہیں بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ خود ان کے معاصر ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے مخالفین کی طرف سے خطابات کی جو فہرست دی ہے اس میں غدّار، قوم فروش، ہندو نواز، خوشامدی، جاہ پرست کے خطاب بھی ہیں۔ غور فرمایئے کہ اس میں متحدہ قومیت پر یقین، ہندو مسلم اتحاد کی دعوت، مشترکہ جدوجہد آزادی اور برادران وطن

کی دل آزاری کے لیے کبھی کسی حال میں کوئی لفظ زبان سے نہ نکالنے کی تلقین کا کیسا شاندار اعتراف ہے۔ ۱۹۳۰ء تک مسلم لیگ کی تاریخ میں میثاق لکھنؤ اور قائداعظم کے چودہ نکات اس کا سرمایۂ فخر تھا۔ چودہ نکات کے بارے میں ان کی رائے پچھلے صفحوں میں گذر چکی ہے کہ وہ ان سے پوری طرح متفق نہ تھے اور ان کی مخالفت سے محض مروتاً خاموش رہے تھے۔ اب رہا میثاق لکھنؤ تو اس کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> " دو سخت غلطیاں .... ایک یہ کہ نہ صرف مسلمانوں کو غیر مخلوط حلقہ ہائے انتخاب دیے گئے تھے بلکہ اسی طرح ہندوؤں کو بھی غیر مخلوط حلقہ ہائے انتخاب دے دیے گئے .... لیکن اس سے زیادہ مہلک غلطی یہ تھی کہ اکثریت ہر صوبہ میں ہندوؤں کی کردی گئی تھی۔ یعنی ایک تو چھری کو پہلے غیر مسلم حلقہ ہائے انتخاب سے زیادہ تیز کر دیا گیا تھا دوسرے ہر صوبہ میں مسلمانوں ہی کی گردن کو اس چھری کے نیچے رکھا گیا۔"

محمد علی کی یہ وقتی اور جذباتی رائے نہ تھی بلکہ نہایت سوچی سمجھی رائے تھی۔ اور کامل دس سال غور و فکر کے بعد بھی ان کی یہی رائے تھی جس کا اظہار انھوں نے ایک انٹرویو میں کیا جو روزنامہ خلافت بمبئی کے حوالے سے ۵ مئی ۱۹۲۷ء کو روزنامہ ہمدرد دہلی میں چھپا تھا۔

لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر دو آنے کی رسمی ممبری کو محمد علی کے سیاسی مکتبۂ فکر کے تصفیے کی بنیاد تسلیم کیا جائے تو محمد علی واقعی مسلم لیگی تھے۔

زبان و بیان کی چند خامیاں:۔

محمد علی کی خطوط نگاری بے ساختہ خطوط نگاری کی مثال ہے۔ انھوں نے انتہائی ضرورت کے وقت اور دل کے جوش سے مجبور ہو کر ہی خط لکھا انھیں اس کی زبان کے بارے میں سوچنے اور اس کو سنوارنے کا موقع نہیں ملا۔ ان کی تحریر کا حسن قدرتی اور فطری ہے اس میں ان کے قلم کی صنعت گری کا کوئی عمل نہیں۔

اس لیے ایسے خطوط یا تحریروں میں جن پر مکتوب نگار یا صاحب قلم کو دوبارہ نظر ڈالنے کا موقع نہ ملا ہو۔ زبان و بیان کی کوئی خامی نظر آجائے تو قطعاً تعجب نہ کرنا چاہیے۔ ایسی تحریروں میں معمولی غلطیاں رہ ہی جاتی ہیں۔ پھر اس صورت میں ان اغلاط کی اہمیت اور کم ہو جاتی ہے کہ مقصد کوئی نثر پارہ تخلیق کرنا نہ ہو بلکہ خالصاً غیرادبی موضوعات پر بے تکلف اور فی البدیہہ اظہار خیال ہو۔ لیکن چونکہ ان کے خطوط میں بعض ادبی غلطیاں بھی ہیں اس لیے یہ جائزہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ جب تک ان کی طرف بھی اشارہ نہ کر دیا جائے۔

تحریر میں حسب موقع جملہ معترضہ آتا ہی ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ جملہ مختصر سے مختصر ہونا چاہیے تاکہ بنیادی جملہ اس طرح دونیم نہ ہو جائے کہ سررشتۂ فکر ہی ہاتھ سے چھوٹ جائے اور عبارت ما بعد کا تعلق تلاش کرنے کے لیے سرگرداں ہونا پڑے۔ جملہ معترضہ مقصودِ تحریر نہیں ہوتا بلکہ مقصود کے کسی پہلو کی طرف فوری توجہ دلانے یا کسی اہم وضاحت کے لیے ہوتا ہے۔ محمد علی کی تحریر میں یہ خامی اکثر پائی جاتی ہے۔ ان کا جملۂ معترضہ خود ایک مضمون بن جاتا ہے۔ اور قاری کے ذہن سے وہ بات نکل جاتی ہے جس کی وضاحت کے لیے وہ جملہ ہائے معترضہ آئے تھے۔ تحریر کی اس خامی کا تعلق زبان سے نہیں بلکہ اسلوب سے ہے۔ محمود احمد عباسی نے ایک خط میں ہمدرد میں کام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ محمد علی اس کے جواب میں لکھتے ہیں۔

> "براہِ راست یہ بظاہر بیہودہ سوال کرتا ہوں کہ کیا آپ عین اس زمانے میں جب کہ "ہمدرد" کی حالت یہ ہے، ہاتھ بٹانے کے لیے بے تاب ہیں یا خود کسب معاش کے لیے اسی طرح مجبور رہیں جس طرح ہمدرد کو بند کر کے میں مجبور رہوں گا"

یہ ایک مربوط و مکمل جملہ ہے لیکن ہوا یہ کہ جب وہ سوال کرنے لگے تو انھیں خیال آیا کہ عباسی صاحب کو صحیح فیصلے تک پہنچنے کے لیے ہمدرد کے حالات کا علم بھی ضرور ہونا چاہیے اس لیے انہوں نے "سوال کرتا ہوں" کے بعد بطور جملۂ معترضہ کے ہمدرد کے حالات بیان کرنا شروع کر دیے اور جب وہ تقریباً پونے

چار سو الفاظ میں ہمدرد کی حالت بیان کرنے کے بعد اصل سوال تک پہنچے تو خود ان کے ذہن سے یہ بات نکل گئی کہ مکتوب الیہ کو سوال کی سماعت کے لیے وہ پہلے ہی متوجہ کر چکے ہیں اور اب انھیں صرف سوال دہرانا ہے۔ اس لیے وہ پھر از سر نو جملہ شروع کر دیتے ہیں یعنی "اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ عین اس زمانے میں . . . . " اسی طرح ان کی تحریر میں دو نقص پیدا ہو گئے ہیں ایک تو یہ کہ سوال کی تمہید اور اصل سوال میں بہت طویل وقفہ حائل ہو گیا۔ دوسرے انھیں سوال کرنے سے پہلے اس تمہیدی جملے کو پھر بیان کرنا پڑا جو وہ اسی مفہوم کا پہلے لکھ چکے تھے۔ اسی طرح وہ تصدق احمد خاں شیروانی کے نام خط میں لکھتے ہیں۔

"میں تم سے دریافت کرتا ہوں کہ یہ سچ ہے یا نہیں؟ میں تم سے دریافت کرتا ہوں کہ . . . . . "

لیکن ان دونوں جملوں کے درمیان میں ایک طویل جملہ آیا ہے اور اس طرح ان کی تحریر کے مطابق مکمل جملہ یہ ہے۔

"میں تم سے دریافت کرتا ہوں کہ یہ سچ ہے یا نہیں جیسا کہ تم خود اپنے وکالت کے زمانے میں ان جھوٹے گواہوں سے دریافت کرتے رہے ہو گے جو بیشتر عدالت میں جھوٹی گواہی نہ دینے کی وجہ سے جھوٹ کہنے کی کافی جرأت رکھتے تھے۔ ہاں ہاں! میں تم سے دریافت کرتا ہوں کہ . . . . "

میری رائے میں ایسے اور اتنے طویل جملہ ہائے معترضہ کا تحریر میں آنا اسلوب کی بڑی خامی ہے اور محمد علی کی تحریر میں یہ خامی اکثر پائی جاتی ہے۔

محمد علی نے متعدد الفاظ کو قواعد کے برخلاف مذکر یا مؤنث استعمال کیا ہے بہت سی مثالوں کا حاصل کیا؟ یہاں صرف دو تین مثالیں پیش کرتا ہوں۔

تصدق احمد خاں شیروانی کے نام خط میں ملامت اور وکالت کو انھوں نے مذکر استعمال کیا ہے۔ حالانکہ یہ دونوں الفاظ مؤنث ہیں۔

مجھ پر ایسی جفا کی کثرت کی   کہ اسے غیر نے ملامت کی (سالک)

نکالا ہے دل نے نیا اب یہ قصہ
کہ کرتا ہے مجھ سے وکالت تمھاری (اسیر)

اسی طرح انھوں نے "تفتیش" کو بھی مذکر استعمال کیا ہے۔

ان کی تحریروں میں اور خاص طور پر ایسے جملے بھی نظر آجاتے ہیں جن کی تراکیب و صحت محلِ غور ہے مثلاً "عمل کے لیے آمادۂ کار" عمل کے بعد کار کی ضرورت نہ تھی۔

محمد علی کی تحریریں بعض اور نقائص بھی ہیں مثلاً افعال و ضمائر کی عدم یکسانیت یا شتر گربگی۔ محمود احمد عباسی کے نام کے آخری حصہ میں انھیں "آپ" کی ضمیر سے مخاطب کرتے ہیں اور پھر اسی کی مناسبت سے آئیے، شریک ہو جیے، طے کر لیجیے، کر سکیے گا، دے سکیے گا وغیرہ افعال استعمال کرتے ہیں اور اس کے معاً بعد کے جملوں میں عنایت کرد اور مل جاؤ افعال استعمال کیے ہیں اور اس کے بعد کے جملے میں پھر "پڑھ لیجیے گا" نظر آتا ہے۔

لیکن جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ یہ صرف عدم توجہ اور خط لکھنے کے بعد اس پر نظر ثانی نہ کر سکنے کی وجہ سے پیدا ہوئیں۔ اگر انھیں خط لکھنے کے بعد اسے خود پڑھنے کی فرصت ملتی تو شاید بعض خامیاں وہ خود دور کر دیتے۔

محمد علی کے خطوط اپنی بے شمار بلند پایہ اور بے نظیر ادبی خصوصیات کے حامل ہونے کے باوجود اپنی سیاسی اہمیت اور تاریخی حیثیت کی وجہ سے زندہ رہیں گے۔ اس لیے کہ یہی حیثیت ان کی تمام ادبی خصوصیات پر حاوی ہے۔

ابوسلمان شاہجہاں پوری

۱۴ر اگست ۱۹۷۸ء

مکتوبات رئیس الاحرار
مولانا محمدؐ علی

تصدق احمد خاں شیروانی

(۱)

میرے پیارے شیروانی!

کیا یہ امر تعجب خیز نہیں ہے کہ جن لوگوں کو ایک شیطانی گورنمنٹ نے بھی قید کرنا پسند نہ کیا ان کو رحمت و پاکیزگی کی سیلف گورنمنٹ اپنے وجود و قیام سے قبل ہی محبوس و مقید کر دے۔ کم از کم اس قدر تو ضرور صحیح ہے کہ جب مجھ کو بمبئی میں اپنی مرضی کے خلاف بدرجہ مجبوری ٹھہرنا پڑا تو میں نے مطلوبہ آزادی کا اپنے متعلق بھی اندازہ لگایا، میں یہ شیخی بھی نہیں مارتا کہ اپنی اس عمدہ صحت (عدم صحت کا لفظ زیادہ موزوں ہوگا) کے زمانہ میں خواہ مخواہ ماہ مئی کا رمضان علی گڑھ میں گزار کر اپنے آپ کو افطاری کے کبابوں کی طرح جلانا چاہتا تھا۔ اور اسی لیے نہایت خوشی کے ساتھ مہاتما گاندھی کے ہمراہ بمبئی چلے جانے پر راضی ہو گیا۔ ادھر میری اہلیہ نے بھی کاسۂ گدائی ہاتھ میں لیا اور سمرنا و خلافت فنڈ کا نام لے کر خواجہ دمیمن کے کندھوں سے بہت سے بیکار روپیوں کا بار اُتار کر ان کو ہلکا کر دیا۔

لیکن عیدالفطر کے بعد فوراً علی گڑھ پہونچ کر تمھارے ساتھ کام کرنے میں جو چیز حائل ہوئی وہ یہ نہ تھی کہ میں علی گڑھ کی تمازت شمسی سے خوفزدہ تھا بلکہ بات یہ تھی کہ ایک انسان جس نے دنیا اور دنیا کی تمام لذات اور نفسانیت کو ترک کر دیا تھا۔ اس کو زر کی بڑی غرض لاحق ہو گئی تھی۔ ہزاروں آدمی ترک موالات کے مخالف اخباروں میں مہاتما کی متضاد حرکتوں پر رائے زنی کر رہے ہیں اور ان تحریروں کے معاوضہ میں کافی رقم پاتے ہیں۔ لیکن میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ان سے بہتر نکتہ چینی کر سکتا تھا اور میں اس کے معاوضہ میں کوئی رقم بھی نہ لیتا بلکہ مفت ہی کر دیتا اس نے (مہاتما نے) دنیا کو ترک کر دیا ہے لیکن اب بھی دنیا اس سے ایسی متعلق ہے کہ جدا ہی نہیں ہوتی۔ اس لے گوشت (مادیت) کو ترک کر دیا ہے۔ لیکن اب بھی چار من سے زیادہ گوشت

ہندوستان کے ہر گوشے میں اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ کیونکہ علی برادران کے مجموعہ کی بزرگ ہستی اس کے ہمراہ اس اعتماد سے چلتی ہے کہ جو پہاڑوں کو ہلا سکتا ہے۔ اس نے شیطان کو ترک کر دیا ہے لیکن تاہم ایک شیطانی سلطنت کے تعاقب میں وہ ایسا سرگرم ہے کہ نہ تھکتا ہے اور نہ ذرا رحم ہی کھاتا ہے۔

یہ ہیں اس مہاتما کی دو متضاد حرکتیں اور اس وہمی ولا ابالی انسان کی کیریکٹری کا تقاضا تھا کہ اس نے مجھ کو بمبئی میں اس غرض سے روک لیا کہ اس شہر سے ایک ہی مہینہ کے اندر ہم لوگ نصف کروڑ روپیہ لوٹ لیں باوجود اس کے کہ اس کا افلاس بہت ہی بدنام ہو چکا ہے۔ جب یہ کام ختم ہو چکا تو اس سنیاسی کو جو لباس کے معاملہ میں بہت کفایت شعاری کی تعلیم دیا کرتا ہے، یہ جنون سوار ہوا کہ کپڑوں کا ایک بڑا ہی وسیع مقام تجویز کر کے اس کو ٹوپی اور کوٹ، ساری اور شلوار سے پُر کر دیا جائے اور یہ کپڑے اس قدر مختلف رنگوں سے رنگین ہوں جیسے کہ جوزف کا کوٹ تھا اور ان کپڑوں کی ساخت اس قدر مختلف اور متعدد ہو کہ اس کا مقابلہ اس شخص کے نمونہ کے اشتہار سے ہو سکے جو ہر قسم کے عمدہ و فیشن کے لائق لباس کی دوکان رکھتا ہو۔ یہی وجوہ تھیں کہ تم مطمئن ہو کر خواجہ[1] کی صحبت کا لطف اٹھاتے رہے اور تم کو اس وقت بھی میری مداخلت کا اندیشہ نہ ہوا۔ جبکہ تعلقہ داران اور زمینداران آگرہ اخراج کی دھمکیاں دے رہے تھے۔

اس کے بعد بلا میری رہنمائی کے تم نے وہ قبیح جرم کیا جس سے زیادہ ناجائز فعل کا ارتکاب اس زمانہ میں غیر ممکن تھا جبکہ گورنمنٹ صلح، خاموشی اور عدم اشتداد کے لیے منت و سماجت کر رہی ہے اور تم نے یہ غضب کیا کہ صلح و امن واقعی قائم رکھا۔

میرے پیارے تصدق، کیا تم شوکت سے سبق نہیں سیکھ سکتے تھے شوکت تمام ایشیا میں سب سے زیادہ قابل نفرت ہستی ہے اور یہ محض اس لیے کہ ۷ × ۵ فٹ کے رقبہ کے باوجود وہ عدم اشتداد کی پالیسی پر عمل کرتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ خراب بات یہ ہے کہ وہ واقعی ایک صلح کن

---

[1] اشارہ خواجہ عبدالمجید کی طرف ہے۔

شخص ہیں اور اس قدر امن پسند کہ ایک مرتبہ انھوں نے ایک چڑیا کو
کھانے کے لیے اور شکار کے لطف کے لیے مار ڈالا تو اس کے لیے اب تک
برابر پچھتایا کرتے ہیں۔ اور اپنے اس فعل پر افسوس کیا کرتے ہیں۔ وہ
کوئی شکاری نہیں ہیں اور نہ انھوں نے اب تک شکار کو ختم کیا ہے۔ اس بات کو
بخوبی سمجھ کر کہ شوکت کی اس صلح و امن کی پالیسی نے دفتری حکومت میں کس
قدر نفرت پیدا کر دی ہے۔ تم نے اس کے کرنے کی جرأت کیسے کی۔ تم خود ۷×۴
فٹ ہو، اور اس وقت جب تم کو شیر نیستاں کی طرح گرجنا چاہیے تھا تم
فاختہ کی بولی بول رہے تھے۔ جبکہ علی گڑھ کے خوش خلق کلکٹر کے لیے جس
نے تم کو اپنے پہلے ہی خط میں "آپ کا نیاز مند" تحریر کیا تھا جبکہ تم کو ان
کا مخالف ہونا بھی گوارا نہ تھا۔ ایک چھوٹی سی خونریز لڑائی کا انتظام
پلیٹ فارم اور لکچروں کے ذریعہ سے ہو رہا تھا۔ تم نے یہ منادی کرا دی کہ اس
چھوٹے کرک شیتر کے بہادر سورما اپنی دلیری و بہادری کا ثبوت اپنی کامل
غیر حاضری سے پیش کریں اور اس سے بھی زیادہ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ
تم خود "علی گڑھ" سے جہاں اس جنگ کا انتظام ہو رہا تھا دس میل کے
فاصلہ کے اندر ہی اندر رہتے اور جب تم لوٹ کر علی گڑھ آئے تو تم نے
ایک سچے غیر تشدد آمیز تارک موالات کی طرح یہ گستاخی کی کہ شہر کے ان
باشندوں کو ملامت کیا جو ناجائز خواہش و رغبت کے اثر سے کچہری کے
حدود میں محض تماشہ کی غرض سے چلے گئے تھے۔

خیال تو کرو کہ باوجود ان تمام خطاؤں کے تم نے یہ جرأت کی کہ عدالت
میں کہا کہ "میں مجرم نہیں ہوں" تم مجرم تھے اور ضرور مجرم تھے۔ اس میں
ذرا بھی شک نہیں ہے کیونکہ کیا تم عین شرارت کے وقت گرفتار نہیں کیے
گئے۔ میں تم سے دریافت کرتا ہوں کہ یہ سچ ہے یا نہیں۔ جیسا کہ تم خود
اپنے وکالت کے زمانہ میں ان جھوٹے گواہوں سے دریافت کرتے رہے ہوگے
جو بیشتر عدالت میں جھوٹی گواہی نہ دینے کی وجہ سے جھوٹ کہنے کی کافی
جرأت رکھتے تھے، ہاں ہاں میں تم سے یہ دریافت کرتا ہوں کہ کیا یہ سچ

ہے کہ تم دوبارہ پولیس کو شکار کرنے سے روک رہے تھے۔ اور دنیا کا سب سے زیادہ قبیح جرم کر رہے تھے۔ یعنی امن وامان کی کوشش میں مصروف تھے۔ اور اس سے ان لوگوں کی مخالفت ہوتی تھی جو فساد وخونریزی کا عزم کر چکے تھے۔ اور کیا یہ تم سمجھتے ہو کہ ایک سال کی قید سخت کی سزا جو تم کو کمشنر کلکٹر، پولیس اور مجسٹریٹ کی امداد سے پرانے ساتھیوں اور دوستوں نے خوشی خوشی دی ہے وہ ایسے جرم کے لیے جس کو کبھی کانوں نے بھی نہ سنا ہوگا بہت زیادہ تھی۔

نہیں میرے پیارے تصدق۔ حقیقت یہ ہے کہ تم ایسے بدمعاش اور اخلاقی حیثیت سے اس قدر ذلیل تھے کہ تم کسی صورت سے اب آزاد رکھے نہ جاسکتے تھے، نہ تم اور مجسٹریٹ جس کی لمبی ڈاڑھی کا تم نے اپنے اس خط میں ذکر کیا ہے۔ جو تم نے اپنی گرفتاری، پیشی اور سزا کے وقت لکھا تھا، مل کر ایک ہوگئے تھے۔ اور یہ ہرگز ممکن نہ تھا کہ تم دونوں ایک ہی مقام پر رہتے۔ تم اس قدر امن پسند تھے کہ امن سبھا تمھارے وجود کو برداشت نہیں کرسکتی تھی اور تم قانون کی پابندی میں اس قدر مبالغہ کرتے تھے کہ قانون وانتظام کے قایم کرنے والے تمھارے دشمن ہوگئے تھے۔ اور اس کے بعد ذرا اپنی صورت پر بھی غور کرو۔ کیا تمھاری صورت سے ہمارے اس بیان کی تصدیق نہیں ہوتی جو ہم لوگوں نے تمھارے متعلق کہا تھا یعنی "ان ڈاکوؤں کے گروہ کا ایک فرد جو راج شاہی جیل سے بھاگ گئے تھے" ورنہ تمھارے اس قد وقامت، تمھاری اس قلیل ڈاڑھی جو نئی اُگی ہوئی گھاس معلوم ہوتی تھی اور تمھارے اس چھوٹے کھدر کے کرتہ سے جس سے یہ پتہ چلتا تھا کہ شاید کمبرج کے بدمعاشوں سے تم نے اسے بدل لیا ہے اور کس قسم کے انسانوں کا پتہ چلتا تھا۔

سرکار، قومی سرکار کے مقبول پانیر کے بڑے لمبے لمبے ہاتھ ہیں اور وہ ڈاکو جو راج شاہی جیل سے بھاگا اس کو سنٹرل جیل نینی تال کے پاگل خانہ میں بند کردیا گیا ہے اور یہی اس کے لیے موزوں ہے۔ امن وسکون کی محبت تمھارے

دل میں بہت زیادہ تھی اور تم نے عقل سے کام نہیں لیا اس لیے اسی میں تم کو امن وسکون سے رہنا ہے۔

تم کو معلوم ہے کہ میں کراچی سے سیدھا علی گڈھ آنا چاہتا تھا۔ لیکن اس عاجز وتنک مایہ انسان سے کوئی اس امر کے متعلق بھی انکار نہیں کر سکتا، جس کو کو شملہ کے شاہنشاہ سے انکار کرنے کے لیے تیار رہو۔ مجھ کو بلا شرط ہتھیار ڈال دینا پڑا اور ایک پالتو جانور کی طرح میں اس کے ساتھ بمبئی چلا گیا۔ چند وجوہ سے اس نے ہم کو وہاں تین ہفتے تک روک لیا (میں چند باتیں کہنے جا رہا تھا) لیکن جب اس نے ہم کو آزادی کا حکم سنایا تو اس کے ساتھ ہی اپنا اسباب بھی باندھا۔ اور ہم لوگ علی گڑھ پہونچے جو تمھاری امن وسکون کی لڑائی کی جگہ ہے۔ اور ہم دونوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس صلہ میں کہ تم امن وسکون کی تعلیم کے لیے جیل خانہ بھیج دیئے گئے ہو۔ اس وقت تک جامعہ ملیہ اسلامیہ کو کوئی علی گڑھ سے جدا نہیں کر سکتا جب تک ہم لوگوں میں ذرا بھی طاقت باقی ہے۔ یعنی وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ جس کے اوپر تم نے اپنے ذاتی تمام حوصلوں اور دیگر امیدوں کو قربان کر دیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ خط تم کو نہیں ملے گا۔ کیونکہ الہ آباد آنے کے بعد یہ دوسرا خط میں نے لکھا ہے جو پوسٹ نہ کیا جائے گا۔ اور نہ میں گورنمنٹ سے اجازت طلب کروں گا کہ تمھارے چہرے کو جو بالکل ریچھ کی مانند ہے دیکھوں اور خود کو تمھاری گود میں ڈال دوں۔ لیکن میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ اس عزم وارادہ کو تحریر کر دوں کہ قومی یونیورسٹی اسی مقام پر رہیگی جہاں قوم نے اس کو قایم کر دیا ہے یعنی تمھارے آباؤ اجداد کی اس سرزمین میں جہاں سرسیّد احمد نے ان بزرگوں کی فیاضی سے راغب ہو کر وہ مدرسۃ العلوم قایم کیا تھا۔ جس سے یہ امیّد تھی کہ اس سے بہترین مسلمان پیدا ہوں گے۔ سرسیّد مرحوم کے نام نہاد جانشینان علی گڑھ کو بزدلوں اور غلاموں کا مرکز بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن جس طرح تم اپنے آباؤ اجداد کی روایات پر قایم ہو۔ اسی طرح وہ لوگ جن کو تم قومی یونیورسٹی میں چھوڑ آئے ہو۔ اس بات پر نہایت

استقلال و صداقت سے تلے ہوئے ہیں کہ ان نصب العین کو پیش نظر رکھیں گے جو ہم لوگوں نے مل کر "ڈیرا ولڈ کالج" میں بنائے تھے۔

میں تمھاری اہلیہ کا کوئی تذکرہ مناسب نہیں تصور کرتا جو اپنے اکلوتے بچّہ کی وفات سے نصف دیوانی ہو رہی تھی کہ یہ حادثہ بھی پیش آگیا۔ لیکن وہ اب تک خدا کی مرضی پر ہر حال میں راضی و خوش ہے۔ میں تمھاری والدہ کے متعلق کچھ نہ لکھوں گا۔ جنھوں نے دلیری و جرأت کے ساتھ مہاتما کے گفتگو کی ہے تمھارے والد کا بھی ذکر نہ کروں گا جو اس حالت میں سب سے زیادہ خوش تھے اور نہ میں وفادار فدو[1] کے متعلق کچھ کہوں گا جس کا قدیم جنوں اب تک قائم ہے البتہ اس میں تازگی آگئی ہے اور نہ نثار[2] کا تذکرہ کروں گا جن کے لبوں سے مسکراہٹ کبھی جدا نہیں ہوتی اور جن کی ڈاڑھی تمھاری یاد میں اس قدر چھوٹی اور چونکہ محض نصف اُگی ہوئی تھی اس لیے مجھے خواہش ہوئی کہ اسے چرجاؤں۔

کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ان امور پر تمھارا خیال سر دست راغب نہ ہوگا میرے لیے بہتر ہے کہ میں محض یونیورسٹی کا تذکرہ کروں جو کبھی ہم لوگوں کا "قدیم پیارا کالج" تھا۔ اور اس میں جو لوگ رہ چکے ہیں۔ ان کے لیے یہ یونیورسٹی کل علی گڑھ ہی نہیں بلکہ ان کے لیے دنیا بھی ہے۔ کبھی یہ ہماری ماں تھی۔ اور اکتوبر میں اس نے دوسرا بچّہ دیا۔ جو ہم سب لوگوں کا سب سے پیارا بچّہ ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ بچّہ صحیح و سالم ہے اور تم کو اس کی صحت و سلامتی کی طرف سے اس وقت تک اطمینان رکھنا چاہیے۔ جب تک دن و رات اس بچّہ کی ماں کی خدمت انجام دے رہے ہیں میں قریب قریب یقین کرتا ہوں کہ انسانی ہمدردی کا دودھ خواجہ کے سینہ میں تمھاری گرفتاری کے وقت سے دوڑ رہا ہے۔

افسوس ہزار افسوس کہ میں اب تک مہاتما کا مستقل ساتھی ہوں اور

---

[1] فدا احمد خاں۔ تصدق احمد خاں کے چھوٹے بھائی تھے اور پیار سے انھیں سب فدو کہتے تھے۔

[2] نثار احمد شیروانی، یہ بھی مرحوم شیروانی کے چھوٹے بھائی تھے۔ آزادی کے بعد یو۔ پی کے وزیر بھی رہے

یہ مستقل انسان برابر متحرک ہے۔ لیکن کیا اس بات کی ضرورت ہے کہ کوئی مسلمان اس بات کو مہاتما سے زیادہ محسوس نہیں کرتا کہ ہم لوگ سب مل کر بہادرانہ مقابلہ کر کے اس دنیا کے اس گوشہ کو قایم رکھیں جو علی گڑھ کے نام سے موسوم ہے اور ان تمام باتوں کی پاک یادگار قایم رکھنے کے لیے جو آج ہم کو اعلیٰ و اشرف معلوم ہوتی ہیں یا بیشتر اعلیٰ و اشرف تھیں اس کو متحرک رکھیں۔ واپس شدہ ملزم اب رخصت ہوتا ہوں۔ میں تم کو اس فضول تسکین و تشفی دینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ چند ہفتوں میں تم رہا ہو جاؤ گے یعنی جبکہ جمہوریہ ہند کا اوّل صدر تمھاری ایسی چڑیوں کو جو سر دست جیل میں بند ہیں قفس سے آزاد کرے گا۔ تمھارے پر اس قدر مضبوط ہیں کہ قفس کی تیلیوں کو شکست دے سکتے ہو۔ لیکن تم نے ایک سال کی قید سخت اس لیے منظور کر لی ہے تاکہ تمھارے راج شاہی جیل خانہ کی شہرت میں فرق نہ آوے۔ تم کو جیل خانہ کے باہر آکر کیا خوشی ہوگی جبکہ اب تک بہت سے شیروانی جو دراصل "شیروانی" نہیں ہیں آزادی کی برکات کے لیے مزے اڑا رہے ہیں۔ اور بہت سے لوگ ایسے موجود ہیں جو زمینداری کی آمدنی سے کھاتے ہیں اور موٹے ہوتے ہیں اور تم کو قید کرانے میں مدد دینے کے بعد گھٹنوں کے بل ٹیک کر کہتے ہیں "اچھے خدا وندا ان پر رحم کر[1]"

تمھارا طائر جیل
محمد علی

---

[1] اشارہ نواب سر مزمل اللہ خاں کی طرف ہے جنھوں نے شیروانی مرحوم کو گرفتار کروانے میں مدد دی تھی اور اپنے ملازمین سے ان کے خلاف گواہی دلوائی تھی۔

جیمز مارلےؔ[1]

(۲)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈیر مسٹر جیمز مارلے!

گول میز کانفرنس کا شاید میں اکیلا مندوب ہوں جو درجۂ مستعمرات کا اتنا طرف دار اور خواہش مند نہیں جتنا کہ ہندوستان کی مکمل آزادی کا کیونکہ نیشنل کانگریس کے اجلاس منعقدہ مدراس میں، جو میرے قدیم دوست ڈاکٹر انصاری حال اسیر فرنگ کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا۔ وہ پنڈت جواہرلال نہرو صدر کانگریس ہی تھے۔ جنھیں میں نے ۱۹۲۴ء میں کانگریس کا صدر منتخب ہونے کے وقت اپنا سکریٹری مقرر کیا تھا اور جنھوں نے کامل آزادی کی قرارداد پیش کی تھی اور وہ میں تھا جس نے اس کی تائید و حمایت کی تھی۔ اگلے سال جب نہرو رپورٹ پر بحث و تمحیص کی گئی تو غریب جواہرلال کو ایک سال تک انتظار کرنے کی ترغیب دی گئی۔ لیکن میں نے ہرگز انتظار سے کام نہیں لیا۔ بلکہ اس رپورٹ کی مخالفت کی۔ تاہم جب میں ہندوستان کی آرزوئے آزادی سے متاثر ہوا تو وائسرائے ہند انگلینڈ کو چلے گئے۔ مراجعت پر آپ نے اپنا مشہور و معروف اعلان کردیا۔ گاندھی جی اور دیگر لیڈروں نے خواہش ظاہر کی کہ میں قرارداد لوربل کی حمایت کروں اور پنڈت جواہرلال نہرو کو بھی ایسا ہی کرنے کی ترغیب دی۔ میں نے اس پر اپنا بیان اضافہ کرنے کے بعد ایسا کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ مجھے افسوس ہے کہ گاندھی جی نے تمام صورت حال کو خراب کردیا اور اب وہ اس امر کا خمیازہ بھگت رہے ہیں کہ اول انھوں نے ۱۹۲۸ء میں اور پھر ۱۹۲۹ء میں پنڈت جواہرلال نہرو کو قرارداد آزادی کے اعلان پر مجبور کیا۔

میں جس مقام پر پہلے کھڑا تھا۔ اب بھی اسی پر جما ہوا ہوں۔ کانگریس

---

[1] رکن پارلیمنٹ و سکریٹری پارلیمنٹری پارٹی آف کامن ویلتھ آف انڈیا لیگ، لندن

نے مکمل آزادی کو اپنا نصب العین قرار دیا ہے لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں ہندوستان کے لیے درجہ مستعمرات کو قبول کرلوں گا۔ بشرطیکہ وہ دیگر مستعمرات کے مساوی ہو۔ میں اسے چھوؤں گا، چکھوں گا، چباؤں گا اور سونگھوں گا۔ اگر مجھے یہ چیز اچھی معلوم ہوئی تو صرف اسی صورت میں ہی میں اسے منظور کردوں گا لیکن اس کا فیصلہ اب اور آج ہونا چاہیے۔

میں نے اپنے لبرل دوستوں سے جن کے ساتھ ملاقات کرنے کا مجھے موقع ملا ہے، کہہ دیا ہے کہ میں درجہ مستعمرات کے حصول کے لیے کوشش کررہا تھا حیات مستعار نہایت مختصر، محدود اور قلیل ہے۔ اور میں اپنے سفرِ حیات کے خاتمے پر پہنچ چکا ہوں۔ لیکن میری آرزو ہے کہ زندگی کے ختم ہونے سے پہلے میں ہندوستان کی سیاسی منزل مقصود اور منتہا کو دیکھ لوں۔ مجھے توقع ہے کہ آپ کی لیگ اس امر کا خیال رکھے گی کہ گول میز کانفرنس ہندوستان کے لیے صحیح درجہ مستعمرات حاصل کرے گی۔

مجھے خدشہ ہے کہ انگلستان کا کوئی مدبر یا پارلیمنٹری پارٹی دارالعوام یا انتخاب عامہ میں ہندوستان کی خاطر شکست کھانے کے لیے تیار نہیں ہوگی۔ یقیناً یہ آثار امید افزا نہیں۔ تاہم مجھے امید ہے کہ دارالعوام کا ایک آدھ رکن دنیا کی آبادی کے پانچویں حصے یعنی ہندوستانیوں کی خاطر کامل سیاسی ہزیمت برداشت کرنے کے لیے بھی تیار رہے۔ اور ان کے ساتھ انصاف کرتے نیز برطانیہ عظمیٰ اور ہندوستان کے درمیان دوستی قائم رکھنے پر آمادہ ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میرے اس بیان کو جو ہندوستانی مطمح نظر کا مرقع ہے اور اسے صاف صاف اور علانیہ طریق پر پیش کرتا ہے۔ کسی ایسے اخبار یا میگزین میں شائع کرسکتے ہیں جو اسے شائع کرنا پسند کرے۔ میں نے صرف وطن عزیز کی خاطر گول میز کانفرنس میں شامل ہونے کی زحمت گوارا کی ہے اور اس غرض سے بے شمار تکالیف برداشت کی ہیں۔

آپ کا مخلص

محمد علی[1]

---

[1] انقلاب ۱۰ دسمبر ۱۹۳۰ء۔ ص ۴

سر جیمس مسٹن

[۱۹۱۳ء میں مسجد مچھلی بازار کانپور کے انہدام کا جو حادثہ پیش آیا اور جس نے برصغیر کے مسلمانوں کے دلوں کو ہلا کر رکھ دیا وہ کوئی اچانک پیش آجانے والا حادثہ نہ تھا۔ آثار و قرائن سے اس کی پیش گوئی کر دی تھی لیکن اس وقت جب کہ لوگ اس حادثے کی سنگینی سے بے خبر تھے یا صرف اخباروں میں لکھ رہے تھے۔ محمد علی نے قدم اٹھایا اور باوجودیکہ دو دو اخبار ان کے زیر ادارت نکل رہے تھے انہوں نے اسے ایک اخباری مسئلہ بنانے کی بجائے نہایت سنجیدگی کے ساتھ سوچ سمجھ کر صحیح سمت میں قدم اٹھایا اور ضلع کی انتظامیہ، کلکٹر، مجسٹریٹ وغیرہ کے رویے کو دیکھ کر براہ راست گورنر کو مخاطب کیا۔ اور جب دیکھا کہ اس مراسلت کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو وزیر حسن کو ساتھ لے کر انگلستان چلے گئے۔ اس سفر پر ان کی روانگی خفیہ طور پر ہوئی تھی۔ ایم علی اور ڈبلیو حسن کے نام سے ٹکٹ لیے گئے تھے۔ انگلستان جاکر انھوں نے حکومت کے حلقوں میں تہلکہ مچادیا۔ واپس لوٹے تو حادثہ جسے ٹالنا مقصود تھا، پیش آچکا تھا۔ انھوں نے کانپور جانا چاہا تو انھیں روک دیا گیا۔ اور پھر نظر بندی کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جو دسمبر ۱۹۱۹ء تک جاری رہا۔ یہ خطوط محمد علی کی سلامت روی اور ان کے تدبر کا بڑا ثبوت ہیں چونکہ مسئلے کے ہر پہلو کی وضاحت خود ان خطوط میں ہو جاتی ہے اس لیے اس سلسلے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں]

(۱)

(۳)

بخدمت ہز آنر سر جیمس مسٹن صاحب بہادر لفٹننٹ گورنر بمقام نینی تال

کانپور کے بہت سے مسلمان باشندوں نے مجھ سے دریافت کیا ہے کہ میں ان کی اس عرضداشت کی تائید کروں کہ مسجد مچھلی بازار کی مسجد کے ایک حصّہ کو میونسپل کمیٹی کے چیرمین کو سڑک درست کرنے کے لیے درکار ہے منہدم نہ کیا جائے۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ یور آنر کی خدمت میں ایک میموریل بھی بھیجا گیا ہے۔ اگر جواب موافق ہو تو مجھے اس معاملہ میں تحریک کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ کیا یور آنر مجھے فیصلہ سے مطلع کر سکتے ہیں؟

کانپور کے مسلمانوں میں بہت جوش پھیلا ہوا ہے۔ میں اس موقع پر خصوصیت کے ساتھ ان کے جوش کو ہلکا کرنے کا خواہشمند ہوں[1]

محمد علی کامریڈ

۱۵ر مئی ۱۹۱۳ء

(۲)

۴

بخدمت لفٹنٹ گورنر بمقام نینی تال

میں جناب کی تار کا مشکور ہوں۔ شرع اسلام کی رو سے زمین کا کوئی حصّہ جو مسجد کی غرض کے لیے وقف کر دیا گیا ہو، کسی اور مقصد کے لیے منتقل نہیں ہو سکتا۔ جس مقام پر وضو کیا جاتا ہے۔ وہ حصّہ ہمیشہ مسجد کا جزو سمجھا جاتا ہے۔

کانپور کے مسلمانوں کا جواب ہے کہ جس حصّہ مسجد کو منہدم کرنے کی غرض

---

[1] گورنر کی جانب سے جواب ملا کہ:۔

"میموریل میں جو اعتراضات کیے ہیں ان پر احکامات جاری ہو گئے ہیں۔ میں نے اس معاملہ پر خاص طور سے ذاتی توجہ کی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ یہ شکایت زیادہ تر ذہنی و خیالی ہے۔ یہ امر کہ مسجد کا حصّہ انہدام طلب غسل خانہ ہے اور در اصل متبرک عمارت کا کوئی جزو نہیں ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان جوتا پہن کر اس احاطہ میں داخل ہوتے دیکھے گئے ہیں۔ بہر حال ہر طرح سے کوشش کی جائیگی کہ غسلخانہ ایک مناسب موقع زمین پر بنوا دیا جائے لیکن سڑک کی لائن بدلی نہیں جا سکتی مسجد کا ادب ہر طرح سے ملحوظ رکھا جائیگا"

سے مانگا جاتا ہے اس مقام پر جوتی نہیں پہنی جاتی ۔ بلکہ جب کبھی نمازیوں کا زیادہ مجمع ہو جاتا ہے ۔ اس وقت وہاں نماز ادا کی جاتی ہے ۔ میں یور آنر کی اس خواہش کو بہ نظر استحسان دیکھتا ہوں کہ یور آنر مسجد کا احترام کرنا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی وضو وغیرہ کے لیے منہدم شدہ حصّہ کی عوض کوئی مناسب جگہ دینی چاہتے ہیں ۔ لیکن مجھے شبہ ہے کہ یور آنر کو متنازعہ فیہ کے متعلق کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے ۔ میرا منشا ہرگز یہ نہیں ہے کہ محض خیالی شکایات کی بنا پر گورنمنٹ کو پریشان کروں اور خصوصاً اس نازک موقع پر مگر میں یور آنر سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سڑک کی لائن ایسا معاملہ نہیں ہے ۔ جس کی وجہ سے ایسی شکایات پر سر برآوردہ اور معقول اشخاص کو پیدا ہو گئی ہیں ۔ باقی رہنے دی جائے جس سے ناانصافی کا خیال قائم ہو سکے ۔ میں نہایت ادب کے ساتھ یور آنر کو مشورہ دیتا ہوں کہ کسی قسم کی کوئی کارروائی کرنے سے پیشتر آپ اس معاملہ کے متعلق مسلمان علما اور قانون داں اصحاب سے مشورہ فرمالیں۔[۱]

محمد علی کامریڈ

۱۶ر مئی ۱۹۱۳ء

---

[۱] سر جیمس مسٹن کی جانب سے مولانا محمد علی کی اس نہایت معقول اور توجہ طلب بات کا دو ٹوک الفاظ میں یہ جواب ملا " میں حکام مقامی کو پہلے ہی احکام بھیج چکا تھا ۔ مگر میں نے چاہا کہ آپ کی نہایت معتدل و معقول درخواست دوبارۂ غور مزید کو نظر انداز نہ کروں ۔ میں نہایت صفائی کے ساتھ آپ سے کہتا ہوں کہ میری رائے میں یہ جوش کسی حقیقی مذہبی شکایت پر مبنی نہیں ہے ۔ اگر اس معاملہ میں مجھے شبہ کا شائبہ بھی ہوتا تو میں نہایت احتیاط کے ساتھ ایسے امر سے احتراز کرتا ۔ جو حقیقی جذبات کو صدمہ پہنچانے والے ہوتے ۔ مگر جو شہادت میرے پاس ہے ۔ اس سے قطعی اور مختتم طور پر ثابت ہوتا ہے کہ غسل خانہ کے متعلق شور و شغب بعد از وقت ہے ۔ اور یہ کہ جو حصّہ منہدم کیا جانے والا ہے اس میں مسلمان جوتا پہنے جاتے ہیں ۔ امر آخر الذکر کے متعلق کسی شبہ کی گنجائش کا امکان بھی نہیں معلوم ہوتا ۔ میں بصداقت امید کرتا ہوں کہ مسلمانوں کی عقل سلیم انھیں اس معاملہ کو طول دینے سے باز رکھے گی ۔ ہم سے جس قدر ہو سکے گا معاملات میں آسانی و سہولت پیدا کریں گے ۔ مگر آپ اچھی طرح اندازہ کر لیں گے کہ امور عامہ سوائے صحیح اور کافی وجوہ کے رد کی نہیں جا سکتی۔"

(۳)

(۵)

مائی ڈیر جیمس

میں کانپور کی مسجد کی بابت جناب کو پھر تصدیعہ دینا چاہتا ہوں ۔ چند اردو اخباروں میں اس معاملہ پر تھوڑی بہت بحث ہو چکی ہے ۔ اور مجھے خطرہ ہے کہ باقی اخبارات بھی فی الفور معاملہ کو ہاتھ میں لے لیں گے ۔ میرا خیال ہے کہ اردو کے اخبارات میں جو مضامین سرکاری افسروں کے متعلق شائع ہوتے ہیں عموماً ان کا اثر ان افسروں پر نہیں ہوتا ۔ کیونکہ عام طور پر وہ اردو نہیں جانتے ہیں ۔ اور میں نے یہ التزام مدِّ نظر رکھا ہے کہ جس امر کو گورنمنٹ کے مطالبہ میں لانا منظور ہوا سے "کامریڈ" میں شائع کیا جائے ۔ اور جو عوام (پبلک) کی واقفیت کے لیے لکھا جائے وہ "ہمدرد" میں شائع ہو ۔ اس لیے میں نے مذکورہ بالا مضمون کے متعلق "ہمدرد" میں کچھ بھی لکھنا مناسب نہ سمجھا ۔ کیونکہ اس قسم کی تحریریں گورنمنٹ پر تو کوئی اثر نہیں کرتیں اور خاص مزاج کے لوگوں کو بھڑکا دیا کرتی ہیں ۔ مگر یور آنر کی حالت اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہے اس لیے کہ یور آنر اردو اخبارات کو خود اچھی طرح پڑھ سکتے ہیں ۔ کانپور کی مسجد کے متعلق میں "کامریڈ" میں ضرور لکھتا ۔ اگر مجھے یہ امید نہ ہوتی جواب ہے کہ وہی نتیجہ اور اطمینان بخش نتیجہ یور آنر سے خط و کتابت کرنے سے بھی حاصل ہو سکتا ہے جو اخبار میں اس بحث کو اٹھانے میں ہو سکتا تھا ۔ لیکن اس وقت تک تو مجھے مایوسی ہوئی ہے کیونکہ باوجودیکہ یور آنر میری درخواست کو میانہ روی اور راستی پر محمول فرماتے ہیں لیکن اب تک اس کا کوئی نتیجہ مترتب نہیں ہوا ۔ لیکن میں اب تک بالکل نا امید نہیں ہوا ۔ اور ایک دفعہ پھر یور آنر سے التجا کرتا ہوں کہ اس تجویز کو منظور فرما کر علماء اور قانون دان اصحاب سے مشورہ فرمائیں ۔ مجھے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت یہ سوال زیر غور ہے کہ جس حصۂ عمارت کو میونسپلٹی کے چیئرمین منہدم کرنا چاہتے ہیں اس میں آج کل نماز پڑھی جاتی ہے یا نہیں ۔ لیکن جس امر پر سب سے پہلے توجہ ہونی چاہیے تھی وہ یہ ہے کہ کوئی ایسی

عمارت جو فی سبیل اللہ وقف کرادی گئی ہو اس کا کوئی حصہ بیع یا کسی اور مقصد کے لیے منتقل کیا جا سکتا ہے۔ میں نہ تو اسلامی فقہ سے واقف ہوں اور نہ کچھ ایسا ماہر قانون ہوں۔ لیکن مجھے وثوق ہے کہ اس قسم کی موقوفہ املاک کو کسی اور غرض کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر میرا یہ وثوق بجا ہے۔ تو اس عمارت کے کسی حصہ کو بھی منہدم کرنے سے ہم سب کے محسوسات کو صدمہ پہنچے گا۔ اور ایسی حالت میں یور آنر خود فیصلہ فرما سکتے ہیں کہ سڑک مذکورہ کی داغ بیل اس قدر بیش قیمت ہے کہ وہ ہمارے ہاتھ اس قدر گراں بیچی جا رہی ہے۔ ہم حکام کی مجبوری کی اس وقت کچھ قدر کر سکتے تھے۔ اگر مسلمانوں کی مصیبت کی وجہ سے کوئی مہتم بالشان پبلک عمارت بنتے بنتے رک جاتی۔ لیکن صاف عرض کرتا ہوں کہ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس وجہ سے کہ میونسپلٹی کے چیرمین سڑک کو علم ہندسہ کی رو سے درست کرنا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں کے محسوسات کو نظر انداز کر دیا جائے۔ حالانکہ وہ سڑک میں خم دے سکتے تھے۔ اور عمارت بالکل محفوظ رہ سکتی تھی مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ اگر سڑک کا خط سیدھا کھینچا جاتا تو مساجد کو چھیڑنے کی بھی ضرورت نہ پڑتی۔ اور ایک مندر کو بچانے کے لیے مسجد سے قریباً ۱۵۰ فٹ کے فاصلہ پر کوئی ۸ فٹ کا ایک خم کر دیا گیا۔ میں نے کانپور کے مسلمانوں سے جو مجھے ملنے کے لیے یہاں آئے تھے کھود کھود کر دریافت کیا کہ اس وجہ سے مسلمان ہندوؤں سے تو کچھ آزردہ دل نہیں ہوں گے۔ لیکن مجھے یقین دلایا گیا ہے کہ ہندوؤں سے کوئی عناد اس وجہ سے نہیں ہے کہ یور آنر نے مندر کو بچانے کا فیصلہ کیا ہے۔ جو عین وسط میں واقع ہے۔ بلکہ امر واقع یہ ہے کہ وہ اس معاملہ میں برابر اس امر کے متمنی رہے ہیں کہ میونسپل بورڈ کانپور کے ہندو ممبروں کی امداد حاصل کریں اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے کہ جہاں ہندوؤں نے اس معاملہ میں مسلمانوں کی امداد کی ہے وہاں مسلمانوں نے بھی ایک ہندو جنٹلمین کی یہ ترمیم منظور کر لی تھی کہ اس معاملہ کے متعلقہ ریزولیشن کے نفس مضمون کو بہ نسبت اصل کے جو میونسپل بورڈ ایجنڈا میں درج تھا، نرم کر دیا جائے۔ بلکہ جب اس مسئلہ پر ۲۸ مئی کو ممبروں سے رائے لی گئی تو اس وقت بھی یہ ظاہر ہوا کہ بجائے مخالفت کے زیادہ تر ہندوؤں

نے ہی اس امر پر زور دیا کہ اس کارروائی کو روک دیں ۔ تاکہ مسلمانوں کو پھر ایک دفعہ گورنمنٹ سے عرض معروض کرنے کا موقع مل جائے ۔ لیکن مجھے معلوم ہوتا ہے کہ چیرمین صاحب کا اس معاملہ میں خاص حصّہ ہے ۔ اور وہ اپنی تمام طاقت کام میں لائے ہیں ۔ انھیں کی رائے نے آخری موقع پر بھی مسلمانوں کے خلاف معاملہ طے کر دیا تھا ۔

اگر صاحبان کانپور کا بیان صحیح ہے تو اس سے کلکٹر صاحب ضلع کے اس طریق عمل کی عجیب حقیقت کھلی ہے ۔ جو وہ اس امر کا ثبوت بہم پہنچانے میں استعمال کر رہے ہیں کہ مسجد کے جس حصّہ کو میونسپلٹی کے چیرمین منہدم کرنا چاہتے ہیں وہ مسجد کا جزو نہیں ہے ۔ ان کا بیان ہے کہ :-

مسٹر ٹائیلر مسجد کے زیر بحث حصّہ میں بلا اجازت جوتی سمیت گئے اور وہاں سے واپس ہو کر کہا کہ اگر یہ مسجد کا حصّہ ہوتا تو مجھے ضرور روک دیا جاتا ۔ اگر یہ خبر صحیح ہے تو مسلمانان کانپور اسی قابل تھے اور ان کا علاج یہی تھا ۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ مہذب دنیا میں کہیں بھی کوئی مجسٹریٹ شہادت پیدا کرنے کے لیے یہ طریق اختیار نہیں کرے گا ۔ اور بجز مسلمانوں کے جنھیں ہمارا دوست ٹامس طرح طرح کے الزام دیتا ہے کوئی اور قوم اس قسم کے سلوک کو گوارا نہیں کر سکتی ۔ مجھے معلوم نہیں ہے کہ یور آنر کے پاس اس مضمون کے متعلق کیا اطلاع پہنچی ہے ۔ لیکن اگر مسٹر ٹائیلر نے شہادت پیش کی تو مجھے امید ہے کہ یور آنر نے ان کو ضرور نصیحت کی ہوگی ۔ کیونکہ اگر یہ واقعات راست ہیں تو وہ ضرور کسی نہ کسی نصیحت کے محتاج ہیں ۔ حق الامر یہ ہے کہ اگر جوتا گندگی سے پاک ہو تو از روئے شریعت مسلمان جوتی سمیت مسجد کے فرش پر نماز پڑھ سکتے ہیں ۔ لیکن چونکہ ہندوستان کی سڑکیں عموماً ایسی صاف نہیں ہوتیں کہ اگر مسلمانوں کی جماعت جوتی سمیت نماز پڑھے تو فرشِ مسجد نماز کے قابل رہے ۔ اس لیے شدہ شدہ اس عام فہم خیال نے ہندوستان میں ایک رسم ورواج کی صورت اختیار کر لی ہے کہ کسی شخص کو جوتی سمیت مسجد میں نہ آنا چاہیے ۔ اور ایک عرصہ تک اس دستور سے مسلمانوں کو چنداں دقّت بھی محسوس نہ ہوئی ۔ اس لیے کہ ان کا جوتا درحقیقت سلیپر ہوتا

ہے (اور اس کو اتارنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی) لیکن یورپین اصحاب بعض بعض مسجدوں میں بوٹ پہنے ہوئے گھس جاتے ہیں۔ جس سے مسلمانوں کو بہت رنج ہوتا ہے۔ اور مجھے یہ بتلایا گیا ہے کہ خود ہز ایکسیلنس وائسرائے بہادر بہ نفس نفیس اس رواج کو قولاً نہیں بلکہ عملاً مسدود کرنے والے ہیں اور اس کے بعد ہمیں امید ہے کہ نہ صرف دہلی کی جامع مسجد بلکہ آگرہ کی بعض بعض مقدس عمارات بھی جن میں مسٹر مورڈن نے غیر مسلموں کو مع بوٹ جانے کی اجازت دے دی ہے۔ بوٹوں کی پامالی سے محفوظ ہو جائیں گی اور واجب التحریم شمار ہوں گی۔ لیکن مسلمانان کانپور زور کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ہر طرح سے یہ ثابت کرنے کے لیے تیار ہیں کہ جس حصہ کو منہدم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اس پر کبھی بھی جوتیاں نہیں گئیں اور نہ کبھی زینہ کے قدموں سے آگے جوتیاں رکھی جاتی ہیں۔ بلکہ جب نمازی زیادہ ہو جاتے ہیں تو اس حصہ پر نماز ادا کی جاتی ہے۔

بہر نوع جیسا کہ میں پہلے اپنے ایک تار میں عرض کر چکا ہوں۔ ہر ایک جگہ وضو گاہ مسجد کا لازمی حصہ ہوا کرتی ہے اور جس قدر حرمت مسجد کے کسی اور حصہ کے لیے واجب ہے اس قدر حرمت وضو گاہ کے لیے بھی واجب ہوتی ہے۔

مجھے جو کچھ اطلاع ملی ہے اس کی بنا پر میرا خیال ہے کہ پہلے تو یہی تجویز تھی کہ اس مندر کو منہدم کر دیا جائے جو عین سڑک کے وسط میں واقع ہوتا ہے۔ لیکن اہل ہنود کی داد فریاد پر گورنمنٹ نے بالکل بچا گیا۔ اگر اس کو بچا لیا۔ اس کے بعد یہ تجویز ہوئی کہ مندر کے عوض میں کیوں نہ مسجد کا ایک حصہ منہدم کر دیا جائے بیان کیا گیا ہے کہ جب نومبر گزشتہ میں یور آنر کانپور میں رونق افروز ہوئے ہیں تو میونسپل بورڈ کے مسلمان ممبروں نے یور آنر کی خدمت میں التجا کی تھی کہ انھیں اس امر کا یقین دلایا جائے کہ مسجد منہدم نہ کی جائے گی۔ اور میں نے "ہیرلڈ آف انڈیا" میں دیکھا کہ یور آنر نے ممبروں کو یقین دلایا تھا کہ امپرومنٹ ٹرسٹ کمیٹی مسجد اور مندر دونوں کو ہاتھ تک نہ لگائے گی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ باوجود آنجناب کے وعدے کے امپرومنٹ ٹرسٹ نے ایک ریزولیشن پاس کیا کہ اس حصہ مسجد کو حاصل کر لیا جائے اور اس کے عوض میں شمال کی جانب ایک قطعہ

دے دیا جائے۔ لیکن جس وقت یہ ریزولیشن میونسپل بورڈ کے سامنے منظوری کے لیے پیش ہوا تو مسلمان ممبروں کی مخالفت کی وجہ سے ملتوی کر دیا گیا اس کے بعد مسٹر ٹائیلر مسجد کو ملاحظہ کرنے کے لیے گئے۔ اور بوٹ پہنے ہوئے اس حصہ مسجد پر چڑھ گئے۔ بعد ازاں ایک میٹنگ میں پانچ کانپوری علمار نے فتویٰ دیا کہ مسجد کا یہ حصہ مسجد ہی میں شامل ہے اور میٹنگ نے اس مضمون کا ریزولیشن پاس کر دیا۔ اس کے بعد بورڈ کا ایک اور اجلاس ہوا اور قبل از وقت نوٹس نہ دینے کی وجہ سے ایک مسلمان ممبر کی اس تحریک کو مسترد کر دیا گیا کہ مسجد کا یہ حصہ مسمار نہ کیا جائے۔ چنانچہ شہر کے ممتاز مسلمانوں کے ایک وفد نے کلکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ مسجد کا یہ حصہ بچا لیا جائے اور انھوں نے ہولسے روڈ کی نظیر بھی پیش کی جس کی داغ بیل پہلے اس طرح ڈالی گئی تھی کہ چھوٹی عیدگاہ کی وضوگاہ سڑک میں آئی تھی۔ لیکن جب مسٹر ہولسے کی خدمت میں مسلمانوں کا وفد حاضر ہوا تو ان کی خواہشات کو ملحوظ رکھ کر سڑک کا رُخ بدل دیا گیا تھا۔ میرے پاس ہولسے روڈ کا ایک نقشہ موجود ہے۔ جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ مسجد کا گیارہ فٹ عریض حصہ سڑک میں آنے سے بچا لیا گیا ہے لیکن اگر ان دنوں بھی علم ہندسہ کی رو سے مستقیم سڑک بنائی جاتی تو وہ بھی منہدم ہو جاتی۔ سڑک عموماً ۱۰۵ سے ۱۰۵ فٹ تک چوڑی ہے۔ لیکن یہاں یہ مسجد کے پاس سے گزری ہے وہاں ایک جگہ تو اس کا عرض ۹۴ فٹ رہ گیا ہے اور دوسری جگہ ۹۶ فٹ۔ اس جگہ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ مسجد زیرِ بحث کا جو نقشہ میرے پاس ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسجد کا جو حصہ سڑک کو بخط مستقیم بنانے کی غرض سے منہدم کیا جانے والا ہے وہ کہیں بھی ناپا جائے، ساڑھے تیرہ فٹ سے زیادہ عریض نہیں ہے۔

جس بات کا مجھ پر بہت ہی زیادہ اثر ہوا ہے وہ میونسپل کمیٹی کا وہ ریزولیشن ہے جو یکم اپریل کی میٹنگ میں پاس کیا گیا ہے۔ اصل ریزولیشن کے مسودہ پر بورڈ کے چار مسلمان ممبروں کے علاوہ چھ ہندو ممبروں کے دستخط ثبت تھے مگر دو ہندوؤں نے ایک ترمیم تجویز کی تھی۔ جس میں اصل ریزولیشن کی تمہید

انھوں نے چھوڑدی تھی۔ مگر اس نتیجہ سے وہ متفق تھے کہ مسجد کا کوئی بھی حصہ نہیں لینا چاہیے۔ چیرمین نے ایک اور ترمیم تجویز کی اور ایک یوریپن ممبر نے اس کی تائید کی کہ اس تجویز پر کوئی توجہ نہ کی جائے۔ لیکن صرف چار رائوں میں اس ترمیم کی تائید ہوئی۔ برخلاف اس کے تیرہ ممبران نے ہندو اصحاب کی رائے کی تائید کی اور پھر ترمیم پاس ہوگئی۔ صورت حال کو مد نظر رکھتے ہوئے بھی یور آنر کے سامنے یہ خیال ظاہر کرنا داخل گستاخی ہوگا کہ جب چیرمین اپنی من مانی بات منوا سکتا ہے تو لوکل سیلف گورنمنٹ محض ایک ڈھکوسلا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ صورت حالات کے اس پہلو نے جس قدر مجھ پر کیا ہے اسی قدر اثر یور آنر نے لیا ہوگا

یور آنر کی گورنمنٹ نے میرے دوست آنریبل مسٹر شاہد حسین کو جواب دیتے ہوئے لکھنؤ کی ایک نظیر بیان کی ہے۔ جس میں تزئین شہر کی غرض سے مسجد کی ایک وضو گاہ حاصل کرلی گئی تھی۔ مسلمانان کانپور کا بیان ہے کہ اگر اس پیش کردہ تجویز میں مولوی گنج کی ان دو مسجدوں کا حوالہ ہے جو امین آباد کے مغرب میں واقع ہیں تو ان کو یقین ہے کہ جو حصہ حاصل کیا گیا تھا وہ ایک علیحدہ عمارت تھی۔ اور وہاں کبھی بھی نماز نہیں پڑھی گئی تھی۔ بہرکیف وہ اس امر پر زور دیتے ہیں کہ ہولسے روڈ کی نظیر اس سے زیادہ زوردار ہے اور یہ کہ مان بھی لیا جائے کہ کسی جگہ کے مسلمانوں نے مسجد کی وضو گاہ کو دے دینے پر رضامندی ظاہر کی ہے۔ جو یقیناً وقف سبیل اللہ ہے تو اس قسم کی رضامندی دوسری جگہ کے مسلمانوں کو پابند نہیں کرسکتی۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ میونسپل بورڈ کا جو اجلاس ۲۰ رمئی کو ہوا تھا۔ اس میں صرف چیرمین کی آخری رائے ہی کے بل پر یہ ترمیم پاس ہوسکی کہ بورڈ کے مسلمان ممبروں کو گورنمنٹ کی خدمت میں اپنی معروضات پیش کرسکنے کی غرض سے سڑک کی مزید کارروائی مسترد نہ کی جائے۔ میرا خیال ہے کہ تین ہندوؤں کے جنھوں نے چیرمین کی تائید کی تھی۔ اور چیرمین کی رائے کے خلاف اگر مسلمان ممبروں اور ان چار ہندو ممبروں کی اب بھی وہی رائے ہے کہ سڑک کی کارروائی روک دی جائے تو یہ ایک ایسا امر ہے جس میں گورنمنٹ بخوبی سمجھ سکتی ہے کہ زیادہ ہندو اور مسلمان ممبروں کی رائے کے مقابلے میں چیرمین

کی رائے کی چنداں وقعت نہیں رہتی۔ مجھے امید اور یقین ہے کہ یہ معاملہ چیرمین کے کسی فعل سے ہندو مسلمانوں کے مسئلے کی شکل اختیار نہیں کرے گا۔ لیکن اگر یہ صورت پیدا ہو چکی ہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ کوئی نہ کوئی شخص یہ شبہ کر بیٹھے گا کہ چیرمین نے اس تنازعہ کے پیدا کرنے میں سرگرمی سے حصّہ لیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یور آنر کو اس امر کا کس قدر خیال رہتا ہے کہ کسی افسر پر ذرا سا شبہ بھی نہ ہونا چاہیے کہ وہ "رعایا میں پھوٹ ڈال کر حکومت کرو" کی تدبیر پر کاربند ہے۔ مجھے امید ہے کہ خدا کرے کانپور میونسپلٹی کے چیرمین بھی اس قسم کے شبہات سے پاک رہنے کے اسی طرح خواہشمند ہوں۔ میں نے مسلمانان کانپور کو مشورہ دیا ہے کہ اگر وہ پہلی التماس کو آخری التماس سمجھ کر خاموش ہونا نہیں چاہتے تو یور آنر کی خدمت میں اپنی معروضات پھر پیش کریں۔ اور میں بھی ایک دفعہ پھر گذارش کرتا ہوں کہ براہ مہربانی میری تجویز کو منظور فرما کر اس معاملہ میں مسلمان علماء اور مسلمان قانون داں اصحاب سے مشورہ فرمالیں۔ اس میں تو شک نہیں کہ اگر اس شکایت کے خلاف فیصلہ صادر ہوا تو مجھے یقین ہے کہ راستی پر مبنی ہے تو اس معاملہ پر رائے ظاہر کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ میری تو خواہش یہی ہے کہ اس معاملہ پر مجھے کوئی جرح قدح کرنا ہی نہ پڑے اور خود یور آنر ہی نظر ثانی کے بعد اس معاملہ میں ہمارے محسوسات کا پاس رکھنا ممکن تصور فرمالیں[1]

آپ کا صادق

محمد علی

دہلی ۳/ جون ۱۹۱۳ء

---

[1] افسوس کہ گورنر پر محمد علی کی ان سچی باتوں اور معقول رویّے کا کچھ اثر نہیں ہوا اور وہ عظیم حادثہ پیش آ ہی گیا جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس سلسلے میں ہمدرد، کامریڈ، اور الہلال نے زبردست خدمات انجام دیں۔ محمد علی کے داخلہ کانپور پر پابندی لگا دی گئی۔ علامہ شبلی کی نظم حادثہ کانپور پر اسلامی جوش وجذبات اور شاعرانہ کمال کا ایک شاہکار ہے۔ مسٹر مظہرالحق بیرسٹرایٹ لا (پٹنہ) نے اس مقدمہ کی پیروی میں بڑے ایثار سے کام لیا اور کل ہند شہرت اور مسلمانوں میں مقبولیت حاصل کی۔

مولانا حسرت موہانی

(۶)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چھنڈواڑہ

۲۶/ اپریل ۱۹۱۷ء

برادر واجب الاحترام!

السلام علیکم، ۸ / اپریل کے محبت نامہ کا جواب آج دیتا ہوں اور محجوب ہوں کہ اس تاخیر کا باعث سوائے اس کے کچھ بیان نہیں کرسکتا کہ اس عرصہ میں برابر غم و غصہ کا شکار رہا۔ میں جو بڑے بڑے معاملات میں آج کے عارضی فیصلوں کا قائل نہیں اور ان تمام ہنگاموں کو "تبارِ خس سے زیادہ نہیں سمجھتا"، ۸/ اپریل کے فیصلہ پر کیا "بندۂ دام فریب" ہوں گا۔ مگر دوستوں کی موت اس زمانہ میں بھی جب کہ موت کا بازار گرم ہے دو چار آنسو بطور خراج کے وصول کر ہی لیتی ہے۔ اور ۸/ اپریل کو میرے چند عزیز ترین دوست نذر اجل ہوگئے اس لئے میرا غم و غصہ بے جا نہیں۔ مگر موت جسمانی نہیں، اس لیے کہ میں تو اس کا قائل ہی نہیں ہوں۔ بہت سے مُردوں کو جن کی ہڈیوں تک کا بھی پتا نہیں چلتا "علی احیاء" میں شامل کرتا ہوں مگر ان جیتی جاگتی کٹھ پتلیوں کو جو قومی اسٹیج پر نچائی جاتی ہیں اور نچائی جارہی ہیں مُردوں سے بدتر سمجھتا ہوں کیونکہ موت ان کے جسموں کو نہیں آئی، بلکہ ان کی روحوں کو۔ تم تو پہلے ہی کہہ چکے ہو کہ ؎

محروم ہوں، مجبور ہوں، بے تاب و تواں ہوں
مخصوص ترے غم کا مزا میرے لیے ہے[1]

---

[1] اسی زمین میں مولانا محمد علی کی غزل بھی ہے اور خوب ہے۔ اس کا مطلع ہے ؎

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے — پر غیب سے سامان بقا میرے لیے ہے

اور اس غزل کا یہ شعر تو گویا اردو ادب میں ضرب المثل بن گیا ہے

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے — یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

پھر جس چیز کا صحیح معنوں میں اجارہ تم کو اس دربار سے مل گیا ہو اس میں شرکت کے دعویٰ کی مجھ سے جرأت نہیں ہو سکتی۔ تاہم یہ بھی سچ ہے کہ میں بھی کسی قدر محروم و مجبور رہوں۔ اس پر بھی میں نے انصاری کو راہِ راست پر استقامت کی۔ جس طرح مجھ سے ہو سکا، ترغیب دی اور امید کی کہ میری اس دعا کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہو گا کہ "ربنا لاتزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا" میرا خط (جو ان کو بھیجا گیا تھا) کوئی معمولی تحریر نہ تھی۔ اس میں میرے فگار دل کے متعدد ٹکڑے منسلک تھے۔ مگر برادرم! آخرش یہی معلوم ہوا کہ جس دنیا میں ہم لوگ رہتے ہیں وہ اس دنیا سے بہت مختلف ہے جہاں ہمارے عزیز بس رہے ہیں۔ ہمارے تمام خیالات، تمام اندازے، تمام تخمینے فضول اور غیر متعلق ہیں۔ میں نے غالب کے ایک مصرع پر جو غزل لکھی تھی اس میں ایک شعر تھا ؎

نقوے کے بعد خوف کہاں حزن پھر کہاں،
عالم ہی اک جدا ہے وہ رنج و محن کہاں[1]

تقوے کا دعویٰ کرتے بھی ڈر لگتا ہے اور یہ سب جھوٹا فخر ہو گا اگر میں کہوں کہ میں متقی اور خدا ترس ہوں۔ مگر باوجود بار بار انتباہ اور کم از کم چھوٹی موٹی تکلیفوں کے اب تک اس وعدۂ الٰہی کو سچا جان رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں کہ وہ پورا بھی ہو رہا ہے کہ "سنلقی فی قلوب الذین کفروا الرعب" اس لیے باوجود فاسق و فاجر اور بندۂ حرص و ہوا ہونے کے اپنے کو اپنے دیرینہ احباب کی دنیا سے ایک الگ دنیا میں پاتا ہوں اور گو اس دنیا کو اس پرانی دنیا سے بدرجہا بہتر جگہ پاتا ہوں اور خوش ہوں کہ اس کی سرحد میں داخل ہو رہا ہوں۔ تاہم پرانے تعلقات دامن گیر ہوتے ہیں اور گو خود پیچھا چھڑا لیتا ہوں۔ تاہم دامن کے ٹکڑے اس خارستان گلستان منظر میں ہلکے رہ جاتے ہیں جن کے لئے آنسوؤں کا ایک چھوٹا موٹا قافلہ رواں ہو جاتا ہے۔ افسوس کہ احرار[2] سے

---

[1] دیوان جوہر میں اسی بحر اور اسی قافیہ و ردیف میں ایک غزل ہے لیکن اس میں یہ شعر نہیں ہے
[2] یہاں پڑھا نہیں گیا۔

زیادہ ہمّت والے نہ نکلے۔ اب انہی کی نہیں بلکہ خود حرّیت کی جگ ہنسائی ہو رہی ہے۔ مگر اس کا زیادہ رنج نہیں۔ رنج پرانے دوستوں کی رفاقت چھوٹنے کا ہے۔ غالبؔ نے سچ لکھا تھا کہ ؎

دھمکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

مگر اچھّا ہوا یہ جھوٹا سہارا بھی گیا۔ اب ایک سہارا باقی ہے اور وہ ہمیشہ کافی تھا اور اب بھی ہے۔ غالبؔ کی غزل کا ایک شعر پچھلے کئی برسوں سے دل میں کھب چکا ہے ؎

چاک مت کر جیب کو بے فصل گل[1]
کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیئے

اس پر ایک نامکمل غزل قافیہ کو محدود کر کے میں نے بھی لکھی تھی جس کا ایک شعر ہے ؎

ایک ہی در کا بھکاری ہوں مجھے
اک فقط تیرا سہارا چاہیئے[2]

گو لکھنے کو تو لکھ گیا۔ خود اب جا کر کہیں اس کا مفہوم سمجھا ہوں اور پھر سورۂ یوسفؑ پڑھتا ہوں تو اس آیۂ کریمہ کا مطلب اب سمجھ میں آتا ہے جس میں مذکور ہے کہ حضرت یوسفؑ نے فرعون کے جام بردار سے اس کی رہائی کے وقت کہا تھا کہ بھئی ہمارا بھی ذکر اپنے آقا سے کر دینا کہ مفت ظلم ہوتا ہے اور وہ بھول گیا اور اس طرح چند سال اور حضرت یوسفؑ مبتلائے زنداں رہے۔ جب ایسے برگزیدہ پیغمبر کے لیے بھی فرعونوں کی یاد دہانی داخل شرک نہیں تو کم از کم مذموم سمجھی

[1] محمد علی سے تسامح ہوا۔ پہلا مصرع اس طرح ہے۔
چاک مت کر جیب بے ایّام گل

[2] جوہرؔ نے غالبؔ کے اس شعر پر چار شعر کہے تھے۔ جو ان کے دیوان میں موجود ہیں۔ اس غزل کا ایک شعر یہیں جوہرؔ نے نقل کر دیا۔
ایک شعر یہ ہے ؎ ہے دلے فرمودۂ غالبؔ کا پاس
ضبط کا کچھ اور یارا چاہیئے
اس کے بعد غالبؔ کا یہی شعر نقل کیا ہے۔

گئی اور اس وحدہٗ لاشریک کو اس میں بھی استعانت غیر اللہ کا شائبہ معلوم ہوا تو پھر ہمارے تمام تعلقات تو شرک جلی ٹھہرے۔ اقامت صلوٰۃ میرا ایمان اجماع امت پر میرا اعتماد۔ تاہم بعض اوقات اس تنگ و تاریک بت کدہ میں عبادت اپنی نجات کے لئے زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے جہاں ایک وقت میں ایک ہی عبادت کرنے والا اپنے معبود کے حضور میں کھڑا ہو کر اپنی بندگی کا اظہار کر سکتا ہے۔ خوف ہوتا ہے کہ کہیں اپنے مذہب کی وسیع و فراخ مساجد میں نماز کے ساتھی اور خود امام بھی مجھے کفر و شرک کی طرف نہ گھسیٹ لے جائیں اور دوسروں کی اصلاح تو گئی خود اپنی نجات سے مایوس ہونا پڑے۔ سب کچھ ہو ہوا کر اب یہی رہ گیا ہے کہ اپنی جان بچانے کی کوشش کر لوں۔ اور مدرسہ کو چھوڑ کر پھر خانقاہ میں اعتکاف کر لوں۔ بھائی دعا کرو کہ اگر اپنی نجات کے متعلق خوف و ہراس میں کمی ہو تو ہو کم از کم دوسروں کے متعلق یہ بے اعتباری باقی نہ رہے۔ اگر یہی حالت رہی تو کہیں کا نہ رہا۔ البتہ جب تمھارا خیال آتا ہے اور تم سے بھی زیادہ بہن کا رجو نہ صرف تمھارے ناموس کو بلکہ ہم سب کے ناموس کو اس طرح ہمت و جرأت کے ساتھ سنبھالے ہیں اور صامت و ساکت نہیں بلکہ کلمۂ حق کو بآواز دُہل سب کو سنا رہی ہیں تو یہ بے اعتباری دور ہوتی ہے اور جس طرح خدا سے میں مایوس نہیں ہوں اسی طرح اس کے بندوں سے مایوسی بھی قرین کفر معلوم ہوتی ہے مگر یہ لوگ قومی اسٹیج کی کٹھ پتلیاں نہیں ہیں۔ وہی غریب اور کمزور لوگ ہیں جن سے اسلام کی ابتدا ہوئی تھی۔ رہے یہ حضرات تو ان کے متعلق تو بدگمانی بہت پہلے سے تھی۔ چنانچہ میں نے متعدد بار ان "آزادوں" کے مضمون کو غزلوں میں باندھا۔ مثلاً ؎

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے و لے　　　میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد[۱]

---

[۱] دیوان جوہر میں نو اشعار کی ایک غزل ہے۔ اس میں متعلقہ مضمون کا ایک عاشقانہ شعر ہے ؎

غیروں سے لطف، ہم سے الگ، حیف ہے اگر　　　یہ بے حجابیاں بھی ہوں عذر حیا کے بعد

اور اس غزل کا یہ شعر تو واقعی ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے

قتل حسینؓ اصل میں مرگ یزید ہے　　　اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

یا س

ہیں لتنے لاف شوق پہ مرعوب حسن بھی
یہ طائفہ عجیب ہے اک مرد و زن سے دور
ہے بُعد کربلا سے بھی، قربِ یزید بھی
اور چاہتے یہ ہیں کہ نہ ہوں پنجتن سے دور [1]

یا س

دشمنوں سے گر تلطف ہے تو کچھ دوستوں سے بھی مدارا چاہیئے

(حافظ تلطف کو دوستوں کے لئے اور مدارا کو دشمنوں کے لئے لازمی گردانتے تھے ہم دوستوں کے لئے مبادا [2]) یہ سب کچھ لکھ تو دیا ہے اور آج بھی اس طرح لکھ رہا ہوں کہ گویا ہم ہی انبار اللہ اور احبار اللہ ہیں۔ مگر برادرم ان جرت انگیز انقلابوں کو دیکھ کر خوف ہوتا ہے کہ کہیں بڑا بول آگے نہ آئے۔ بنی اسرائیل کا وہ واقعہ یاد آتا ہے جس کا قرآن کریم میں مذکور ہے [3] "خود مسلمانوں نے بعض اوقات اس خیر القرون میں بھی سنت بنی اسرائیل کی تقلید کی تھی۔ چنانچہ منہزمین اُحد سے کہا گیا تھا کہ " ولقد کنتم تمنون الموت من قبل ان تلقوہ فقد رائیتموہ وانتم تنظرون [4] " دعا کرو کہ یہ حال اپنا بھی نہ ہو

---

[1] دیوان میں اکیس [21] اشعار کی غزل موجود ہے اس میں دوسرے شعر کے مصرع ثانی میں ایک لفظی تقدم و تاخر ہے ۔ اور چاہتے ہیں یہ کہ نہ ہوں پنجتن سے دور

میرا خیال ہے کہ اس مصرع میں زیادہ زور ہے۔ یہ غزل چھنڈواڑہ (سی پی) میں نظر بندی کے زمانے کی یادگار ہے۔ اس غزل کا ایک شعر ہے جس میں بہ تصرف ادنیٰ غالب کے مصرع کی تضمین کی ہے۔

یوں بچ سکو مواخذۂ حشر سے تو ہاں مارو دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور

[2] جملہ پڑھا نہیں گیا۔

[3] یہاں پر " ان تولوا الا قلیلاً منہم " الفاظ درج تھے۔ لیکن ان الفاظ میں چونکہ قرآن کی کوئی آیت نہیں اس لیے اسے حذف کر دیا۔

[4] سورۂ آل عمران کی آیت ۱۴۳ جس کا ترجمہ یہ ہے " اور دیکھو) یہ واقعہ ہے کہ جب تک موت کا سامنا نہیں ہوا تھا تم راہِ حق میں مرنے کی آرزوئیں کیا کرتے تھے (اور سمجھتے کہ مدینے سے باہر نکل کر دشمنوں کا مقابلہ کریں، لیکن پھر ایسا ہوا کہ موت تمہاری آنکھوں کے سامنے آگئی اور تم کھڑے تک رہے تھے "!

بلکہ آخر تک ایمان اور عمل صالح پر قائم رہیں۔ تمھاری دعا ضرور مقبول ہوگی اس لیے کہ اوّل تو آلِ رسول، پھر تقلید سنتِ یوسفی سے مشرف ہو چکے ہو۔ اب چونکہ تم نے مجھے بھی اپنے زمرہ میں جو ابرار اور اخیار کا ہے شامل کر لیا ہے، اور خود لکھ چکے ہو کہ

ع خوش اسی حال میں جو ہر بھی ہے آزاد بھی ہے[1]

خیر یہ تو ہوا۔ بہن نے لکھا تھا کہ تم پیشگوئی کرتے ہو کہ جمہور کی خواہش کے خلاف حامیانِ استبداد ایک ذلیل یونیورسٹی قائم کرنے میں ہرگز کامیاب نہ ہوں گے۔ ارے بھائی اس میں پیش گوئی ہی کیا ہے۔ تم تو ان کے متبع ہو جو خوابوں کی صحیح تعبیریں بیان فرمایا کرتے تھے اور اس طرح مجلس سے نکل کر تخت تک پہنچ گئے[2] میں کہ اس مقام سے بہت دور ہوں۔ یہ تو میں بھی جانتا تھا اور سال گزشتہ ہی میں سب کو جتلا چکا تھا کہ عزیزان من صدمہ یونیورسٹی کا نہیں ہے بلکہ قوم کی سبکی اور تمھاری خواری و خرابی کا، اور رہی یونیورسٹی تو سن لو کہ اسے ہم بنائیں گے ہم[3] نہ تمھارے قوم فروش اور کالج فروش کیونکہ

---

[1] آزاد سے مراد مولانا ابوالکلام آزاد ہیں جو اس زمانہ میں رانچی (بہار) میں نظر بند تھے۔

[2] اشارہ حضرت یوسف علیہ السلام کی سیرت مقدسہ کی طرف ہے۔ حضرت یوسفؑ نے اللہ کی معصیت کے مقابلے میں قید و بند کی زندگی کو اختیار کر لیا تھا اور عزیز مصر کے ایک خواب کی تعبیر بتانے کے بعد مصر کے نظم و فرمانروائی کے منصب تک جا پہنچے تھے۔ حسرت مرحوم نے بھی ملک کے ظالمانہ اقتدار کو تسلیم کرنے کی معصیت کے مقابلے میں قید و بند کی زندگی قبول کر کے گویا سنت یوسفی کی اتباع کی تھی۔

[3] ۱۹۱۲ء میں جب یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کا اجلاس لکھنؤ میں ہوا تو حکومت کی شرائط پر یونیورسٹی قبول کرنے پر سخت اختلاف کیا لیکن پھر راجہ صاحب محمود آباد اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی رائے سے متفق ہو گئے تھے اب چند سال کے بعد وہ مخلصین جن کی خاطر حکومت کی شرائط پر یونیورسٹی کا قیام منظور کیا تھا۔ قوم فروش اور کالج فروش ٹھہرے۔ اس سے مولانا محمد علی کے عدم تدبر یا ان کی محض جذباتیت پر استدلال نہ کرنا چاہیے حالات خود بخود اس مقام پر لے گئے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے مولانا محمد علی کے پہلے اختلاف اور پھر احباب کے اصرار سے سپر انداختگی پر "شرشام کی نعت شب اور تشنہ نیم شبی کا صبح خمار" کے عنوانات سے ایک دلچسپ سلسلہ مقالات الہلال (کلکتہ) کی ۵ / ۲۱ اگست ۱۹۱۲ء سے لے کر ۱۲ مارچ ۱۹۱۳ء تک تقریباً چھ اشاعتوں میں لکھا تھا مولانا محمد علی نے اس کا جواب نہایت تیز و تند دیا۔ اگر مولانا آزاد کی نظر سے ان کا یہ خط گزرتا تو وہ غالب کا یہ شعر ضرور پڑھتے

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

ہم سے کسی نے حتمی وعدہ کر لیا ہے اور وہ وعدہ کا سب سے پکا بھی ہے کہ ۔
" ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنون"[1] اگر خوف ہے تو اس شرط کا کہ " ان کنتم مومنون" سو خدا سے دعا ہے کہ ہم کو ایمان پر قائم رکھے اور ان بزرگوں کی تقلید کی توفیق عطا فرمائے ۔ جن کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ ۔
" فما وھنوا لما اصابھم فی سبیل اللہ وما ضعفوا وما استکانوا واللہ یحب الصٰبرین[2]" اگر ہم ایمان پر قائم رہے تو پھر سنت اللہ میں تو تبدیلی ہو ہی نہیں سکتی ۔ ہمارا انعام کہیں نہیں گیا ہے ۔ وہاں تو ملے ہی گا ، مگر یہاں بھی مل جائے گا کیونکہ وہ فرماتا ہے کہ :۔

" فاٰتھم اللہ ثواب الدنیا وحسن ثواب الاٰخرہ واللہ یحب المحسنین[3] "

---

[1] سورۂ آل عمران کی آیت ۱۳۹ جس کا ترجمہ یہ ہے ۔
" اور دیکھو نہ تو تم ہمت ہارو ، نہ غمگین ہو ، تم ہی سب سے سربلند ہو ، بشرطیکہ تم سچے مومن ہو ۔"

[2] سورۂ آل عمران کی آیت ۱۴۶ کا آخری حصہ ۔ ابتدائی حصہ یہ ہے " وکاین من نبی قتل معہ ربیون کثیر ۔ فما وھنوا ..... پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے ۔
" اور دیکھو کتنے ہی نبی ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے باخدا لوگوں نے (راہ حق میں) جنگ کی ۔ لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان سختیوں کی وجہ سے جو انھیں خدا کی راہ میں پیش آئی ہوں ، بے ہمت ہو گئے ہوں اور نہ ایسا ہوا کہ کمزور پڑ گئے ہوں یا (ان کی عزت نفس نے یہ بات گوارا کر لی ہو کہ ظالموں کے سامنے ، عجز و بیچارگی کا اظہار کریں (بے ہمتی ، کمزوری اور حریف کے سامنے اعتراف عجز ! وہ باتیں ہیں جن سے باخدا آدمی کا دل کبھی آشنا نہیں ہو سکتا) اور اللہ ان ہی لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو مشکلوں اور مصیبتوں میں ثابت قدم رہتے ہیں ۔"

[3] سورۂ آل عمران کی آیت ۱۴۸ جس کا ترجمہ یہ ہے ۔
" (جب ان کے ایمان وعمل کا یہ حال تھا) ، تو خدا نے بھی انھیں دونوں جہان میں اجر عطا فرمایا ۔ دنیا کا بھی ثواب دیا (کہ فتح وکامرانی ان کے حصے میں آئی) ، اور آخرت کا بھی بہتر ثواب دیا (کہ نعیم ابدی کے مستحق ہوئے) ، اور اللہ تو ان ہی لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو نیک کردار ہوتے ہیں ۔"

اس پر میں نے لکھا ہے کہ ؎

انعام کا عقبیٰ کے تو کیا پوچھنا، لیکن
دنیا میں بھی ایماں کا صلہ میرے لیے ہے

اچھا اب رخصت ہوتا ہوں۔ تمھارے دونوں دیوان پڑھ چکا اور نہایت غور سے پڑھے اور بار بار پڑھے۔ ارتقائے سخن ظاہر ہے۔ اب اگر یہ لکھتا ہوں کہ

ع اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

تو اس کے صریح معنی یہ ہوئے کہ جو سختیاں الہ آباد، جھانسی، پرتاب گڈھ اور فیض آباد میں جھیلنا پڑیں ان سے زیادہ کا مستدعی ہوں۔ مگر یہ بھی ہو تو جانتا ہوں کہ تم زیادہ کے بھی متحمّل ہوگے۔ اس لیے کہ وہ خود کسی نفس پر اس کی سکت سے زیادہ تکلیف کا بوجھ نہیں ڈالتا اور

ع جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا ملتا ہے

غم واندوہ کے لیے لکھا گیا ہے۔ تم میری غزلیں منگولتے ہو۔ اچھا بھیج دوں گا۔ مگر بھائی تم شاعر تھے، میں شاعر نہ تھا۔ البتہ عنایت ایزدی نے تمھیں تین دیوانوں والا بنا دیا تو اس قسم کی عنایت نے مجھ سے بھی تین چار غزلیں لکھوا دیں۔ پہلے بھی تُک بندی کر لیتا تھا مگر کاغذ کے پھولوں میں خوشبو نہیں ہوتی۔ اب کچھ بو باس آنے لگی ہے، سو بقول تمھارے ع

ترے غم کو نہ دے کیونکر دعا دل

اس وقت صرف نذر بندی کی پہلی غزل لکھے بھیجتا ہوں۔ بہن[1] کو کل خط لکھوں گا۔ تم میری افسردگی کا ذکر کر کے میری طرف سے معافی مانگ لینا ورنہ وہ ناراض ہی رہیں گی کہ جواب کیوں نہ دیا۔

تمھارا مرید باعقیدت
محمد علی

---

[1] بہن سے مراد نشاط النسا بیگم حسرت ہیں۔

رنگا آئر

(۷)

میرے پیارے رنگا آئر

مہاتما و نیز ہم لوگوں پر ایک مخصوص طریقہ سے یہ اعتراض قائم کرکے کہ ہم لوگوں نے جیل خانہ سے اپنی گردن بچائی۔ آخر کار تم خود قید خانہ پہنچ گئے جس کی مجھے تم سے کامل امید تھی اور تم سے ہماری قدیم صحبت کا تقاضا یہ تھا کہ جب میں الہ آباد آیا تو تم کو نہ پاکر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہماری کوئی چیز کھو گئی ہے جب میں الہ آباد آتا تھا تو تمہارے پیارے بدصورت چہرہ کا بوسہ ضرور لیتا تھا باوجودیکہ اس چہرہ پر بے شمار جھرّیاں پڑی ہوئی تھیں۔ لیکن میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم لوگ تمہارے اس چہرہ کی جدائی کو زیادہ دنوں تک محسوس نہ کریں گے اور یہ اس وجہ سے نہیں کہ اس کی یاد کا نقش دھندلا ہو جائے گا۔

میرے پیارے رنگیلے۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ ہم لوگ باوجود اس نام نہاد معافی نامہ کے تم سے زیادہ دنوں تک جدا رہیں گے۔ میں سوچتا تھا کہ جب دوبارہ تم سے ملوں گا تو تمہارے جھرّیاں پڑے ہوئے چہرہ کو اس جرم کی سزا میں کاٹ کھاؤں گا کہ تم نے انڈیپنڈنٹ کے نام رنگا آئر کے خط میں ہم لوگوں کی بزدلی پر اس بال برابر شبہ کی بھی گنجائش کیوں رکھی۔ لیکن چونکہ تم موجود نہیں ہو اور ہمارا تمہارا سنگم آگرہ جیل ہی کے اندر ممکن ہے بشرطیکہ ہم کو سزائے قید دینے کے بعد حکامِ بالا دست ہم تینوں "بدمعاشوں" کو تاج کے اس قدر قریب رکھنا پسند کریں۔ اس لیے میں تم سے اس خط کے ذریعہ سے جو کبھی پوسٹ نہ ہوگا یہ سوال کرتا ہوں کہ کیا اب بھی تمہارا خیال ہے کہ دو بڑے بڑے اور موٹے موٹے جسموں کی ایسی نشانیاں بھی موجود ہیں۔ جیسے کہ ہم اور شوکت علی جو اس بات کی کوشش میں سرگرم ہیں کہ معافی کے تنگ دروازہ سے بھاگ کر رہائی حاصل کرلیں اور وہ دروازہ

ایسلب ہے جس سے تم نے خود اپنی نجات پسند نہ کی۔

شوکت علی نے ہر سوال کرنے والے کو قابل اطمینان جواب دے کر یہ یقین کرا دیا ہے کہ جنگ کے موقع پر وہ میدان میں کھڑے ہو کر مردانہ وار لڑیں گے اور ہرگز پشت نہ پھیریں گے۔ کیونکہ اُن کا جواب یہ ہوتا ہے " آہ آپ دیکھتے ہیں کہ میں اس قدر موٹا ہوں کہ بھاگ نہیں سکتا"۔ اگر وہ اس قدر موٹے ہیں کہ بھاگ نہیں سکتے تو اسی فربہی کی وجہ سے وہ بچ بھی نہیں سکتے۔ باقی رہا میں تو کیا تم یہ خیال کر سکتے ہو کہ علی برادران میں مفارقت ممکن ہے۔ اور جن کو خدا نے ملا دیا ہے۔ ان کو گورنمنٹ جدا نہیں کر سکتی۔ ہم لوگ ایک ساتھ نظر بند کیے گئے۔ اور ہم دونوں کا جرم یہ تھا کہ ہم معصوم تھے۔ ہم بیتول کے جیل خانہ میں بھی ایک ساتھ منتقل کیے گئے اور اس کے بعد ایک ساتھ ہی رہا کیے گئے۔ جب شوکت جیل خانہ چلیں گے میں بھی جاؤں گا اور جس سے شوکت اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے میں بھی اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا۔

مصیبتوں نے ہم دونوں کو عجیب طرح سے ایک ہی بستر پر ڈال دیا ہے (بہت عزیز کر دیا ہے) اور مادر وطن کی مصیبتوں نے اسی بستر پر ایک مہاتما اور دو مہا شریر کو جمع کر دیا ہے۔ ڈیلی ٹیلیگراف لکھتا ہے کہ یہ ایک خلاف فطرت و خلاف اصول اتحاد ہے" اور مسٹر ہر سیویل لینڈن نے پرنٹنگ ہاؤس اسکوائر اور مختلف گورنمنٹ ہاؤس کے بہادر سورما سر ویلنٹائن چرول کی آواز کو دُہراتے ہوئے کہا ہے کہ کچھ لوگوں کے لیے یہ ایک غیر مفید اور مجبوری کا اتحاد ہے۔

خیر میرے پیارے رنگیلے جب سنیاسی اور گنہگار اتحاد عمل کرتے ہوں تو بہت حیرت انگیز واقعات کا ظہور ہونا چاہیے۔ جب مہاتما کے کہنے سے ہم لوگوں نے اپنے عقیدہ کو صاف کرنا چاہا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ گورنمنٹ اس سے فائدہ نہ اٹھاتی اور نصف درجن ممالک میں ہماری بزدلی کی تشہیر نہ کر دیتی اس طرح یہ سچ ہے کہ عقائد ہم سب لوگوں کو بزدل بنا دیتے ہیں مگر گنہگاروں کو ایسا ہی لگان سنیاسیوں کو ادا کرنا پڑتا ہے اور چونکہ تم نے حال ہی میں

اہنسا سے بہت محبت بڑھالی ہے اس لیے تم ہمارے بیان کی مخالفت نہیں کرسکتے تھے جس میں اسی اہنسا کا یقین دلایا گیا تھا۔ اگر اس گورنمنٹ نے جو ہمارے اوپر اس قدر مہربان تھی تم کو قیدخانہ میں بند کردیا تو نہایت اچھا کیا۔ اس لیے چکی پیسے جاؤ حتیٰ کہ نہ غلہ ہی باقی رہ جائے اور نہ چکی کا پتھر۔ اور اگر اس چکی پیسنے میں تم کو بہت ہی زیادہ لطف آئے تو ان بزدلوں کو سورما و بہادر خیال کرو کیونکہ انہیں کے معافی نامہ نے تمھاری اور تمھارے ساتھیوں کی آنکھیں کھول دیں اور تم جال میں پھنسنے سے بچ گئے۔

لیکن شاید تمھارے یہ نجات دہندگان تم سے عنقریب آکر ملیں گے اور تم کو بذات خود شکریہ کا موقع دیں گے۔ اگرچہ ابھی تک یہ جیل خانہ سے ذرا بھڑکتے ہیں اور ایک دفعہ اور اس سے بچنا چاہتے ہیں لیکن معافی کے تنگ راستہ سے اپنا بچاؤ نہیں چاہتے۔ بلکہ موت کے وسیع دروازہ سے یا تو دسمبر کے قبل یا اس دن جب کہ آزادی کا آفتاب طلوع ہوگا اور جمہوریۂ ہند کا صدر آگرہ کے قیدخانہ کا دروازہ کھول دے گا تو ہم کو پھر رنگا آئر کے پیارے بدصورت چہرہ کا درشن ملے گا اور ہم پھر اس جھرّیاں پڑے چہرہ کا بوسہ لیں گے جس کی جھرّیاں اس درمیان میں اور بھی زیادہ تیز ہوگئی ہوں گی۔

تمھارا

جیل خانہ کی چڑیا جو جیل خانہ کے باہر ہے

محمد علی

ریمزے میکڈانلڈ

(۸)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہائیڈ پارک ہوٹل۔ لندن
یکم جنوری ۱۹۳۱ء

جناب والا!

جیسا کہ میں نے کانفرنس کے کھلے اجلاس کی افتتاحی تقریر میں کہا تھا کہ بہت بیمار ہوں پھر بھی اس کانفرنس کی شرکت کے لیے آگیا ہوں، اس سلسلہ میں مجھ کو جو کام کرنا پڑا یا مجھ پر جو ترددات جاری رہے، تو بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ بس ان سے ہلاک ہو رہا ہوں، جیسا کہ میرے ڈاکٹر بتائیں گے، ۱۹ر دسمبر کو میں بیہوش ہوگیا اور یہ بیہوشی چوبیس ۲۴ گھنٹہ تک رہی، میری نبض کی رفتار ۱۴۰ ہوگئی گو حرارت ۹۷ ہی رہی بلکہ ۹۵ ہوگئی اور میرا تنفس (RESPIRATION) ۳۰ تک پہنچ گیا: لیکن کام کرنے کی خواہش ایسی غالب رہی کہ میں نے لارڈ چانسلر کو اس شام کو آٹھ بجے ناشتہ پر مدعو کیا کیونکہ میں یہ سمجھتا رہا کہ ابھی یہ صبح ہے، لارڈ چانسلر نے کرم کیا کہ وہ دوسرے دن ملنے آئے، میرے بھائی نے مجھ کو صرف دس منٹ تک ملاقات کرنے کی اجازت دی، اس مختصر مدت میں بھی اپنے خیالات کا اظہار مشکل سے کرسکا۔

میں چاہتا تھا کہ اقلیت کے مسئلہ کے متعلق میرے جو خیالات ہیں، وہ ہز مجسٹی کی حکومت، برطانوی پارلیمنٹ کے نمائندوں اور ہندوستانی وفد کے ارکان کے سامنے ضرور رکھ دیے جائیں (گو ہندوستانی وفد میرے ان خیالات سے کسی حد تک واقف بھی ہے)، اسی لیے میں نے آپ سے اجازت مانگی تھی کہ میرے دوست چھنڈواڑہ کی شہرت والے مسٹر جیوفرے کوربٹ کو میرے پاس بھیج دیا جائے، تاکہ میں جب جو کچھ لکھواؤں وہ موجود رہیں۔

سب سے پہلے یہ بات واضح کردوں کہ ہندو مسلم مسئلہ کو اقلیت کا مسئلہ کہنا صحیح نہیں، ہندوستان میں اقلیتیں ضرور ہیں، ان کے لیے یہ تحفظ ضروری ہے کہ وہ محسوس کریں کہ ہندوستان میں آیندہ جو بھی حکومت ہوگی وہ ایک یا دو فرقے کی حکومت نہ ہوگی، بلکہ تمام ہندوستانیوں کی ہوگی جس میں ذات پات کی تفریق نہ ہوگی[1] ہندوستان میں ذمہ دارانہ حکومت میں جو رکاوٹ پیدا ہورہی ہے وہ ان اقلیتوں کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ ان اختلافات کے سبب ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان حائل ہیں، یہ حقیقت اس قدر واضح ہے کہ اس کی تاریخ بتانے کی ضرورت نہیں، لیکن میں دو۲ تین۳ باتوں پر زور دوں گا، جن سے یہ ظاہر ہوجائے گا کہ ہندو مسلم کا مسئلہ اقلیتوں کے سوال سے کچھ الگ ہے، مسلمانوں نے آٹھویں صدی سے انیسویں صدی عیسوی تک ہندوستان کے کسی نہ کسی علاقہ پر حکومت کی کسی اور فرقہ کو یہ امتیاز حاصل نہیں ہوا، سکھوں کی ایک نسل نے صرف پنجاب پر حکومت کی جو محض ایک اتفاقی واقعہ تھا، یہ کہہ کر میں سکھوں کی بہادری پر کوئی حرف گیری نہیں کرنا چاہتا ہوں، میں ان کے پنتھ کی عزت کرتا ہوں مرہٹوں کے جھتے کی بھی حکومت رہی، مگر ان کا مقابلہ مسلمانوں کی حکومت سے نہیں کیا جاسکتا ہے۔ انگریزوں نے اپنی فتح یا تدبیر سے مسلمانوں کے اقتدار کو ان سے چھینا پھر بھی کچھ ہندوستانی ریاستوں کی حکومت باقی رہی جن کے علاقے عرصۂ دراز سے ایسے عظیم اور ممتاز ہندوؤں کے تسلط میں رہے جو اپنی اصل سورج اور چاند سے ملاتے ہیں۔ ان ہندو ریاستوں کے تعلقات مسلمان حکمرانوں کے ساتھ کیا رہے، ان کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کیا یا نہیں اس سے بحث نہیں، لیکن وہ مسلمانوں کی حکومت سے وفاداری کا اظہار کرتے ہوئے بڑی حد تک آزاد رہے، ان کی یہ آزادی اس وقت باقی رہی، جب برطانیہ نے مسلمانوں کی حکومت کو ختم کیا اور دوسری ریاستیں

---

[1] ان جملوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مولانا محمد علی کے ذہن میں آزاد ہندوستان کی حکومت کا نقشہ کیا تھا

مغل امپایر کے خاتمہ کے بعد بنیں جن کو برطانوی حکومت نے تسلیم کیا، حیدرآباد جیسی ریاست تو ایسٹ انڈیا کمپنی سے عظیم تر تھی، لیکن وہ برطانوی حکومت کی وفادار حلیف ہوگئی، اور دوسری ریاستیں چھوٹی چھوٹی تھیں، میں صرف یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمان صحیح یا غلط طریقے پر آٹھویں صدی سے انیسویں صدی کے وسط تک کسی نہ کسی شکل میں ہندوستان کے کچھ حصے پر حکومت کرتے رہے اور یہ امتیاز کسی اور فرقہ کو حاصل نہیں رہا۔

اس کا اہم نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی حکومت کے سلسلہ میں ایک خاص قسم کے احساسات پیدا ہوئے۔ اسی پر ہم کو غور کرنا ہے۔ ہندوستان میں شاید ہی کوئی ایسا فرقہ ہے، جو ان پرانے مسلمان حکمرانوں کے خلاف حقیقی یا خیالی شکایت نہیں رکھتا ہو، انسانی فطرت کے تقاضے کے مطابق یہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج بھی ہندوؤں بلکہ سکھوں، مرہٹوں اور راجپوتوں میں مسلمانوں کے خلاف منتقمانہ جذبات موجود ہیں، ان جذبات کو سامنے رکھتے ہوئے ہم کو مستقبل کے لیے ایک ایسا دستور بنانا ہے، جس کے مطابق ایسی عمدہ حکومت قائم ہو کہ اس کے ماتحت تمام لوگ اپنے کو محفوظ، آزاد اور برابر محسوس کریں۔

دوسری چیز قابل غور یہ ہے کہ مسلمان اس لحاظ سے ایک اقلیت نہیں ہیں جس کی رو سے گزشتہ جنگ عظیم کے بعد یورپ کی اقلیتیں وجود میں آئیں، لیگ آف نیشنز نے اقلیتوں کے لیے جو قاعدے بنائے ہیں، ان ہی پر ہمارے ہندوستانی مفکرین اور پروفیسر عمل کرتے ہیں، ہندوستان جینوا سے رہنمائی چاہتا ہے، حالانکہ درحقیقت جینوا کی رہنمائی خود ہندوستان بہتر طریقہ سے کر سکتا ہے۔ ایک فرقہ جس کی تعداد سات کروڑ ہو، وہ جینوا کی اقلیتوں کی طرح اقلیت نہیں قرار نہیں دی جا سکتی ہے، اور یہ بھی واضح رہے کہ اس فرقہ کی تعداد دنیا میں چالیس کروڑ ہے، جس کے حوصلے یہ ہیں کہ انسانیت کو اپنے خیالات اور مطمح نظر کے مطابق بنا کر ایک مثالی اخوت کا درس دے ایسے لوگوں کو اقلیت قرار دینا ایک مضحکہ خیز بات ہے، ان دو باتوں کو سامنے

رکھ کر ہم کو مسئلہ کا حل نکالنا ہے، گول میز کانفرنس کے ایک ہندو مہاسبھائی رکن نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ وزیراعظم دونوں فرقوں کے مسئلہ میں ثالث بن جائیں وزیراعظم کے لیے یہ اچھی بات تھی، لیکن اگر وہ قبول کرتے تو ان کی حیثیت میں نزاکت پیدا ہو جاتی، اسی لیے انہوں نے شکریے کے ساتھ اس کو قبول کرنے سے انکار کیا، مجھ کو یقین ہے کہ انھوں نے اس پیش کش کا جو مقصد تھا اس کا اندازہ کیا ہو گا، ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ یہ تجویز بھی کی گئی کہ یہ مسئلہ لیگ آف نیشنز میں پیش کیا جائے، اس کے یہ معنی ہیں کہ ہندوستان کا گندہ کپڑا پوری دنیا کے سامنے دھویا جاتا، ہم کو دکھ ہے کہ ہندوستانی گول میز کانفرنس کو ہندوستانی فرقہ واریت کا ایک دھوبی تلاؤ بنا دیا گیا ہے، یہ مسئلہ تو ہندوستان ہی میں طے ہو جانا چاہیے تھا، ہم نے دس سال تک گاندھی جی کے ساتھ گھل مل کر کام کیا ہے، ہم نے ان پر زور دیا کہ یہ مسئلہ کسی نہ کسی طرح طے ہو جائے۔ لیکن ان کو ہندوؤں میں اپنی مقبولیت کا خیال رہا اور پنڈت موتی لال نہرو کی خاطر ملحوظ رہی جو افسوس ہے کہ اس وقت یہاں موجود نہیں ہیں، سر تیج بہادر سپرو نے ہندو مسلم کے مسئلہ کو طے کرانے کی پوری کوشش اس وقت کی، جب ۱۹۲۶ء میں کانگریس ہماری درخواست پر اس کے طے کرنے میں ناکام رہی، سر اے پی پٹرو بھی اس کو حل کرنے کے خواہاں رہے، ہندو مہاسبھا نے شروع میں تو لبرل ہندوؤں اور مسلمانوں کی خواہشوں کا ساتھ دیا، لیکن جلسوں کو برابر ملتوی کر کے بمبئی کی کانفرنس میں حصہ لینے سے انکار کیا، ڈاکٹر مونجے نے تو صاف طور سے کہہ دیا کہ گول میز کانفرنس سے پہلے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جا سکتا ہے، کانگریس نے ہندو مہاسبھا کی تقلید کی، اور وہ تو گول میز کانفرنس میں شرکت سے بھی انکار کرتی رہی، جب کہ ہندو مسلمان کا سمجھوتہ ایک ہندوستانی دستور بنانے کے سلسلہ میں ناگزیر ہو گیا تھا، ہندو مہاسبھا کے تین اراکین تو اس کانفرنس میں شرکت کے لیے آ گئے ہیں، لیکن مسلمان اور ہندو لبرل اراکین کی کوششوں کے باوجود انھوں نے اب تک یہ سمجھوتہ ہونے نہیں دیا، میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ انھوں نے ہندوؤں

مسلمانوں اور وزیراعظم سے ملاقات کرکے اس مصالحانہ گفتگو میں کتنا وقت ٹالا، وزیراعظم خود اس کے متعلق فیصلہ کرسکتے ہیں لیکن اس کے لیے جب ایک کمیٹی بن گئی ہے، تو اب یہ ضروری ہوگیا ہے کہ سمجھوتہ کی باتوں کو اچھی طرح واضح کردیا جائے۔

میں پہلے نہایت ادب کے ساتھ اور دوستانہ طور پر وزیراعظم کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ محض پنجاب اور بنگال کا مسئلہ نہیں ہے، جیساکہ وہ سوچتے ہیں یا ۱۱۰ کے عدد کو ۱۰۰ بنانے کا بھی مسئلہ نہیں، جیساکہ انھوں نے اپنی مصالحانہ تقریر میں بیان کیا ہے، سوال یہ ہے جیساکہ میں گول میز کانفرنس کے کھلے اجلاس کی تقریر میں کہہ چکا ہوں کہ ہندوستان کی تاریخ میں پہلی دفعہ ہندوستان کی اکثریت کی حکومت قائم کی جانے والی ہے، اور یہ ان کی طرف سے قائم ہوگی جو ہندوؤں کی قسمت کو ہزاروں سال اپنے ہاتھوں میں رکھ چکے ہیں، وہ یہ نہیں چاہتے کہ ہندوستانیوں کی اکثریت کی حکومت قائم ہو، بلکہ ان کی ہو جو ہندوؤں پر ہزاروں سال تک حکومت کرچکے ہیں، ایک اہم فرق کو واضح کردینا چاہتا ہوں، سر جان سائمن تو اب پیچھے ہو چکے ہیں، لیکن انھوں نے سر ویلینٹائن چیرول کی طرح برہمنی حکومت کی طرف اشارہ کیا تھا، برہمن لوگوں کو کچھ درس دیتے رہے اور ان پر یہ غلط قسم کا خیال چھایا ہوا ہے کہ دوسری دنیا میں لوگوں کو ان ہی کی وجہ سے نجات حاصل ہوگی۔ اس وقت ایک ہی ذات اجارہ دار بن کر ہندوؤں کی قسمت کو بھی اپنے قابو میں رکھنا چاہتی ہے۔ اور یہی ہندوستانی قوم کی اکثریت بنی ہوئی ہے، وہ ڈاکٹر مونجے یا راجہ نریندر ناتھ کی قسم کے لوگ نہیں ہیں، بلکہ وہ بنیے ہیں جو دوسری دنیا میں نجات کا تخیل نہیں رکھتے، اور نہ کسی کو کچھ سکھا سکتے ہیں، میں ہر ہندوستانی سے زیادہ اس کا خواہاں ہو رہا ہوں کہ ان غیرملکیوں سے نجات حاصل ہو، جو دوکانداروں کی ایک قوم بن کر ہماری قسمت کو اپنی مٹھیوں میں رکھے ہوئے ہیں، میرے پاس ہزمجسٹی کی حکومت کا دعوت نامہ آیا تو میں نے وائسرائے کو خط لکھا کہ میں اس ملک کے دوکانداروں کی ذات والوں کا بھی تسلط نہیں چاہوں گا اس وقت

زیادہ تر سیاسی شورشوں کی مالی امداد بمبئی اور گجرات کے بنیے کر رہے ہیں جن کا خود غرضانہ مفاد وابستہ ہے، میں نے ہنس کر یہ کہا تھا کہ ½ یا ¼ کی مطلق پروا نہیں کرتا ہوں لیکن آج آزادی کی جنگ نہیں لڑی جا رہی ہے، بلکہ ¼ کے مقابلے میں ½ کی لڑائی جا رہی ہے، یہ اپنی جگہ پر کتنی ہی صحیح ہو، لیکن اس کو ہندوستان کی آزادی کی لڑائی نہیں کہا جا سکتا ہے۔

ہندو مسلم کا سوال صرف صوبائی نہیں ہے، ہر صوبہ میں ہندو مسلم کے جذبات کم و بیش ایک ہی طرح کے ہیں، تین نسل پہلے ہندوستان پر سے مسلمانوں کا اقتدار جاتا رہا، اور برطانیہ نے اس کو مسلمانوں ہی سے حاصل کیا، کسی حد تک مرہٹوں سے بھی یہ اقتدار لیا گیا، جو دہلی کے محل کے میئر (MAYOR) بنے ہوئے تھے تھوڑا بہت پنجاب کے سکھوں کو بھی اقتدار سے محروم کیا گیا جن کی حوصلہ افزائی خود انگریزوں نے اس لیے کی کہ وہ افغانستان سے برسرپیکار تھے، ہندوستان اس اقتدار کو واپس لینا چاہتا ہے، اس کے لیے مسلمان قربانی کرنے میں پیچھے نہیں ہیں، جیسا کہ ہم لوگ دس سال پہلے اس کا ثبوت دے چکے ہیں، آج بھی کچھ مسلمان کانگریس کے ساتھ ہیں، لیکن ایسے مسلمان صرف آزادی حاصل کرنے کے لیے ساتھ دے رہے ہیں، جو ان کی ایک عادت سی بن گئی ہے، بہت سے مسلمان سول نافرمانی کی تحریک سے اسی طرح الگ رہے، جس طرح کہ وہ دس برس پہلے ترک موالات سے علیحدہ رہے، جب کہ ترکی کا اہم مسئلہ بھی وابستہ تھا ہم اپنی اہمیت میں غلو پیدا کرنا نہیں چاہتے، لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ایسے لوگ جو ہز مجسٹی یا حکومت ہند یا لوکل حکومتوں کی طرف سے نامزد ہو کر اس گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے آئے ہیں مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ رکھنے میں زیادہ اثر انداز نہیں ہوئے ہیں، وہ دس

سال پہلے ہمارے ساتھ بھی نہیں تھے[۱]، ہم کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ ہم ہی لوگ ہیں، جو ہر صوبہ میں عملی طور پر لڑائی لڑتے ہیں اور ہم ہی لوگوں نے مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ کر رکھا ہے، کیونکہ ہم نے ان پر ظاہر کر دیا کہ پہلی تحریک تو خالص قومی تھی، لیکن سول نافرمانی کی موجودہ تحریک کے متعلق مجھ کو افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ گاندھی جی اور پنڈت موتی لال نہرو نے اپنی مقبولیت کی خاطر ہندو مہا سبھا کے آگے سپر ڈال دیا ہے، اور جب میں یہاں آگیا ہوں تو میں اپنی جماعت کا تنہا نمائندہ ہوں میں ہندوستان میں بیمار تھا جب کہ گول میز کانفرنس کے ارکان کا آخری انتخاب ہو رہا تھا، میں نے اپنی نمائندگی سے متعلق وائسرائے سے لمبی خط و کتابت کی اور جب اس کانفرنس سے ہندوستان واپس جاؤں گا تو مجھ سے اور وہاں میرے بھائی (شوکت علی) سے لاکھوں مسلمان دریافت کریں گے کہ ہم ان کے لیے کیا لائے، کسی اور سے یہ نہ پوچھیں گے، ہم صرف جداگانہ انتخاب یا مسلمانوں کے لیے (WEIGHTAGE) لے کر ہندوستان واپس جانا نہیں چاہتے، بلکہ ہم آزادی لے کر واپس ہونا چاہتے ہیں، اور یہ آزادی مسلمانوں کے لیے بھی ہو، اور اگر ہم یہاں یہ حاصل نہ کر سکے تو پھر ہم وزیر اعظم کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمان سول نافرمانی کی تحریک میں شریک ہوں گے خواہ اس کے متعلق

---

[۱] گول میز کانفرنس میں سولہ مسلمان ممبروں کو مدعو کیا گیا تھا۔ ان میں علی برادران اور قائد اعظم کے علاوہ دوسرے تیرہ ممبر یہ تھے، نواب صاحب بھوپال، بیگم شاہنواز، سر مرزا اسمٰعیل، سر عبدالقیوم، صاحبزادہ سلطان احمد، مسٹر فضل الحق، سر اکبر حیدری، راجہ شبیر محمد خاں ڈومیلی، سر محمد شفیع، آغا خاں، مسٹر غزنوی، خان بہادر حافظ ہدایت حسین اور سر غلام حسین ہدایت اللہ۔ مولانا محمد علی نے سبھی کے بارے میں شکایت کی کہ نہ انہوں نے تحریک خلافت، تحریک ترک موالات اور تحریک سول نافرمانی میں حصہ لیا کہ مسلمانوں کے نمائندے کہلائے جائیں اور نہ انہوں نے لوگوں کو کانگریس میں شرکت سے روکنے کے لیے کوئی تحریک چلائی کہ انھیں برطانوی حکومت ہی کا بہی خواہ سمجھا جا سکے۔ میرا خیال ہے کہ وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ یہ مدعوین فرد ہیں لیکن ان کی قومی نمائندہ حیثیت کچھ بھی نہیں۔

گول میز کانفرنس کے اور مسلمان نمائندے کچھ بھی کہیں۔

جداگانہ انتخاب میں ہندوستان کی آزادی نہیں، میں ۱۹۰۵ء میں خود جداگانہ انتخاب کا حامی تھا، اس کو میں واگذاشت نہیں کرنا چاہوں گا، پہلے میں اس کی وضاحت کردوں گا کہ جداگانہ انتخاب کا افادی پہلو کیا ہے، جداگانہ انتخاب ہی کے ذریعہ سے ایک مسلمان موکل کو اپنے مقدمہ کے لیے ایسا وکیل مل سکتا ہے جس کو وہ اپنی خواہش سے منتخب کرکے اس پر اعتماد کر سکتا ہے، ہر عدالت میں ہر موکل اپنی مرضی کے مطابق اپنا وکیل منتخب کرتا ہے، گرچہ کبھی کبھی اس کے اخراجات حکومت کی طرف سے بھی برداشت کر لیے جاتے ہیں، اس کی مخالف جماعت اس کے لیے وکیل کا انتخاب نہیں کرتی، ایک آزاد اور غیر جانبدار جج کے سامنے ایک قابل اعتماد وکیل کو پیش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، ایک نسل پہلے لارڈ مورلے اور لارڈ منٹو نے یہی حق ہم لوگوں کو دیا، لارڈ مورلے ہندوستان کو برطانوی طرز کی

لہ نہرو رپورٹ سے کانگریس کی ساکھ کو جو نقصان پہنچا تھا ضرورت تھی کہ کوئی ایسی عوامی تحریک شروع کی جائے جس سے ایک طرف تو کانگریس کی ساکھ دوبارہ قائم ہو، دوسری طرف آزادی کی جنگ میں جان نظر آئے اور ہندو مسلمان پھر اسی جوش و خروش کے ساتھ تحریک آزادی میں حصہ لینے کے لیے آگے بڑھیں۔ اسی مقصد سے ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو یوم آزادی منایا گیا اور حکومت کو سول نافرمانی کی دھمکی دی گئی پھر فروری میں عدم تشدد کے ساتھ سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز کردیا جو نمک سازی کے قانون کو توڑ کر شروع کی گئی۔ بلاشبہ اس سے ملک میں ایک جوش و خروش اور آزادی کی جنگ لڑنے کا بڑا غیر معمولی جذبہ پیدا ہوا۔ مسلم جماعتوں میں جمعیت علمائے ہند، مجلس احرار اسلام اور خدائی خدمت گار پارٹی نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جلسوں، جلوسوں، احتجاجوں اور ہڑتالوں میں وہ پیش پیش رہے، پچاسوں رہنماؤں اور ہزاروں کارکنوں کی گرفتاریوں نے جیلوں کو آباد کیا۔ لیکن مسلم لیگ کے زیر اثر مسلمانوں کی اکثریت اس سے الگ رہی اور اسی لیے تحریک ترک موالات کی طرح اس میں پہلی سی بات پیدا نہ ہوسکی۔ یہاں محمد علی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر گول میز کانفرنس میں مسلمان اپنے مقاصد حاصل کرنے میں ناکام رہے تو انھیں سول نافرمانی کی تحریک میں حصہ لینے سے روکا نہیں جا سکتا۔

پارلیمانی حکومت دینے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے کیونکہ سرکاری بلاک بھی موجود تھا، جس کی اکثریت ہوتی، اس سے ظاہر ہے کہ ہندوستان میں برطانوی طرز کی حکومت قائم کرنے کا خیال نہیں تھا، یہ حکومت محض جج کے فرائض انجام دیتی، ہر فرقہ ایک موکل کی حیثیت سے اس کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کرتا، اور یہ جج ہی اپنا فیصلہ صادر کرتا، ہم صرف جج پر اثر انداز ہوتے، اس کی رہنمائی نہیں کرتے، اور نہ کوئی مشورہ دینے کا حق رکھتے، اسی لیے ایک قابل اعتماد وکیل کی ضرورت ہوتی، جو موکل خود منتخب کرتا، ہم لوگ یہ انتخاب "جداگانہ انتخاب" کے ذریعے کرتے رہے۔

لارڈ مورلے نے محض اتفاقاً ارادۃً نہیں، حال کے علاوہ مستقبل کے لیے اس ضرورت کا خیال رکھا، یہ جداگانہ انتخاب محض ایک ضمیمہ تھا جس سے مسلمانوں کے اس خطرہ کو دور کیا گیا جو ہندوؤں کی اکثریت کی تنگ نظری کی وجہ سے پیدا ہونے والا تھا، لارڈ مورلے نے مسلمانوں کو مخلوط انتخاب کے حق سے محروم نہیں کیا تھا، لیکن ۱۹۱۶ء عیسوی میں جب چھنڈواڑہ میں ہم دونوں بھائی نظر بند تھے تو ہمارے ہندو دوستوں نے عجلت میں ایک تجویز منظور کرائی، ہم دونوں بھائی لکھنؤ میں نہ مسلم لیگ میں اور نہ کانگریس میں شریک ہو سکتے تھے، مگر وہاں مسلمانوں کی نمایندگی کے لیے جداگانہ انتخاب منظور کر لیا گیا، جو ایک مہلک غلطی تھی[۱]۔

---

[۱] ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے مابین لکھنؤ میں جو سیاسی معاہدہ ہوا تھا جسے لکھنؤ پیکٹ یا میثاق لکھنؤ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس میں دونوں جماعتوں نے جداگانہ انتخاب کا اصول تسلیم کیا تھا مولانا محمد علی جیسا کہ اس خط سے ظاہر ہوتا ہے، اس کے خلاف دلائل رکھتے تھے اور اسے اکابر مسلم لیگ کی مہلک غلطی سمجھتے تھے۔ دوسری خاص بات اس معاہدے کی یہ تھی کہ پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی کے لحاظ سے کونسلوں میں پانچ سیٹیں کم اور بنگال میں مسلمانوں کی آبادی کے تناسب سے ۱۳ نشستیں کم منظور کر لی گئی تھیں اور اس کے بدلے میں مسلم اقلیت کے صوبوں میں ان کی نشستوں میں ایک تہائی کا اضافہ کر دیا گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم اقلیت کے صوبوں میں (باقی صفحہ ۹۴ پر)

ایک اور بڑی غلطی یہ ہوئی کہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کر دیا گیا، جس کے لیے مسلمان گزشتہ چودہ[۱۴] سال سے چیخ پکار کر رہے تھے، اگر ہمارے دوستوں کو مستقبل کا خیال ہوتا تو وہ پنجاب اور بنگال میں ایسا نہ کرتے[۱۵] ان ہی غلطیوں کو دور کرتے

(بقیہ صفحہ ۹۳ کا) تو وہ چند نشستوں کے اضافے سے اکثریت نہ بن سکتے تھے نہ بن سکے لیکن پنجاب و بنگال میں وہ چند نشستوں کی کمی کی وجہ سے اقلیت میں تبدیل ہو گئے۔ سندھ اس وقت تک بمبئی پریسیڈنسی میں شامل تھا اور پریسیڈنسی میں مسلمانوں کی آبادی ۲۰ فیصد بنتی تھی اور سرحد بلوچستان کو اس وقت تک دوسرے صوبوں کی طرح حقوق ہی حاصل نہ ہوئے تھے۔ اس طرح مسلم اکثریت کے تمام صوبوں میں بھی وہ اپنے عددی امتیاز سے محروم ہو گئے۔ اس سلسلے میں مولانا محمد علی کی رائے کی شدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اسے مسلم لیگ کے رہنماؤں کی دوسری مہلک غلطی قرار دیتے ہیں۔ مولانا محمد علی نے اس کے خلاف جو دلائل دیئے ہیں ان کی محکمی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے یہ اجلاس جن میں یہ معاہدہ اور تصفیہ طے پایا تھا لکھنؤ میں ہوئے تھے اور ان کے صدر قائداعظم محمد علی جناح اور امبکا چرن مزمدار تھے۔

[۱۵] مخلوط انتخاب کی شرط کے ساتھ قائداعظم کا چودہ نکاتی فارمولا تسلیم کیا جا سکتا تھا۔ عام رجحان یہی تھا کہ دیگر نکات کی منظوری کی صورت میں جداگانہ انتخاب کی شق کو مخلوط انتخاب کی شرط سے بدل دینا چاہیے لیکن علی برادران کی رائے اس کے برعکس تھی۔ مولانا شوکت علی نے اپنے برقی پیغام میں اطلاع دی تھی "ہم انتخاب جداگانہ پر برابر اڑے ہوئے ہیں۔ اگر چودہ مسلم مطالبات تسلیم کر لیے جائیں تو محمد علی صاحب کی پیش کردہ شرائط کے ساتھ انتخاب مشترکہ منظور کیا جا سکتا ہے" (روزنامہ انقلاب لاہور۔ ۶ دسمبر ۱۹۳۰ء ص ۵)

مولانا محمد علی کی شرط یہ تھی کہ جب تک کوئی شخص مخلوط انتخاب کے ماتحت اپنی قوم کے ۴۰ اور دوسری اقوام کے لیے ۱۰ ووٹ حاصل نہ کرے نمائندہ قرار نہ دیا جائے۔" (ایضاً۔ ۹ دسمبر ۱۹۳۰ء ص ۳)

مولانا غلام رسول مہر نے اس مسئلہ پر اسی اشاعت میں ایک لیڈنگ آرٹیکل لکھا جس میں انہوں نے فرمایا۔

"مسٹر جناح کے نکات کی منظوری کے ساتھ مخلوط انتخاب پر رضامندی کے اظہار کا مطلب زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی اکثریتوں کی پوزیشن بدستور خراب رہے اور مخلوط انتخاب رائج ہو جائے۔ ہم اسے ہرگز ترین دانش و تدبر قرار نہیں دے سکتے۔"

کے لیے گول میز کانفرنس طلب کی گئی ہے، کوئی اور غلط فہمی نہ ہونی چاہیے
اسی بات کو ہز مجسٹی کی حکومت اور وزیر اعظم کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

ہماری یہ لمبی تمہید اسی بات کے لیے ہے، اور اسی کے بعد مضبوط بنیاد ڈالی جاسکتی ہے، میں زیادہ وقت نہیں لوں گا، لیکن مسئلہ کی حقیقی نوعیت کو اس طرح واضح کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کو ان صوبوں میں پورا اقتدار ملنا چاہیے، جہاں وہ اکثریت میں ہیں، خواہ یہ اکثریت بڑی یا چھوٹی ہو، اور جہاں وہ اقلیت میں ہوں، ان کو وہاں پورا تحفظ ملنا چاہیے، اور یہی باتیں ہندوؤں کے لیے بھی ہوں، ضرورت اس بات کی ہے کہ جو فرقہ جس صوبہ میں اکثریت رکھتا ہو، اس کو اقتدار ملنا چاہیے، اور جو اقلیت جس صوبہ میں ہو اس کی حفاظت کا سامان ہونا چاہیے، چودہ نکات کا اصل مطلب یہی ہے، محض جداگانہ انتخاب حاصل کرنا نہیں ہے، مسلمانوں کی خواہش ہے کہ مرکزی حکومت وفاقی طرز کی ہو، وحدانی طرز کی نہ ہو تاکہ ہندوؤں کی اکثریت ہر حال میں مسلط نہ رہے، مرکزی حکومت میں ان کو ⅓ کی بھی نمایندگی حاصل ہو، بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کی تھوڑی سی اکثریت ہے، لیکن وہ غیر منظم ہیں، بنیا، سکھ اور ہندو زمین داران پر چھائے ہوئے ہیں اس لیے وہاں کے مسلمانوں کی نمایندگی کی تعداد محفوظ رہے، میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر بیس۲۰ سال تک یہ محفوظ کر دیا جائے تو میں مطمئن رہوں گا، شمال مغربی سرحد کے صوبہ اور بلوچستان میں مسلمانوں کی واضح اکثریت ہے، اس لیے وہاں ان کو پورے اصلاحات ملنے چاہئیں، لیکن وہ ان اصلاحات سے برطانوی تسلط کے سبب محروم ہیں، اس کی تائید ہندوؤں کی تنگ نظری کر رہی ہے، سندھ آسام کی طرح ایک صوبہ بن جائے، ان صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت اسی طرح تسلیم کرلی جائے، جس طرح کہ اور صوبوں میں ہندوؤں کی اکثریت تسلیم کرلی گئی ہے، ان چند صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت تسلیم نہیں کی گئی، تو میں دھمکی دے کر نہیں بلکہ دوستانہ طور پر کہتا ہوں کہ پھر تو ہندوستان میں خانہ جنگی شروع ہو جائے گی، اس کے علاوہ

کسی اور غلط فہمی میں نہ رہنا چاہیے، یہ چار پانچ صوبے ہیں جن میں مسلمانوں کو اقتدار حاصل ہونا ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ ہندوؤں کو ان کے صوبوں میں ہے، ہندوؤں کو مسلمانوں کے صوبوں میں وہی تحفظ ہو، جس کے طالب مسلمان ہندوؤں کے صوبوں میں ہیں۔

پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت بہت تھوڑی سی ہے، اس لیے یہ بالکل ہی ممکن نہیں کہ وہاں سکھوں یا یوروپین کو ان کی آبادی کے تناسب سے زیادہ نمایندگی کا حق (WEIGHTAGE) دیا جائے، ان کو اس کی ضرورت بھی نہیں، جیسا کہ میں آگے چل کر ظاہر کروں گا، یہ مطالبہ محض مسلمانوں کو ان دونوں صوبوں میں اکثریت سے محروم کر دینے کے لیے کیا گیا ہے[۵]، ان دونوں صوبوں میں ووٹ دینے کے طریقے کیا ہوں، سارے فرقوں کے لیے یکساں ہوں یا نہیں، یہ سوال کوئی مذہبی یا اخلاقی نہیں، جس کی پابندی دور نہیں کی جا سکتی ہے، رائے دہندگی میں کوئی ناقابل تغیر قانون اس وقت بھی رائج نہیں، کونسل آف اسٹیٹ میں رائے دینے کا طریقہ کچھ اور ہی ہے، مگر مسلمان رائے دہندوں کی تعداد ان کی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے ہو، اور کم از کم بیس ۲۰ سال تک ان کی جگہیں محفوظ ہوں کیونکہ یہ مسلمان ہندو بنیوں کے مقروض ہیں، اور سکھوں کے اثرات زیادہ غالب ہیں،

نہرو رپورٹ نے بڑی ہوشمندی سے رائے دہندگی بالغان کا ذکر

۵؎ پنجاب میں غیر مسلم ۴۵ فی صد اور بنگال میں غیر مسلم ۴۷ فی صد تھے۔ اس کے برعکس سی پی، بہار اور یو۔ پی میں بالترتیب مسلمان ۴، ۱۰، اور ۱۴ فی صد تھے۔ اگر ان صوبوں میں ویٹج (WEIGHTAGE) کے ذریعہ مسلمانوں کی نشستوں میں ۵۰ فی صد بھی اضافہ کر دیا جائے تو مسلمانوں کی اقلیتی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا لیکن اگر پنجاب اور بنگال میں غیر مسلم اقلیت کو دس فی صد بھی ویٹج دے دیا جائے تو مسلمان پنجاب اور بنگال میں بھی اقلیت بن جاتے ہیں۔ مولانا محمد علی کے نزدیک پنجاب و بنگال میں بھی غیر مسلم اقلیت کے لیے ویٹج کے مطالبے کا یہی مقصد تھا۔ خط کے اس مقام کے بعد تیسرے اور چوتھے پیراگراف میں مولانا محمد علی نے نہایت معقولیت کے ساتھ اس مطالبے کے جواز کو رد کر دیا ہے۔

کر کے مسلمانوں کو بیوقوف بنانے کی کوشش کی ہے، ایک سچے مسلمان سے زیادہ کوئی اور رائے دہندگیِ بالغان کا حامی نہیں ہو سکتا ہے، لیکن خوش قسمتی یا بدقسمتی سے کم سے کم بیس برس تک مسلمانوں کی جوان عورتیں پولنگ بوتھ پر نہیں جا سکتی ہیں، خواہ پردے کا کتنا ہی بہتر انتظام کیوں نہ کیا جائے، اس طرح آریاؤں، ہندوؤں اور سکھوں کی عورتوں کے مقابلہ میں مسلمان عورتیں اپنا حق استعمال نہیں کر سکتی ہیں، اس لیے رائے دہندگیِ بالغان کا سوال ہی نہیں اٹھنا چاہیے، پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کا جو یہ مطالبہ ہے ان کی نمائندگی یہاں کے ایوانوں میں ۵۶ اور ۵۵ فی صد ہو، اس کے خلاف کوئی بات نہ ہونی چاہیے۔

سکھوں نے پنجاب میں ایک نسل تک حکومت کی، انھوں نے یہاں اپنی زمین حاصل کر لی ہے کہ وہ دیہاتوں میں غریب رعایا پر حکومت کرتے رہیں، اس لیے ان کے تحفظ کی ضرورت نہیں، وہ بار بار کہتے رہے ہیں کہ اگر مسلمان قومیت کی خاطر فرقہ واریت کو ترک کر دیں تو وہ بھی فرقہ واریت سے باز آجائیں گے، اور وہ عام انتخابات کے نتائج کو تسلیم کر لیا کریں گے اگر جذبات سے خالی ہو کر سوچا جائے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ سکھ اس قسم کا تحفظ نہیں چاہتے ہیں جس قسم کے تحفظ کے خواہاں ہیں، سکھوں کو ویٹج (WEIGHTAGE) کی ضرورت نہیں، یہ سوال تو ہندو مہاسبھا نے کھڑا کر دیا ہے۔

یہی بات بنگال میں یوروپین کے لیے کہی جا سکتی ہے، اگر ان کو بنگال کونسل میں کچھ نشستیں دے دی جائیں تو اس سے وہ اس تجارت پر قبضہ رکھنے کے لائق نہیں ہو سکتے جو جان کمپنی کے زمانہ سے ان کو حاصل ہے ہم ان کا تحفظ دوسرے طریقے پر کر سکتے ہیں، میری رائے ہے کہ بنگال کے گورنر کی طرف سے ایک (INSTRUMENT OF AO ON) جاری ہو کہ کوئی ایسی بات نہیں کی جا سکتی ہے جس سے ظاہر ہو کہ ہندوستانی یوروپین سے انتقام لینا چاہتے ہیں، اگر ان کو ۳ سے ۱۰ فی صدی تک (WEIGHTAGE)

دے دیا گیا تو اس سے ان کو کوئی فائدہ نہ ہوگا، یہ ایک غیر مؤثر چیز ہوگی، البتہ اس سے مسلمانوں کی اکثریت ان دونوں صوبوں میں جاتی رہے گی، جہاں وہ اکثریت میں ہیں۔

سرحد کے متعلق میں کچھ کہنا نہیں چاہتا ہوں کیونکہ ایک کمیٹی اس پر کام کر رہی ہے' میری رائے تو یہ ہے کہ یہاں کے مسلمان' ہندوؤں اور سکھوں کو نہ صرف دو گنی بلکہ تین گنی نمایندگی دیں تاکہ ان کو یہ محسوس ہو کہ یہ صوبہ مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ ہندوؤں اور سکھوں کا بھی ہے یہی احساس مسلمانوں کے دلوں میں ڈاکٹر مونجے کے صوبہ[1] میں پیدا ہونا چاہیے، جہاں مسلم آبادی صرف چار فی صد ہے اور مدراس میں جہاں کہ وہ صرف سات فی صد ہیں، یہی بات اڑیسہ میں ہو، جہاں مسلمان بہت ہی تھوڑی قلیت میں ہیں، یہ اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے کہ مسلمانوں کے خلاف جذبات ہر صوبہ میں یکساں ہیں، جب پنجاب میں یہ جذبات ہیں تو ڈاکٹر مونجے کے صوبہ میں کیوں نہ ہوں، جہاں مسلمان بہت ہی کم ہیں، یہاں تو ہندو ہی ان پر حکومت کریں گے، انتقام کا جذبہ ہندو نوجوانوں میں زیادہ ہے، جن کو سیاسی اسباب کی بنا پر ہندوستان کی تاریخ غلط طور پر پڑھائی گئی، ہندوستانی ریاستوں میں تو ایسی تاریخیں نہیں پڑھائی جاتی ہیں، یہ راجہ نواب تو تاریخیں بنا رہے ہیں، ان میں کمزوریاں ضرور ہیں' لیکن وہ انسانی پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے تاریخ بنا رہے ہیں، میں تو ایک پختہ عقیدہ کا جمہوریت پسند ہوں جس کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ راجاؤں اور نوابوں کی ریاست میں مسلمانوں کا تحفظ صحیح طور پر ہو رہا ہے۔

۱۲۵۰

سرسری طور پر یہ بھی ذکر کر دوں کہ مسلمانوں نے یہاں بارہ سو پچاس برس تک حکومت کی، اس لیے اور دوسری اقلیتوں کے مقابلہ میں زیادہ ہر دلعزیز نہ ہو سکے، ان کے خلاف تو یہ بھی جذبہ ہے کہ انھوں نے ایران

---

[1] اشارہ سی پی (صوبہ متوسط) کی طرف ہے۔

کو مسخر کیا، بازنطینیوں نے شام اور مصر کو زیر نگیں کیا اور صلیبی جنگ میں فلسطین کو اپنے قبضے سے جانے نہیں دیا، ہندوستان پر جس نے حکومت کی، خواہ مسلمان ہوں، خواہ یوروپین ہوں، ان کے خلاف یہاں کی پرانی رعایا کے جذبات ابھرے، خواہ وہ محض فرضی کیوں نہ ہوں، لیکن یہ بھی قابلِ ذکر بات ہے کہ جتنے جذبات یوروپین کے خلاف ہیں، اس سے کم مسلمانوں کے خلاف نہیں ہیں، برطانیہ کے لوگ خود اس کا اندازہ اچھی طرح لگا سکتے ہیں، اسی لیے وہ جیسا بھی دستور بنائیں اس کا لحاظ رکھیں کہ یہ انتقامی جذبات کم از کم کچھ سال تک دبے رہیں۔

اب میں اقلیتوں کے تحفظ کے مسئلہ کی طرف رجوع کرتا ہوں، چودہ نکات سے تحفظ ہو جاتا ہے[1]، ہاں اگر ہندو اور مسلمان اقلیتوں کو ویٹو کا

---

[1] چودہ نکات پر مشتمل رزولیوشن مسلم آل پارٹیز کانفرنس دہلی نے جنوری ۱۹۲۹ء میں منظور کرایا تھا۔ مسلم لیگ سے اس کی منظوری کے لیے ۳۰ مارچ کو دہلی ہی میں قائد اعظم کی صدارت میں جلسہ ہوا۔ مجلس مضامین کے جلسے کے دوران میں قائد اعظم کچھ دیر کے لیے مسلم کانفرنس سے اراکین سے تصفیے کی گفتگو کے لیے حکیم جمیل احمد خاں کے مکان پر گئے۔ قائد اعظم کے پیچھے مخالف لیگی ممبران نے ہنگامہ کر دیا لیکن تجویز پاس کر دی گئی اور ڈاکٹر محمد عالم کی صدارت میں جلسہ عام کا آغاز کر کے اسی ہنگامے میں وہاں بھی اسے پاس کر دیا گیا۔ لیکن جب قائد اعظم تشریف لائے اور انھیں حالات کا علم ہوا تو انھوں نے اعلان کر دیا کہ جو کارروائی ہوئی ہے کالعدم قرار دی جاتی ہے اور جلسہ غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کیا جاتا ہے۔ اس طرح مسلم لیگ کے باہمی اختلافات کی بدولت اس تجویز کا مسلم لیگ کے جلسے میں یہ حشر ہوا۔

اس کے باوجود یہ نکات اخبارات کے ذریعے شہرت پا چکے تھے اور ہندو اخبارات کی مخالفت نے مسلمانوں کے دلوں میں ان کی صداقت، وصحت کا یقین پیدا کر دیا تھا۔ اس لیے انھیں مسلم مطالبات کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا تھا۔ مولانا محمد علی نے انھیں مسلم آل پارٹیز کانفرنس میں منظور کرانے میں حصہ لیا تھا۔ لیکن غلام بھیک نیرنگ کے نام خط سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض مروتاً تھا، دل سے وہ ان کے قائل نہ تھے۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد علی اقلیتوں کے تحفظ کے لیے ان چودہ نکات کو کافی سمجھتے تھے لیکن ان کے نزدیک بعض ترمیمات ناگزیر تھیں۔ جیسا کہ یہاں اشارہ کیا۔

اختیار دے دیا جائے تو ان کے مزید تحفظ کا سوال یعنی ہندو یا مسلمان کی ⅔ اکثریت کسی بل یا تجویز یا اسی قسم کی اور چیز کی مخالفت اس لیے کرے کہ وہ اس کے مفاد کے خلاف ہے تو اس کو قانون ساز مجالس میں ویٹو کا حق ملنا چاہیے، کانگریس یہ تاریخی ضمانت اس وقت دے چکی ہے کہ جب ۱۸۸۷ء میں سرسید احمد خاں کو کانگریس میں شریک ہونے کی دعوت بدرالدین طیب کی طرف سے دی گئی جو کانگریس میں پہلے سے شریک تھے، اسی قسم کی شرط ہندوستان کے اس پارلیمنٹ کی طرف سے ہونی چاہیے، جس کی تشکیل آیندہ ہوگی اور اس کو موثر اختیارات بھی دیے جائیں گے، کانگریس کے دستور میں اس سلسلہ میں جو کچھ ہے وہ نقل کرلیا جائے۔

یہ بھی یاد رہے کہ اس قسم کی شرط مذہب کے تحفظ کے لیے نہ ہو، بلکہ فرقہ وارانہ مفاد کے لیے ہو، مذہب کو قانون سے بالاتر ہونا چاہیے، میں اجلاس کی کھلی کمیٹی سے باہر نکلا تو وزیر اعظم نے فیڈرل کمیٹی کی رپورٹ طلب کی اس میں اس کی سفارش کی گئی ہے کہ ہز مجسٹی کی رعایا کے مذہب مذہبی رسوم اور روایات سے متعلق کوئی قانون اس وقت تک نہ بنے گا جب تک پہلے سے گورنر سے اس کے لیے اجازت نہ لے لی گئی ہو، مگر اس شرط سے ضرر پہنچ چکا ہے، سارداایکٹ اسی طرح منظور کرالیا گیا، گو اس تجویز کے پاس ہونے کے بعد اس کی باضابطہ منظوری نہیں لی گئی، مگر پاس ہونے سے پہلے یہ محض ہندوؤں کے لیے بل تھا، مجھ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں، ہندو یا کسی اور ترقی پسند مذہب کے پیرو اپنے مذہب کے لیے کوئی قانون منظور کرائیں، لیکن میرا مذہب ترقی پسند نہیں، اس کا قانون خدا کی طرف سے بنا ہوا ہے، جیسا کہ میں نے اپنے اس بیان میں بتایا ہے جو نومبر ۱۹۲۹ء کو مسلمان علماء نے اس وفد کی طرف سے ہز اکسیلنسی وائسرائے کو پیش کیا جس کی قیادت میں نے کی، اس کی ایک نقل میں یہاں منسلک کرتا ہوں، اس قسم کے اہم مسائل کا فیصلہ جلد بازی میں نہ کرنا چاہیے، اور جب کوئی ایسا موقع آئے گا تو میں اس پر نگاہ رکھوں گا کہ کم از کم مسلمانوں کے مذہب کو انسانی

کے بنائے ہوئے قوانین سے بالاتر رکھنا چاہیے، خواہ یہ قوانین ہندوستان یا برطانیہ کے پارلیمنٹ میں کیوں نہ بنائے جائیں، اس کے بغیر مسلمان کسی دستور کے وفادار نہیں ہو سکتے۔

میں مختصر طریقہ پر کچھ اس ویٹیج (WEIGHTAGE) کے متعلق کہہ دوں جو مسلمانوں کو حاصل ہے یا جس کے وہ ہر اُس صوبہ میں خواہاں ہیں، جہاں وہ اقلیت میں ہیں، اس (WEIGHTAGE) سے کہیں وہ اکثریت میں نہیں ہو جاتے، شکسپیر نے یہودیوں کے متعلق کہا ہے کہ اس قبیلہ کا طرۂ امتیاز اس کی ابتلا ہے، یہی بات اقلیتوں کے لیے کہی جا سکتی ہے لیکن (WEIGHTAGE) سے ان کے اثرات میں کچھ اضافہ ہو جاتا ہے، ان اثرات کی ضرورت کا احساس مجھ کو زیادہ ہے، میں اپنی علالت کے سبب اقلیتی کمیٹی میں شریک نہیں ہو سکا، جس سے میری پارٹی کی نمائندگی نہیں ہو سکی (WEIGHTAGE) سے ایک فرقہ میں یہ احساس پیدا ہو جائے گا کہ وہ بھی ملک کی حکومت کا حصہ دار ہے، جس (WEIGHTAGE) کے مسلمان خواہاں ہیں، وہی وہ ان ہندوؤں کو دیں گے جہاں وہ اقلیت میں ہیں، لیکن بنگال اور پنجاب میں (WEIGHTAGE) کا مانگنا ایک مہمل سی بات ہے کیونکہ وہ ان دونوں صوبوں میں اقلیت کے لوگ بہتر طور سے منظم ہیں، سیاسی حیثیت سے بھی طاقت ور ہیں، مالی اور تعلیمی حیثیت سے بھی اکثریت سے بہتر ہیں، پنجاب میں سکھ معاشرتی حیثیت سے ہندو ہی ہیں اور ہندو ہی کے ساتھ سیاسی طور پر کام کرتے ہیں، سندھ میں بھی ہندو مسلمانوں سے دولت، تعلیم اور تنظیم میں زیادہ اچھے ہیں، اور وہ وہاں بڑے بڑے زمیندار بھی ہیں، لیکن وہاں میں ان کو زیادہ سے زیادہ (WEIGHTAGE) دینے کے حق میں ہوں تاکہ وہ ہر طرح سے مطمئن رہیں۔

اس غلط فہمی کو دور کر دوں کہ میں اس معنی میں فرقہ پرست ہوں جس معنی میں یورپ میں سمجھا جاتا ہے، ایک نسل پہلے میں جداگانہ انتخاب کے طلب گاروں میں تھا۔ اب میرا خیال ہے کہ اس کا وقت جاتا رہا ہے ہندوستانی

قومیت کے مفاد کی خاطر مخلوط علاقائی انتخاب ہونا چاہیے، لیکن جس طرح کہ مخلوط علاقائی انتخاب انگلستان میں ہوتا ہے، اس طرح کا انتخاب ہندوستان میں مہمل ہے، ڈاکٹر مونجے یا نواب سر عبدالقیوم کے صوبہ میں اقلیت صرف ۴ سے سات فی صد تک ہے، یہاں ان کے لیے بیس[2] جگہیں بھی مخصوص کر دی جائیں تو بھی ۹۳ یا ۹۶ فی صدی کی اکثریت اگر چاہے تو وہ ان اقلیتوں کے نمایندہ کو ناکامیاب کر سکتی ہے، یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کی اکثریت ان ہی ہندوؤں اور مسلمانوں کو منتخب کرے گی جو اپنے کو مذہبی کہیں گے خواہ سیاسی حیثیت سے ان کی کوئی اہمیت نہ ہو۔

مینے اپنے ساتھیوں کے مشورے سے بہت غور کر کے ایک نقشہ تیار کیا ہے، یہ میجرایٹلی کے اس نقشہ سے زیادہ قابل توجہ ہے جو انھوں نے سائمن رپورٹ میں شامل کیا ہے، یہ حسب ذیل ہے، دونوں فرقوں کے لیے جگہیں مخصوص کر دی جائیں، لیکن کوئی امیدوار اس وقت تک منتخب نہ قرار دیا جائے جب تک کہ

(۱) اس کو اپنے فرقہ کا کم از کم چالیس[؟] فی صد ووٹ حاصل نہ ہو،

(۲) اس کو کم از کم پانچ فی صد ووٹ وہاں کے دوسرے فرقہ کا بھی حاصل کرنا چاہیے جہاں وہ آبادی سے ۱۰ فی صد یا اس سے کم اقلیت میں ہے اور جہاں وہ اچھی خاصی اقلیت میں ہے، وہاں کے دوسرے فرقہ کا ووٹ اس کو دس فی صد حاصل کرنا ضروری ہے۔

اس طرح تین مقاصد پورے ہو جائیں گے، ایک تو یہ کہ ہر امیدوار دونوں فرقوں کے پاس جائے گا، جیسا کہ منٹو مارلے اصلاحات[1] کے تحت ہوا

---

[1] ۱۹۰۹ء میں لارڈ جان مارلے وزیر ہند اور لارڈ منٹو وائسرائے ہند کے باہمی مشورہ سے ہندوستان کے لیے اصلاحات کا ایک مسودہ تیار کیا گیا۔ اس کے ذریعہ وائسرائے کی مرکزی کونسل اور گورنروں کی صوبائی کونسلوں میں توسیع اور ہندوستانی ممبروں کی تعداد میں اضافہ کے ساتھ لارڈ مارلے نے تجویز کیا تھا کہ مسلمانوں کو معین نشستوں کے ساتھ مخلوط انتخاب دیا جائے "منٹو مارلے اصلاحات" سے مولانا محمد علی کا اشارہ اسی طرف ہے۔

کرتا تھا، اب مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات[1] میں ایسا نہیں ہوتا ہے، جس سے ہندوستان کی سیاسی اور معاشی زندگی برباد ہو گئی ہے، اس طرح جو خرابی پیدا ہو گئی ہے، وہ جاتی رہے گی، دوسرے یہ کہ کوئی ایسا امیدوار منتخب نہ ہوگا، جو اپنے فرقہ کا خاطر خواہ ووٹ حاصل نہ کر سکے گا تیسرے یہ کہ ایسا امیدوار جو دوسرے فرقہ میں پسند نہ کیا جاتا ہو منتخب نہ ہو سکے گا، اگرچہ وہ اپنے فرقہ کا زیادہ سے زیادہ ووٹ کیوں نہ حاصل کرے، اس طرح پہلی بار فرقہ واریت ہلاک ہو کر رہ جائے گی اور سچی قومیت وجود میں آئے گی، اگر کوئی امیدوار ان شرائط کو پورا نہ کر سکے تو پھر وہ امیدوار منتخب کر لیا جائے جو اپنے اس فرقہ کا ووٹ زیادہ سے زیادہ حاصل کر سکے جس کے لیے جگہ مخصوص ہو، اس طرح جداگانہ انتخاب کی یاد جائے گی جو ابھی ناگزیر ہے، مگر میں وہ جداگانہ انتخاب پسند نہیں کروں گا جس کی تجویز انگلستان میں بیٹھ کر پیش کی جا رہی ہے، مذکورہ بالا شرائط کے بغیر مسلمان کبھی اس مخلوط انتخاب کو قبول نہ کریں گے، جس میں اکثریت کے فرقے کے ۹۶ فی صدی ووٹ تو وہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے، مگر اقلیت کا سارا فرقہ اس کا مخالف ہو، پھر بھی وہ اس کی نمائندگی کا دعویدار بن جائے۔

میں نے اس تجویز کی تصریح وائسرائے بہادر اور ہندوستان کے سکریٹری آف اسٹیٹ کے سامنے بھی کی تھی، اور وہ دونوں اس سے متاثر ہوئے تھے، میں اپنے بیان میں صحیح ہوں گا اگر یہ کہوں کہ اس سے سر تیج بہادر سپرو اور رائٹ آنریبل سری نواس شاستری بھی متاثر ہوئے ہیں۔

میں اپنے اس بیان کو ختم کرتا ہوں جو وزیر اعظم اور سر جیوفرے کوربٹ

---

[1] اگست ۱۹۱۷ء کے شاہی اعلان کے بعد مسٹر مانٹیگو وزیر ہند نے ہندوستان کا دورہ کیا تھا اور حالات کا جائزہ لے کر لارڈ چیمسفورڈ وائسرائے ہند کے ساتھ ایک رپورٹ مرتب کی جو جون ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی مولانا محمد علی کا اشارہ اور اظہار عدم اطمینان اسی رپورٹ میں تجویز کردہ اصلاحات کی طرف ہے۔

کی مہربانی سے میں قلمبند کرا سکا ہوں، میں نے اپنے ڈاکٹروں کی عدول حکمی کی اور وہ مجھ سے ناخوش ہیں کہ میں نے اپنے اوپر ظلم کیا، اگر میں یہ نہ لکھواتا تو پھر میں اپنے ڈاکٹروں کی نافرمانی کرکے اس مسئلہ کو پیش کرنے کے لیے کمیٹی اور کانفرنس میں حاضر ہو جاتا، گو وہاں پہنچ کر مر ہی کیوں نہ جاتا، میں وزیراعظم اور کمیٹی[1] سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے ان طویل معروضات کی طرف توجہ کریں، میں ان دونوں کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے ان کروڑوں مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے، جن کی آواز گول میز کانفرنس میں تو نہیں سنائی دے گی، لیکن ان کے احساسات کو ہندوستان کے حکام نظرانداز نہیں کرسکتے، یہ بات سر جیوفرے کوربٹ اچھی طرح جانتے ہیں۔

میں ہوں آپ کا اطاعت مند
محمد علی[2]

---

[1] کمیٹی سے مراد وہ کمیٹی ہے جو اقلیتی امور کے تصفیے کے لیے قائم کی گئی تھی اور مولانا محمد علی جس کے ممبر تھے

[2] مولانا محمد علی نے یہ خط وزیراعظم سر ریمزے میکڈانلڈ کو بھیجنے کے علاوہ گول میز کانفرنس کے ممبروں میں بھی تقسیم کرایا تھا۔

مولانا شوکت علی

(۱)

(۹)

پیارے شوکت!

عید مبارک۔ عید مبارک کا تحفہ دس سیر لوکاٹ بھیج رہا ہوں۔ یوں تو ہم سب اچھے ہیں، مگر گلنار کے برص کا علاج ہو رہا ہے اور حمیدہ کا علاج بھی حکیم تفضل حسین خاں صاحب کا جاری ہے۔ امجدی کے پاؤں پر بھی کسی قدر زور ہے میں ویسے تو اچھا رہا مگر حکیم تفضل حسین خاں صاحب کی گولیاں کھا رہا ہوں۔ انشاء اللہ کل پرسوں قارورہ کا امتحان کراؤں گا۔ افلاس نے پریشان کر دیا ہے۔ خدا رحم کرے۔ آپ کی حالت مجھ سے بدتر ہے اور میری ایک حساب سے آپ سے بدتر ہے کہ پندرہ سو روپیہ ماہوار کا خسارہ ہے اور نہ اس کے کم کرنے کی کوئی صورت ہوتی ہے، نہ اس کے کسی سے دلوانے کی، خداوند کریم ہمارے ایمان، حب اسلام اور حبِ وطن کی آزمائش فرما رہا ہے۔

آپ کا خط کل ملا۔ مبین کو اپنی مالی حالت لکھ بھیجی ہے اور پوچھا ہے کہ کم سے کم کس قدر رقم تمھیں درکار ہو گی۔ اگر میں اتنی ادا کر سکا تو 'کمریڈ' پھر جاری کرکے دونوں اخباروں کے ذریعہ سے خسارے کو گھٹاؤں گا، ورنہ پھر پبلک زندگی کو خیرباد ہے۔ دو تین لڑکوں کو پڑھا کر پچاس روپیہ ماہوار کما لیا کروں گا امجدی اور لڑکیاں کپڑا سی کر سنتر اسی پیدا کر لیں گی، ان کو بھی پڑھاتا رہوں گا اور مسجد کے ایک گوشہ میں بیٹھ کر قرآن کریم و حدیث شریف پڑھوں گا۔ اور کوئی اگر میرے خیالات سننا چاہے گا تو اسے سنا دیا کروں گا۔ اب یہ ممکن نہیں کہ ترک تعاون جاری رکھ کر جس کا چھوڑنا ترک اسلام ہے، اخبارات کے خسارے بھی ادا کیا کروں۔ ایک آخری کوشش غالباً اسی ماہ میں اور کر دیکھوں اور شاید آپ کے پاس ایک دو دن کے لیے آؤں، فی امان اللہ۔ امجدی اور بچوں کا سلام۔ طارق بہت یاد آتا ہے۔ زہرہ، ناہید، شاہد، شعیب، قمر کو پیار

عابد اچھا ہے۔ قطب میاں صاحب اسے پچاس روپے دے گئے ہیں۔
لکھیے آپ نے سلطان ابن سعود، شریف شرف عدنان اور موتمر کے ارکان کو خط بھی لکھے یا نہیں۔

مفصل جواب کا منتظر
آپ کا محمد علی۔ ۵/اپریل ۱۹۲۷ء

(۲)

(۱۰)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیارے[1] بھائی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ میں ایک ہفتہ سے برابر اس کی کوشش کر رہا ہوں کہ آپ کو خط لکھوں مگر یہ خط مجھے سخت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ آپ کی اور غالباً میری بھی ڈاک کھولی جاتی ہے اور اگرچہ ہماری زندگی ایک کھلے ورق کی طرح ہے، پھر بھی میں نہیں چاہتا کہ بعض باتیں غیروں تک جائیں۔ زبانی گفتگو کرنا اور بھی مشکل ہے اور میرا خیال ہے کہ مجھے اسی طرح ہمیشہ خاموش رہنا پڑے گا۔

پہلے اس کے کہ میں اپنے آئندہ پروگرام کے متعلق کچھ کہوں آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ ایک ہفتہ ہوا کہ ڈینس برے صاحب[2] کا جواب آگیا۔ کیا آپ کے لیے اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل ہے کہ اس کے دیکھتے ہی میرے جذبات واحساسات کی کیا کیفیت تھی اور میں اگر اسی وقت اس کا جواب دیتا تو کیا دیتا۔ میں نے ان حضرت سے نہایت ہی حزم واحتیاط سے ہمیشہ گفتگو کی ہے اور یہی حال تحریر کا رہا ہے۔ افغانستان کے پاسپورٹوں کے سلسلے میں مولانا عرفان کو اپنے ہمراہ صوبہ سرحد میں ستمبر ۱۹۲۷ء میں لے جانے کے معاملہ میں جبکہ پہلی بار ان سے نیاز حاصل ہوا تھا اور دوبارہ مولانا عرفان کو سندھ کا پورا در

---

[1] مولانا محمد علی کا یہ خط مارچ ۱۹۲۹ء کے بعد کا ہے جبکہ انھوں نے رنگون (برما) کا دورہ کیا تھا اور اگست ۱۹۲۹ء سے قبل کا ہے جبکہ ان کی تیسری صاحبزادی حمیدہ کا انتقال ہوا تھا۔

[2] حکومت ہند میں ہوم ممبر تھے۔

جاوا بھجوانے میں، اب جنوبی افریقہ کے داخلہ کے مسئلہ میں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کا طرزِ عمل یہ ہرگز نہ ہوتا، مگر میں جوز ود خشم مشہور ہوا۔ صورت حالات اور ضرورت دونوں کو پیشِ نظر رکھ کر مجبور ہو گیا کہ اس قدر صبر وضبط سے کام لوں۔ اگر میں واقعی اس قدر زود خشم ہوتا جس قدر کہ ہمارے دوستوں نے دشمنوں سے بھی زیادہ مشہور کیا ہے تو کبھی اس قدر صبر وضبط کا یارا نہ رکھ سکتا۔ بہرحال اب اس تمام حزم واحتیاط کا یہ نتیجہ نکلا ہے۔ اب جو آپ کی رائے ہو۔ میں نے ابھی اس جواب کی نقل آپ کے ملاحظہ کے لیے کی تو پھر جی چاہا کہ ان حضرت کو پہلے جواب لکھ دوں اور بعد کو اس کی بھی نقل اس کے ہم رشتہ آپ کو ارسال کر دوں اور تب جا کر آپ کو یہ خط لکھوں۔ مگر میں نے پھر صبر و ضبط سے کام لیا اور ابھی انہیں کوئی جواب نہیں دیا۔ آپ کے دوست سر حبیب اللہ کیا فرماتے ہیں؟ آپ نے ان کو کچھ لکھا یا نہیں؟ وہ ہندوستان کی طرف سے جنیوا میں سرکردگی فرمائیں گے، نہیں معلوم وہ کیا فرماتے ہیں؟ میرا قیاس ہے کہ انہوں نے انھیں حضرت کے ذریعے سے پیش بندی فرما دی ہے اور ابھی تو پہلا ہی قدم مشکل ہے، یعنی آپ کو پاسپورٹ ملنا۔ جب آپ اس مرحلہ سے بھی گذر جائیں گے۔ تب بھی سر حبیب اللہ سے آپ کو واسطہ پڑے گا، بلکہ براہ راست آپ کو جنوبی افریقہ کی حکومت سے داخلہ کی اجازت مع میرے مانگنا پڑے گی اور جب سنگاپور کی حکومت عرفان صاحب کے صوبہ سرحد کے ریکارڈ کو اس قدر REPROACHABLE سمجھتی ہے تو کیا جنوبی افریقہ کی حکومت ہمارے ریکارڈ کو بالکل (REPROACHABLE) سمجھے گی۔ حقیقتاً دونوں حکومتوں کے درمیان اس معاملہ کے متعلق اب بھی گفت و شنید ہو چکی ہوگی، تاہم مجھے مطلع کیجیے کہ سر حبیب اللہ کیا فرماتے ہیں اور اس میں کچھ کرنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ اگر وہ نہ بھی مدد کریں تب بھی ہمیں پاسپورٹوں اور داخلہ کی اجازت کے حصول کے لیے کوشش کرنا چاہیے تاکہ اتمام حجت ہو جائے اور اس کے بعد جو کچھ بھی ہم کو کرنا ہو وہ ہم کریں۔ اسی وجہ سے میں نے سر ڈینس برے کے خط کا جواب اب تک نہیں لکھا ہے، نہ اخبارات کو مولانا عرفان کے متعلق کوئی اطلاع

دی ہے۔ حکومت ہمارے ساتھ یہ سلوک کر رہی ہے اور وہ لاہور کا اخبار بیچنے والا اور یہاں دہلی کا قدآدم پوسٹر مسلمانوں کو اس کا یقین دلا رہے ہیں کہ ہم حکومت سے مل گئے اور آیندہ کبھی بھی اس کی مخالفت نہ کریں گے۔ ان لوگوں کی اس قسم کی مجنونانہ حرکات پر مجھے حیرت نہیں ہوئی، مرنا کیا نہ کرتا، مگر حیرت اس پر ہوئی ہے کہ عوام کا مذاق ان لوگوں نے اس قدر بگاڑ دیا ہے کہ ایک خاصی جماعت ان مجنونانہ باتوں پر یقین لے آنے کو تیار ہے اور اس میں سے بعض جو کبھی مجھ سے اس کی شکایت کرتے تھے کہ آپ ان لوگوں کے منہ کیوں لگتے ہیں یہ اس قابل نہیں کہ آپ جیسا لیڈر ان کا مدِمقابل بنے رحالانکہ اوروں میں کسی نے نہ اس طرف توجہ کی، نہ اتنی ہمت کی کہ ان کے روزافزوں اثر کا مقابلہ کرکے عوام پر ان کی حقیقت ظاہر کر دے اور اس لیے عوام میں ان کا اس قدر مہلک، مگر زبردست اثر پھیل گیا، وہی آج اس کی تعریف بھی کر رہے ہیں کہ آپ نے اس بار ان لوگوں کو منہ نہیں لگایا، مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ لوگوں نے یہ افواہ اڑانا شروع کی ہے کہ یہ دونوں بھائی انگریزوں سے مل گئے ہیں اس کی تردید ضرور کر دینا چاہیے۔ خدا کی شان ہے علی برادران کے متعلق یہ افواہ اڑائی جائے اور انھیں اس کی تردید کرنا پڑے یہ لوگ جو ایسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں، عوام نہیں بلکہ ان سے زیادہ سنجیدہ طبقہ کے لوگ ہیں۔ حقیقتاً سمجھدار لوگوں کی آج اتنی کمی ہے کہ ان کا ایک ہاتھ کی بھی انگلیوں پر گن لینا مشکل نہیں مجھے افسوس ہوتا ہے کہ ہماری ساری عمر کی محنت کا اس سے زیادہ نتیجہ نہیں نکلا کہ ہندو ایک نامراد اور متعصب اور تنگدل جماعت بن گئے اور مسلمان ایک جماعت بھی نہ بن سکے بلکہ منتشر افراد کا ایک گروہ ہو کر رہ گئے ہیں اور برنارڈ شاہ کے ڈرامے "BACK TO METHUSELAH" میں "AS FOR AS THE EYE CAN SEE" STAGE کی آخری EVOLUTION میں انسان نے LABORATORY میں بیٹھ کر جو مشین کا مرد اور عورت کا جوڑا بنایا ہے، اس طرح ہو گئے ہیں۔ ان سے جب پوچھا جاتا ہے کہ تم ہمارے متعلق کیا خیال کرتے ہو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم کیسے بتا سکتے ہیں۔ ہم نے آج

صبح کا اخبار نہیں دیکھا ہے۔ مسلمانوں میں آج ایک اخبار بھی نہیں جس کے چلانے والے مکر و فریب، زر پرستی اور خود غرضی سے پاک ہوں اور امور عامہ کے متعلق سنجیدگی اور متانت سے اور غور و فکر کے بعد رائے کا اظہار کر سکیں اور پھر "قوم" ہے کہ ہر صبح ان کی رائے کی اس طرح محتاج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں دو سال سے اس کا ارادہ کر رہا تھا کہ بہتر ہے کہ دو تین سال اس "قوم" کو اس کے حال پر چھوڑا جائے۔ اس کا جو فرد خود اس ضرورت کو محسوس کرے کہ ہم سے رائے مانگے، تو اسے اظہار رائے سے کبھی محروم نہ کیا جائے مگر خواہ مخواہ ہر وقت اظہار رائے سے احتراز کیا جائے اور آئندہ کنواں پیاسے کے پاس دوڑا دوڑا نہ پھرے۔ جب یہ لوگ اپنے حاصل کردہ تلخ تجربے سے اس قدر سیکھ لیں گے کہ یہ اخبار بیچنے والے اور یہ قدِ آدم پوسٹر اور یہ بھوسوں کے بھوکے خود قوم کے محتاج ہیں، قوم ان کی ہرگز محتاج نہیں تو وہ بھی اپنی اس روش کو ترک کر دیں گے کہ

جاتا ہوں تھوڑی دور ہر ایک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اخبار نویسوں میں آج ایک بھی اہل الرائے نہیں، اگر کچھ ہیں تو "اہلِ قلم" ہیں جو قلم چلا کر اپنی روٹی کمانا ایک حد تک جانتے ہیں، لہٰذا جو کوئی اہل الرائے اس میدان میں آتا ہے اس کا وہی حشر ہوتا ہے جو ہمیشہ اندھوں میں ایک آنکھوں والے کا ہوتا ہے۔ یہ سراسر غلط ہے کہ IN THE KINGDOM OF THE BLIND THE ONE-EYED IS KING حقیقت یہ ہے کہ IN THE KINGDOM OF THE BLIND THE ONE-EYED IS HUNG۔ یہ تو عام بحث تھی اب میرے پروگرام کے متعلق سنیے۔ میں حمیدہ کی علالت اور اپنے افلاس کے باعث مجبور تھا کہ برما نہ جاؤں مگر آپ کے اصرار سے، اور اس امید پر کہ میرے گھر کے مصارف کے لئے آپ روپیہ بھجوا سکیں گے میں برما گیا۔ وہاں جو کچھ ہوا اُسے میں اپنے خط میں تفصیل سے تحریر کر چکا ہوں اور اگر آپ نے عرفان صاحب سے پوچھا ہو گا تو انھوں نے بھی ساری کیفیت بیان کر دی ہو گی۔ جب گھر کے مصارف کے لئے امجدی کو کچھ بھی نہ مل سکا، اور یہاں ماجد روزانہ مصارف کے لئے

تنگ ہوتے لگا، اور حمیدہ کی علالت نے دوا دارہ کے اخراجات بھی بڑھا دیے اور ۲۵۔ راچپور روڈ پر ڈاکٹر شرافت کی کوٹھی اسے کرایہ پر لینا پڑی، اور اس طرح ایک کی جگہ دو گھروں کا خرچ درکار تھا، مجھے تعجب ہوا کہ آپ نے مجھے کلکتہ تار دیا کہ کچھ عرصہ تک میں بنگال میں دورہ کروں جہاں ایک شخص بھی میرا دورہ نہیں چاہتا تھا، الا ماشاء اللہ ان چند لوگوں کے سوائے جنھیں ایک زبردست الیکشن ایجنٹ کی ضرورت تھی جو مفت میں ان کی مدد کے لیے کھڑا ہو جائے۔ یہی وہ قوم ہے جو آج ہماری محتاج ہے، باقی سب مستغنی ہیں۔ سعدی کو تو اسی کی فکر تھی کہ ؎

شب چو عقد نماز بربندم

چہ خورد بامداد فرزندم

لیکن نماز کی نیت باندھنا تو فرض ہے۔ ان حکومت پرستوں اور خود غرضوں کا الیکشن ایجنٹ بننا کس نے ہمارے لیے فرض مقرر کیا ہے؟ سر عبدالرحیم صاحب اور فضل الحق صاحب کے MANIFESTO میں اپنی جتھہ بندی کے سارے جتن کیے گئے، مگر مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ اور نہرو انی غضب سے بچنے کے بارے میں ایک حرف بھی نہ تھا۔ ان حضرات کا آلہ کار بننا ہمارے لیے کب فرض ہے کہ بال بچوں کو بھوکا چھوڑ کر ہم ان کے مفت کے ایجنٹ بنتے پھریں۔ حقیقتاً مجھے تو اب تک یہ بھی نہیں معلوم کہ ان خود غرضوں اور حکومت پرستوں سے شفیع داؤدی صاحب جیسے مخلص مسلمان نے آئندہ کے لیے کیا سمجھوتہ کیا ہے اور میں اگر اس وقت کام کر بھی سکتا تو ہرگز نہ کرتا جب تک یہ طے نہ ہو جائے کہ نفس پرستوں کے مقابلے میں ملت پروروں کا کس طرح انتخاب ہوگا اور جب دونوں کونسلوں میں جا بیٹھیں گے تو ہم عملی کی کیا صورت ہوگی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ آج میں کسی کام کے قابل بھی نہیں ہوں

سب سے پہلے حمیدہ کی علالت ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہ برسوں سے بیمار چلی آرہی تھی۔ اکتوبر ۱۹۲۷ء میں اسے شملے کر گیا اور اگرچہ وہاں جانے

سے فائدہ ہوا مگر میرٹھ سے لوٹنے پر ملیریا نے شملہ میں بھی آدبایا تھا اور وہاں
بھی ایک ہفتہ صاحبِ فراش ہی رہی تھی اور دہلی واپس آنے کے بعد پھر
بے اطمینانی تھی۔ ۶؍ مئی ۱۹۲۸ء کو شادی ہوئی اور ۳۰؍ مئی سے جو سلسلہ
علالت کا شروع ہوا تو آج تک جاری ہے۔ ڈاکٹر انصاری کا ہمیشہ علاج ہوا
تھا۔ منصوری میں ڈاکٹر بچر کا علاج ہوا، واپسی پر لیڈی ڈاکٹر کیمبل کا مسلسل
علاج ہوتا رہا۔ مگر فروری ۱۹۲۹ء میں حالت اور بگڑ گئی اور حالانکہ ان کا،
مس کین کا اور ڈاکٹر سنگھ کا CONSULTATION کرایا گیا اور سنگھ کا علاج ہوا
لیکن کچھ بھی اصلاح نہیں ہوئی۔ اب تک ملیریا ہی کا شبہ ہوتا رہا۔ اس کے
بعد حکیم محمد احمد صاحب کا علاج کرایا گیا مگر فائدہ نہ ہوا۔ ہاضمہ ہمیشہ سے خراب
تھا۔ قولنج کا درد برسوں سے اٹھا کرتا تھا، بہت ہی کم ایک وقت سے زائد
کھانا کھاتی تھی مگر اب تو پیچش کے سے آثار معلوم ہوئے اور آنوں آنے
لگی، جسے سنگھ نے کونین کا اثر سمجھا۔ حکیم محمد احمد خاں کی دوا سے آنوں آنا
بند ہوئی مگر نفخ نے سخت تکلیف دی۔ جب پھر ڈاکٹر انصاری اور ان کے
ساتھ ڈاکٹر قریشی کا علاج کرایا گیا تو BACILLUS COLI کا شک گذرا مگر
S. K. SEN BACTERIOLOGIST کی رپورٹ سے ثابت ہوا کہ یہ بھی نہیں
ہے۔ تاہم قیاس کیا گیا کہ اثر اسی کا ہے اور ایک پچکاری کا سلسلہ شروع ہوا
جس سے کوئی فائدہ نہ ہوا اور بخار ۱۰۲ سے بڑھ کر روزانہ ۱۰۳، ۱۰۴، اور
۱۰۵ تک پہنچ گیا۔ تب جا کر ڈاکٹر انصاری نے اس کا اقبال کیا کہ بھائی ہم اب
تک اس کے مرض کی تشخیص نہیں کر سکے۔ اتنا جانتے ہیں کہ دق نہیں ہے۔ تاہم
چونکہ ایک شب کو باہر سوتے ہوئے سردی لگی اور کچھ اوڑھا نہ گیا جس سے
خفیف سی کھانسی کی خراش پیدا ہو گئی ہے، اب ہم علاج میں پہلے کی طرح
دق کی رعایت بھی رکھیں گے۔ ایک ہفتہ علاج جاری رہے، اگر اس سے فائدہ
نہ ہو تو سول سرجن کو بلا کر دکھایا جائے تاکہ وہ کوئی آزاد رائے قائم کر سکے۔
آج وہ ہفتہ ختم ہوتا ہے اور غالباً کل سول سرجن بلایا جائے گا۔ روزانہ ۱۰۲
بخار ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ یہ امر ہے کہ غذا بالکل نہیں ہوتی گزشتہ

نصف ماہ میں مرغی کا شوربہ اور روٹی کا چھلکا بھی نہیں کھایا گیا۔ صرف علی الصبح ایک یا نصف انڈا آملیٹ کی شکل میں، ایک یا دو باریک توس اور مکھن اور ایک یا آدھا پاپا، یہ دن بھر کی کل غذا ہوگئی تھی - BULGARIAN BACILLUS CULTURE کا دہی بنا کر دیا گیا، مگر وہ بھی نہ رُک سکا - صبح سے رات تک برابر اُبکائی آتی رہتی ہے - اُبکائی روکنے کی دوا بھی اب مطلق کارگر نہیں ہوتی۔ بعض دن صبح کا ناشتہ بھی ڈال دیا جاتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس دن غذا مطلق نہیں ہوئی! عرفان صاحب کی موجودگی ہی میں حالت بیحد خراب تھی لیکن آج خراب تر ہے۔ تاہم SPUTUM کا امتحان کرایا گیا تھا۔ رپورٹ سے صرف معمولی سی کھانسی کا پتہ چلا، دق کے کوئی آثار نہیں - ایسی مریضہ کو چھوڑ کر نہ میں بنگال کا دورہ کر سکتا تھا اور نہ بمبئی آ سکتا ہوں اور جنوبی افریقہ کا تو کسی کو خیال بھی نہیں آ سکتا۔ آمنہ کی موت کے بعد ہی میں امجدی سمیت برما جانے کو تیار ہو گیا تھا مگر آپ کو TYPHOID میں موت کے منہ میں چھوڑ کر برما نہیں جا سکتا تھا، صرف کلکتہ جا سکتا تھا، اور گیا تھا۔ قوم اور ملک کا کام ساری عمر کیا ہے، کبھی اپنے عیش و آرام کے خیال نے یا کسی اور ذاتی غرض نے آج تک اس سے نہیں روکا۔ لیکن ایک جوان لڑکی کی موت کے بعد دوسری جوان لڑکی کو ایسی حالت میں چھوڑ کر میں کہیں نہیں جا سکتا۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ اس کا شوہر مجبور ہو کر اپنا روپیہ وصول کرنے کے لئے باہر مارا مارا پھرے - میں تو برما چھوڑ کر بھی حمیدہ کو دیکھنے نہیں آیا۔ گو ماجد کو اس کا رکا ہوا روپیہ دلوانے کے لئے تیار تھا کہ تھرڈ کلاس ہی میں سفر کر کے فوراً الور پہنچ جاؤں، بیشتر اس کے کہ مہاراجہ الور ولایت چلے جائیں تاہم ماجد کو تار میں لکھ دیا تھا کہ برما کے کام میں اس سے ہرج ضرور ہو گا۔ ماجد کا تار آ گیا کہ کام میں ہرج نہ کیجئے۔ یہاں پر امید بندھی ہے۔ چنانچہ میں برما نہیں گیا اور دس دن اور وہاں ضائع کیے۔ مجھے اور بھی تعجب آپ کا تار کلکتہ میں پا کر اس سے ہوا کہ آپ نے میری حالت اور میرے کو چہ چیلاں کے مکان سے نکلے جانے کا بھی مطلق خیال نہ کیا۔ آپ کے اصرار پر اور اس امید پر کہ آپ امجدی کو میرے روپیہ میں سے کم از کم اتنا

بھجوادیں گے کہ وہ کام چلاسکیں۔ برما مارچ میں چلا گیا تھا[1] مگر آپ روپیہ فراہم نہ کرسکے اور امجدی جس مصیبت میں گرفتار رہیں اس کا شاید آپ کو اندازہ نہ ہوسکا ورنہ آپ مجھے ہدایت نہ کرتے کہ برما میں اتنی دیر لگانے کے بعد وہاں سے آتے ہوئے میں بنگال میں دورہ کروں۔ کلکتہ میں خلافت کے سب سے زیادہ پُرجوش اور باثر کام کرنے والوں کا یہ حال ہے کہ میں نے اس روپیہ کو جو کمریڈ کے دوبارہ اجرا کے لیے گل شیر خاں وغیرہ نے بلا میری اجازت کے جمع کر دیا تھا۔ چند ماہ کے لیے قرض مانگا کہ جب تک کچھ کمانے کا انتظام کرسکوں، گذر اوقات ہوسکے اور انھوں نے حتمی وعدہ بھی کرلیا کہ دو تین دن میں بذریعہ تار روانہ کردیں گے، آج تک اسے روانہ کررہے ہیں۔ ایک صاحب سے پانچ سو روپیہ قرض حسنہ ملے تو اس وقت تک کام چلا اور احمد علی بھائی نے امجدی کی جائیداد میں سے پانچ سو روپیہ بھجوائے تو ماجد کے قرض میں سے دیئے ورنہ حمیدہ کے علاج کے لیے بھی کچھ نہ تھا۔ ایسی حالت میں وہ کون سا سیاسی یا مذہبی فرض ہے جس کے ادا کرنے کے لیے میں مجبور رہوں کہ بیوی بچوں کو چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوں۔

سب سے بڑی مصیبت مکان کی ہے۔ مسلم لیگ کے جلسہ کے بعد عبدالرحمٰن وکیل کے سامنے صالح صاحب نے قطعی نوٹس دے دیا کہ مکان خالی کردیا جائے چاہے انھیں کوئی زیادہ کرایہ دینے والا ملے یا نہ ملے، یا کوئی خریدار مکان خریدے یا نہ خریدے۔ آپ کو معلوم ہے کہ صالح صاحب خود ہی اس کی وجہ بھی ظاہر کرچکے ہیں اور وہ یہ ہے کہ میں وہابی اور ابن سعود کا خاص نہیں۔ ان کے الفاظ یہ تھے کہ چچا جان پسند نہیں کرتے (وہ آج کل مکہ مکرمہ میں ہیں) اور آپ اختلاف عقائد بھی رکھتے ہیں۔ گزشتہ سال تو میں نے نہ صرف اس زمانے کا تمام کرایہ، بلکہ حسب قرارداد گزشتہ دور کا بھی کرایہ اس دور کے کرایہ کے ساتھ بہ قسط پچاس روپیہ ماہوار ادا کردیا تھا اب جبکہ وہ یہ بھی نہیں کہتے کہ کوئی کرایہ دار ہم سے زیادہ کرایہ ادا کرنے کو تیار ہے یا کوئی خریدار خریدتا ہے۔ مجھ سے مکان

---

[1] برما (رنگون)، کا یہ سفر مولانا محمد علی نے مولانا آزاد سبحانی کے ساتھ مارچ ۱۹۲۹ء میں کیا تھا

خالی کرانا اس بنا پر ہے جس بنا پر عبدالحق اور انوار الحق (انوار صالح کا بہنوئی ہے، مسلم لیگ میں ہمارے خلاف اس قدر نمایاں حصہ لے رہے تھے اور جس بنا پر مولانا عبدالقادر قصوری اور پنجابی ٹولی یکایک نہرو رپورٹ کے موافق ہو گئے ہیں۔ بہرحال میں نے یہ آخری نوٹس پاکر فوراً فیصلہ کر لیا کہ ہمدرد کو بند کر دیا جائے اور اب اس مکان میں ایک دن بھی نہ رہا جائے مگر برما جانا ضروری تھا اس لیے چند مکانات کو فوراً امجدی کو دکھا کر برما چلا گیا اور امجدی سے کہہ گیا کہ ۸ مئی تک قرول باغ چلی جاؤ۔ پریس کو اکھڑوانے کے لیے ماجد، صدیق، اسرائیلی اور جعفری سے کہہ گیا کہ وہ اسے DISMANTLE کرا کے کسی GODOWN وغیرہ میں رکھوا دیں۔ حمیدہ کے لیے اس کی خواہش کے مطابق ایک ٹھنڈی جگہ کی تلاش تھی جو اس وقت قرول باغ میں نہ مل سکی، مگر ڈاکٹر شرافت ولایت جا رہے تھے۔ راجپور روڈ پر ان کا بنگلہ نصف کرایہ پر ماجد نے لے لیا اور وہ اور حمیدہ تو حسب قرارداد ۸ مئی سے گھر خالی کر کے چلے گئے مگر قرول باغ میں اس وقت کوئی اور مکان طے نہ ہو سکا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مشینوں کے اکھڑوانے، لدوانے اور کسی اور جگہ STORE کرانے کا بندوبست نہ کر سکا۔ ماجد علاوہ تیمارداری کے اپنی مصیبت میں مبتلا ہے اور رات ہی بھر اکور سے لوٹا ہے اور اب تک کچھ نہ مل سکا۔ اس کو فرصت نہ تھی۔ صدیق صاحب محض بیکار ہیں۔ اسرائیلی صاحب اور جعفری بھی اس میدان کے مرد نہ تھے، نہ اب مجھے حمیدہ کی بیماری میں اتنا ہوش ہے کہ خود کھڑے ہو کر اس کام کو کراؤں۔ جب ماجد باہر جاتا ہے (اور یہ اکثر ہوتا ہے) مجھے اور امجدی کو حمیدہ کے ہاں سونا پڑتا ہے۔ ماجد کے نوکر کی ماں کو نمونیہ ہو گیا اور وہ تار ملتے ہی امروہہ چلا گیا اس لیے اس بار تو کوئی نوکر بھی نہیں ہے۔ میرے پاس عرصہ سے کوئی نوکر نہ تھا۔ دن بھر دوا پلانا، غذا کھلانے کی کوشش کرنا، حرارت معلوم کرنا، تسلی اور تشفی دینا، ڈاکٹروں کے پاس جانا اور رات کو تھک کر حمیدہ کے پاس پڑ جانا یہ میرا دن رات کا وظیفہ ہے۔ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ اگر کسی بدمعاش نے ایک پرزہ بھی توڑ ڈالا تو ساری مشین بے کار ہو جائے گی۔ علاوہ ازیں اکھڑوانے،

PACK کرانے اور کہیں سے لدوا کرلے جانے اور STORE کروانے بیں صرف کثیر کی ضرورت ہے اور وہ ندارد، مجبور ہو کر فیصلہ کیا ہے کہ پریس کو فروخت کر دوں۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ کام آسان نہیں۔ پھر اس کی بھی DEBENTURE HOLDER سے اجازت لینا ہے اور تمام مشینوں اور ٹائپ کی فہرست تیار کرانا اور خریدنے وقت کی قیمت نکال کر اس وقت کی قیمت کا تخمینہ کرنا ہے۔ خدا بھلا کرے خان صاحب عبدالعلی خاں کا، کہ پہلے دور کے ٹائپ وغیرہ کی چوری کا تخمینہ لگانے میں انھوں نے جو کوشش کی تھی اس کے کاغذات موجود ہیں جس سے پریس کی بعض چیزوں کی اصل قیمت معلوم ہو سکتی ہے ورنہ عثمان صاحب نے تو اس بری طرح کام کیا ہے کہ کسی چیز کا پتا لگانا آسان نہیں۔ جس طرح بھی ہو رہا ہے یہ کام کر رہا ہوں۔ اگر ماجد اب چند دن تک یہاں رہے تو میں گھر جا سکوں گا لیکن یہ مہینہ بھی ختم ہو رہا ہے اور اب میں سو روپیہ ماہوار مکان کا کرایہ کس طرح اور کہاں سے لا کر دے سکتا ہوں؟ مجبور ہو کر صالح صاحب سے کہا ہے کہ پہلے دور کے خاتمہ کی طرح نیچے کا پریس کا حصہ مجھے کرایہ پر اس وقت تک کے لیے دے دیں جب تک کہ پریس دو تین ماہ میں فروخت ہو جائے۔ چار دن تک ان کے پیچھے دھوپ اور لو میں پھرتا رہا۔ کل جواب ملنے والا تھا مگر نہ ملا۔ اگر وہ اس پر راضی ہوئے تو سوائے اس کے چارہ نہیں کہ اسی مکان میں ابھی قیام کروں حالانکہ وہ اب بالکل ویرانہ کی طرح سونا پڑا ہے اور اس کا ¾ حصہ میرے لیے بے کار اور غیر ضروری ہے۔ اگر پریس والا حصہ کرایہ پر مل گیا تو کل ہی قرول باغ کے مکانوں میں سے ایک کو کرایہ پر لے کر سارا سامان ڈھونا پڑے گا۔ ایسی صورت میں جنوبی افریقہ تو درکنار، مجھے افسوس ہے کہ بمبئی تک نہیں آ سکتا۔

پھر سب سے آخر میں خود میری علالت ہے۔ یقین جانیے کہ میں سخت بیمار ہوں۔ جنوبی افریقہ کا سفر ممکن تھا کہ میری صحت کے لئے بے حد مفید ہوتا۔ مگر میری گوناگوں مجبوریوں نے اس کا خیال ہی دل سے نکال دیا۔ لیکن اب میں درحقیقت کہیں بھی نہیں جا سکتا، اگر حمیدہ اچھی ہوتی اور پیسہ پاس ہوتا تو جا کر کسی گوشہ میں

پڑ جاتا اور اپنا علاج کراتا ۔ لاہور جاکر وہاں ایک مشہور و معروف حکیم صاحب جن سے مہر و سالک نے مجھے ملایا تھا، علاج کروانے کا اپریل میں وعدہ تھا۔ اب چاہتا تھا کہ ہر ہفتہ ایک دن کے لیے وہاں چلا جایا کروں مگر حمیدہ، مکان، پریس اور مالی حالت سب نے مجبور کر دیا کہ دہلی ہی میں قیام کروں اور حکیم نذر احمد صاحب سے جو حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں برسوں سے ان کے نسخے لکھا کرتے تھے، علاج کراؤں ۔ وہی حمیدہ کو بھی دیکھ چکے ہیں، اور سول سرجن کے علاج سے بھی فائدہ نہ ہوا تو ان سے یا الور کے حکیم صاحب سے جو الور سے علیحدہ ہو کر دہلی آگئے ہیں، حمیدہ کا بھی علاج کرایا جائے گا۔ برما میں COL. SAINGAL, I.M.S., EYE. SPECIALIST کو آنکھ دکھائی تھی۔ سوائے اس کے کہ غالباً پانی آرہا ہے وہ کچھ نہ کہہ سکے، نہ علاج کر سکے اور کہا کہ دہلی میں تھوڑے عرصے کے بعد ڈاکٹر کو آنکھ دکھاتے رہنا چنانچہ ڈاکٹر بشیر کو سول ہاسپٹل جاکر گھنٹہ سوا گھنٹہ تک آنکھ دکھائی۔ سب ذیابیطس کا اثر ہے اور پانی آرہا ہے جب بالکل آجائے گا تو آپریشن ہو سکے گا۔ لیکن ایک ذیابیطس کا آپریشن ملک الموت کے لیے پھاٹک کھول دیتا ہے، اس لیے ممکن ہے کہ کوئی اور طریقہ علاج کا ڈھونڈا جائے۔ پاؤں میں احساس کی کمی روز کم ہوتی جاتی ہے اور اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکڑی کے پاؤں ہیں۔ مگر افسوس کہ لکڑی کے بھی نہیں کہ درد سے تو بچوں اور آپریشن کا تو اندیشہ نہ رہے ۔ ایسی حالت میں مجبور ہوں کہ کوئی کام نہیں کر سکتا اور گو بمبئی آنے کا قطعی ارادہ تھا اور [1] پر روشنی ڈالنے کا تہیہ کر چکا تھا مگر ان مختلف مجبوریوں کے باعث اس INQUIRY میں بھی شریک نہیں ہو سکتا۔ حقیقتاً اگر یہ INQUIRY بجائے بمبئی کے دہلی میں بھی ہوتی تو اس کے لیے وقت نکالنا مشکل ہوتا۔

اب تک پریس کے فروخت کرنے کی اجازت DEBENTURE HOLDERS سے لینے اور اس کے گاہک فراہم کرنے کا کام بھی مطلق نہیں کر سکا ہوں۔ خود

---

[1] یہ لفظ پڑھا نہیں گیا۔

مُردوں کی طرح ہوں اور ایک اپنے سے بھی سخت تر علیل لڑکی کی تیمارداری میں مصروف ہوں اور نہیں جانتا کہ کل کو میرا رزاق میرا رزق کہاں سے دلوائے گا۔ ایسا آدمی سب قومی کاموں سے معذور ہے اور مجھے معذور سمجھیے اور میرے لیئے دعا کیجیے۔

میرا آئندہ کے لیے یہ پروگرام ہے کہ ان موجودہ مشغولیتوں سے پیچھا چھڑاؤں، قرول باغ میں رہوں اور دو کتابیں ایک انگریزی اور ایک اردو میں لکھوں، دونوں اسلام کے متعلق اپنے خیالاتِ پریشاں کا مجموعہ اور ان سے بیشتر زیادہ تر سال بھر کی روٹی پیدا کرنے کے لیے، اپنا سفرنامہ دو تین ماہ میں کہہ ڈالوں اور چھپوا دوں۔ دیکھیے کہ اس کے لیے بھی فرصت اور سرمایہ نصیب ہوتا ہے یا نہیں۔ اس وقت تو کل کے کھانے کو بھی کچھ نہیں۔

انتر سوں شام کو دو مسلمان نوجوانوں سے جو DAILY CHRONICAL میں کام کرتے ہیں، معلوم ہوا کہ شاہ امان اللہ خاں اور ان کے رفقا اور عزیز دہلی سے صبح کو گذریں گے۔ چیف کمشنر سے ٹیلیفون پر دریافت کرنے پر اس کی تصدیق ہوئی اور معلوم ہوا کہ اگر میں جا کر ملنا چاہوں تو کوئی روک ٹوک نہیں ہے اور اگرچہ وہ خود اسٹیشن پر نہ ہوں گے، نہ حکومت دہلی کی طرف سے کوئی اور شخص، تاہم پولیس کے عہدہ دار انتظام کے لیے موجود ہوں گے اور MAJOR WICKHAM کوئٹہ سے ہمراہ آرہے ہیں ان سے ملنا کافی ہوگا۔ چنانچہ ۶ بجے گھر پہنچ کر کپڑے بدلے اور سوا چھ بجے اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ معلوم ہوا کہ گاڑی پانچ گھنٹے دیر سے آرہی ہے۔ احتیاطاً اسٹیشن والوں سے کہہ گیا کہ اگر کچھ وقت گاڑی بچا سکے اور پہلے آنے والی ہو تو ماجد کے ایک پڑوسی کے ہاں مجھے ٹیلیفون کر دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یہ خبر پا کر کہ ٹرین دس بجے پہنچ جائیگی میں سوا نو بجے ماجد کے مکان سے چل کر ۹½ بجے اسٹیشن پہنچ گیا۔ ہندو اخبارات INTERVIEW مانگتے تھے مگر میں نے پیچھا چھڑایا۔ دس کے قریب یکایک اسپیشل آگئی ہر شخص کو اجازت تھی کہ پلیٹ فارم پر آئے اور پولیس کا صرف اسی قدر انتظام تھا کہ جب گاڑی رک گئی اور اس میں سے بلوچستان کے مسلح پولیس والے دس بیس

آدمی نکلے تو تماشائی چند قدم پیچھے کھڑے کر دیے گئے۔ میں نے MAJOR WICKHAM سے ملاقات کر کے اعلیٰحضرت سے ملنے کی خواہش ظاہر کی جو ان کے وزیر تک پہنچا دی گئی مگر MAJOR WICKHAM نے کہا کہ غالباً وہ کسی سے نہ ملیں گے۔ ان کے پاس کپڑے تک نہیں ہیں اتنے میں ان کے چند رفقا اور عزیز گاڑیوں سے اتر کر دوسری گاڑیوں میں جانے والے تھے۔ میں نے سب کو سلام کیا۔ انہی میں امیر یا سردار عنایت اللہ خاں بھی تھے جن کی شکل حبیب اللہ خاں سے کسی قدر ملتی ہے اور جسم بھی بھاری پڑ رہا ہے اور چہرہ بھی گول ہے۔ مجھ سے مصافحہ کیا، مگر جب میں نے ہاتھ کو بوسہ دینا چاہا تو ہاتھ شرافت کے ساتھ کھینچ لیا۔ میرا مزاج پوچھا، میں نے کہا کہ اچھا نہیں ہوں، پوچھا بیمار ہو؟ میں نے بیمار اور اس سے زیادہ سوگوار، اسلام، مسلمانانِ عالم، ایشیا، افغانستان، ہندوستان اور ان کے خاندان کے حال پر۔ حسرت بھرے لہجہ میں شکریہ ادا کر کے جلد رخصت ہو گئے۔ اس وقت ان لوگوں سے زیادہ گفتگو کرنا بھی انھیں تکلیف پہنچانا تھا اس لیے میں نے عنایت اللہ صاحب کو روکنا نہ چاہا۔ اس کے بعد عبدالہادی خاں صاحب سے بھی ملاقات ہوئی، خود ہی کہا کہ میں عبدالہادی ہوں، میں نے ان کے ہاتھ کو بوسہ دیا، انھوں نے میرے ہاتھ کو، میں نے کہا کہ اعلیٰحضرت کو اگر اطلاع دے دی جائے کہ میں خراج ہمدردی لے کر حاضر ہوا ہوں تو ممنون ہوں گا، کہا ضرور عرض کر دوں گا۔ اس کے بعد لالہ گردھاری لال اور "تیج" کا سینولیا" دیش بندھو" گپتا اور ہندوستان ٹائمز کے اڈیٹر صاحب جناب مسٹر ساہنی اور چند اور ہندو اور بھیا احسان اور فری پریس وغیرہ کے چند نمائندے آ گئے اور کچھ کیمرہ والے بھی، اور عبدالہادی خاں صاحب سے کہا کہ ہم ہنود کی طرف سے حاضر ہوئے ہیں اور ملنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ کیا کسی PUBLIC MEETING میں ان کا اس کام کے لیے انتخاب ہوا تھا، تو کہا کہ جلسہ کیسا؟ ہمیں تو صرف گھنٹہ بھر پیشتر ورودِ اعلیٰحضرت کا علم ہوا ہے۔ اعلیٰحضرت نے ان کے لائے ہوئے تھوڑے سے پھل قبول کر لیے اور بلا ملے ودے ان کا شکریہ ادا کر دیا۔ عبدالہادی خاں نے مجھ سے آ کر بھی کہا کہ اعلیٰحضرت مشکور

ہیں اور انھوں نے یا ان کے کسی اور ساتھی نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ کی ہمدردی تو آج کی نہیں ہے، بلکہ ہمیشہ کی ہے۔ دوبار غلام جیلانی خاں سے ملا۔ عبدالہادی خاں تو معمولی پشاور کا سا لباس پہنے ہوئے تھے۔ البتہ زیادہ تر لوگ نیلگوں GREY رنگ کی کسی سوتی کپڑے کی جودھپوری برجیس پہنے ہوئے تھے، جو ممکن ہے کہ MILITARY UNIFORM ہوں۔ امیر عنایت اللہ خاں، غلام جیلانی خاں دونوں کوٹ اتارے ہوئے تھے اور غالباً شہزادے بھی کوٹ اتارے ہوئے تھے اور ننگے سر۔ گرمی بہت محسوس کر رہے تھے۔ غلام جیلانی خاں کی تو داڑھی بھی چار پانچ دن سے نہیں منڈی تھی اور ٹھڈی پر ذرا سی بوکچیا داڑھی تھی، اس کے لگ بھگ منڈی ہوئی داڑھی بھی آ پہنچی تھی۔ عبدالہادی خاں اور غلام جیلانی خاں دونوں نے انکار کیا کہ جس طرح CIVIL & MILITARY میں چھپا تھا کوئی لڑائی ہوئی اور شاہ امان اللہ خاں کے ڈھائی ہزار آدمی مارے گئے۔ انھوں نے کہا کہ کوئی جنگ نہیں ہوئی اور اعلیٰحضرت نے خوں ریزی سے احتراز کیا اور جنگ نہیں کی۔ غلام جیلانی خاں نے مجھ سے شکایت کی کہ تم انگورا گئے اور مجھ سے نہ ملے میں نے کہا کہ پورا ارادہ تھا لیکن جب مصطفیٰ کمال پاشا نے اس قدر بیہودگی کی تو مجھے بے حد غصہ آیا اور میں فوراً چل دیا اور بھول گیا کہ ابھی آپ سے ملا بھی نہ تھا۔ جب ریل چل دی تب یاد آیا اور نادم ہوا۔ میں نے لجاجت سے ان سے معافی چاہی اور پوچھا کہ کیا انھوں نے میرے بیان کو باور کر کے مجھے معاف کر دیا۔ تو انھوں نے کہا کہ ہاں، آپ معذور تھے۔ میں نے غلام نبی خاں صاحب کا اپنے ساتھ دہلی میں کھانا کھانے کا ذکر کیا اور پھر ان کے ساتھ پیرس میں افغانی کھانا کھانے کا ذکر کیا۔ کہا کہ مزار شریف ان کے قبضہ میں ہے اور وہ وہیں ہیں۔ میں خود قندھار صرف پانچ دن پہلے آیا تھا۔ کہا کہ توفیق رشدی بک سے تمھاری ساری گفتگو سنی تھی۔ وہ مجھ سے ملے تو اچھی طرح، مگر میں سمجھتا ہوں کہ وہ رک کر ملے اور سوائے FORMAL COURTESY کے اور کچھ نہ تھا۔ شاہ امان اللہ صاحب کے اس طرح شکریہ ادا کرنے سے میں نے سمجھ لیا کہ وہ ملنا نہیں چاہتے یا ان سے کوئی عہد لے لیا گیا ہے کہ کسی سے نہ ملیں۔ میں نے غلام جیلانی خاں سے جب کہا

کہ میں ہدیۂ ہمدردی پیش کرنا چاہتا ہوں تو کہا کہ میں وزیر صاحب سے کہے دیتا ہوں، مگر میرا خیال ہے کہ یہ بھی ٹالنے کے لئے تھا۔ دونوں بار انہوں نے خود ہی رخصت ہونے کے الفاظ استعمال کئے، جس سے مجھے محسوس ہوا کہ وہ زیادہ گفتگو سے بھی گھبراتے ہیں۔ البتہ ایک اور شخص جس کے خشخاشی داڑھی تھی اور جو عربی بھی بولتا تھا اور فارسی بھی، وہ نہایت محبت اور جوش سے ملا۔ اس کے ذریعہ میں نے عنایت اللہ خاں کو بھی اطلاع بھجوائی کہ اگر ممکن ہو تو میں مل لوں۔ اس نے تھوڑی دیر بعد آکر جواب دیا کہ وہ سخت متاسف ہیں۔ کوئی جگہ نہیں جہاں مجھے بلوا کر وہ گفتگو کر سکیں۔ ایک SALOON CARRIAGE میں وہ اور ان کی مستورات تھیں اور ایک میں شاہ امان اللہ خاں اور ان کے بال بچّے اور ان دو SALOON CARRIAGES کے علاوہ چند فرسٹ کلاس کے درجوں میں اور لوگ تھے۔ ایک DINNING CAR بھی تھی اور SALOON CARRIAGES میں بھی KITCHEN کے درجے تھے مگر ایک آدھ نوکر کے سوا اس میں کچھ نہ تھا۔ دہلی کے اسٹیشن پر مسلم ریفریشمنٹ روم سے کچھ کھانا پک کر گیا تھا، اور میں نے اسٹیشن سپرنٹنڈنٹ کو یہ کہتے سنا تھا کہ چند دُنبے انھوں نے منگائے ہیں، وہ بھی چڑھانے کے لیے تیار ہیں۔ ڈپٹی کمشنر گاڑی آنے کے بعد ہی آ گیا تھا اور غالبًا سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی۔ ڈپٹی کمشنر کے ساتھ دو نئے چھوٹے چھوٹے ہندوستان کے بنے ہوئے SUIT CASES تھے اور دو نہایت ہی سستے CUSHIONS جن پر نہ جھالر ٹانکی گئی تھی نہ ریشم کا کوئی COVER وغیرہ تھا، بالکل اس طرح کے جس طرح کے کہ کوئی مسافر اسٹیشن پر خرید کر سر کے نیچے بطور تکیہ کے رکھے۔ نہ معلوم کسی کے پاس بستر بھی تھے یا انہی تکیوں پر تکیہ کرنا پڑا تھا۔ BAGGAGE کہیں کچھ بھی نظر نہ آیا۔ صرف ایک جگہ نوکروں کے پاس ایک آدھ چمڑے کا ولایتی CABIN TRUNK تھا اور نہ معلوم وہ میجر وکیم کا تھا یا شاہ امان اللہ خاں کے رفقائے سفر میں سے کسی کا۔ بعد کو سنا ہے کہ چند جوڑے جوتوں کے بھی بازار سے لائے گئے تھے۔ پانچ چھ سلیں برف کی ٹرین کے رُکتے ہی رکھوا دی گئی تھیں۔ ٹرین کے رُکنے کے بعد ہی شاہ امان اللہ

خاں کی گاڑی کی کھڑکیاں اندر سے چڑھا دی گئی تھیں لیکن پلیٹ فارم کی دوسری طرف میں نے لوگوں کو اس طرح کھڑا دیکھا کہ گویا اُدھر سے کھڑکی کھلی ہوئی ہے اور کچھ دکھائی دے رہا ہے۔ چنانچہ میرے آدھ گھنٹہ کھڑا رہنے کے بعد ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ دوسری طرف کی کھڑکی کھلی ہوئی ہے اور امان اللہ خاں نظر آرہے ہیں، مگر میں نے اُدھر جانا مناسب نہ سمجھا۔ ان کو اس حالت میں دیکھنا ہم دونوں کے لیے تکلیف دہ ہوتا۔ اس لیے میں ان کی گاڑی کے قریب ہی بادرچی خانہ کی گاڑی کے دروازے پر کھڑا رہا جہاں سے کہ ان کے وزیر وغیرہ ان کے درجہ میں جلتے تھے۔ طارق میاں میرے ساتھ رہے اور نہایت مؤدب اور خاموش کھڑے رہے اور دو تین وزیر صاحب اور دوسرے لوگوں سے معانقہ بھی کیا۔ عنایت اللہ خاں صاحب کے SALOON کی کھڑکیاں بھی بند تھیں۔ ٹرین پورے گھنٹہ بھر کے بعد دہلی سے روانہ ہوئی۔ نہ معلوم آپ COLABA گئے تھے یا نہیں۔ میں نے عبدالہادی خاں صاحب اور غلام جیلانی خاں صاحب سے جنھوں نے آپ کے متعلق پوچھا کہہ دیا کہ آپ بمبئی میں ہیں، اور انشاء اللہ ضرور ملاقات کریں گے۔

یہ تمام منظر میرے لیے سخت دردانگیز تھا اور میری آنکھوں میں بار بار آنسو ڈبڈبا آتے تھے۔ "ملک الملک توتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل من تشاء بیدک الخیر انک علیٰ کل شئ قدیر[۱]" دیکھیے اب افغانستان کا کیا حشر ہوتا ہے اور ہندوستان پر اس کا ردِ عمل کیا ہوتا ہے۔ اب اس طول طویل داستان کو ختم کرتا ہوں

---

[۱] سورہ آل عمران کی آیت ۲۵ "قل اللھم" کے ساتھ۔ پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے اے پیغمبر! تم اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کردو اور) کہو "خدایا! شاہی وجہاں داری کے مالک! تو جسے چاہے، ملک بخش دے، جس سے چاہے ملک لے لے، جسے چاہے عزت دے دے، جسے چاہے ذلیل کردے۔ تیرے ہی ہاتھ میں ہر طرح کی بھلائی کا سررشتہ ہے۔ اور تیری قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں۔

چار پانچ دن ہوئے اسے شروع کیا تھا اور ۱۲ صفحہ لکھ کر چھوڑنا پڑا تھا۔ آج صبح سے بغیر غسل و وضو و منہ دھونے کے اسے شروع کیا تو اس وقت جب کہ ایک ناشتہ نہ کرنے والے شخص کو سوا بارہ بجے سخت بھوک لگ رہی ہے، ختم کرتا ہوں۔ یہ خلافت میں ہرگز ہرگز شائع نہ کیجئے گا۔ صرف دوست احباب کو دکھایا جا سکتا ہے، اور وہ بھی اگر آپ کو اس کی ضرورت محسوس ہو، ورنہ صرف آپ کے لیے لکھا گیا ہے۔ خدارا صورتِ حالات کے سمجھنے میں غلطی نہ کیجیے۔ نہ میں خدا سے مایوس ہوں، نہ اپنے نفس سے، لیکن اس وقت جو فیصلہ کیا ہے وہی صحیح ہے، خلافت کے کام کے لیے ہر وقت حاضر ہوں۔ الّا ماشاء اللہ، جب آج کی سی مجبوریاں دہلی میں قید کر دیں۔ ڈاکٹر انصاری کا خط پڑھا۔ خدا اس شخص پر رحم کرے۔ اسے سوائے اپنے دنیا میں کوئی مظلوم اور معصوم نظر ہی نہیں آتا۔ اب آپ کسی کی خوشامد نہ کیجیے۔ یہ آپ کی غیر ضروری بلکہ نامنا سب فروتنی ہی تھی جس نے پہلے مجھے اور اب آپ کو بھی گالیاں دلوائیں۔ سب کا سلام

آپ کا پریشاں حال بھائی
محمد علی

مولانا عبدالباری فرنگی محلی

(۱)

⑪

قبلہ وکعبہ![1]

السلام علیکم۔ ابھی سرکار[2] سے آرہا ہوں اور چونکہ رجسٹری شدہ ڈاک میں چند منٹ باقی ہیں اس لیے عریضہ لکھے دیتا ہوں سرکار نے کچھ نہیں کہا۔ صرف یہ پوچھا کہ اطلاع مل گئی یا نہیں؟ میں نے کہا کہ جی ہاں۔ فرمایا، پھر؟ میں نے کہا میں تو لکھ چکا ہوں کہ جو حکم ہو سر آنکھوں پر، ہز آنر صاحب کا حکم میں نہیں مانتا۔ سرکار کا حکم ہے۔ میں ان سے واقف نہیں ہوں۔ کہا، پھر؟ میں نے بھی کہا تھا مگر لاٹ صاحب[3] کو شک تھا۔ میں نے کہا کہ اس میں شک کی جگہ ہی نہیں ہے۔ وہ میرے اشارے کے خلاف نہ چلیں گے۔ پھر فرمایا کہ لاٹ صاحب نے کہا کہ آپ ان سے قطع تعلق کر دیجیے۔ اُس پر میں نے کہا کہ یہ ناممکن ہے۔ وہ میری رعایا ہیں۔ ان کا خاندان مدتوں سے میری ریاست کا ایک جزو ہو گیا ہے تو لاٹ صاحب نے کہا کہ خیر آپ اُن کو آیندہ جرأت نہ دلائیں۔ سرکار نے فرمایا کہ یہ کیا بات ہے۔ آیندہ آپ کو شکایت کا موقع نہ ملے گا۔ آج ہی تار دے رہے ہیں کہ محمد علی آیا ہے۔ شوکت علی اور محمد علی دونوں کو مفصل کیفیت سمجھا دی ہے آیندہ اطمینان رکھیں شکایت کا موقع نہ ملے گا محمد علی آپ کے پاس حاضر ہونا چاہتا ہے، کب بھیجوں۔ میں نے تار میں ایسا کوئی

---

[1] یہ خط مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے نام ہے جو انھوں نے نواب رام پور سے ملاقات اور نواب صاحب کی اور لفٹنٹ گورنر کی ملاقات اور گفتگو کی کیفیت اور یقین دہانی کے بارے میں لکھا تھا۔ لیکن محمد علی کے جوش اور ملّی غیرت نے یہ یقین دہانی پوری نہ ہونے دی اس کے بعد حکومت نے جو کچھ ان کے ساتھ کیا وہ بھی ڈھکا چھپا نہیں رہا۔

[2] سرکار سے مراد نواب صاحب رام پور سر حامد علی خاں ہیں۔

[3] لاٹ صاحب سے مراد گورنر یوپی ہے

لفظ نہیں آنے دیا کہ جو آپ فرمائیں گے وہی وہ کرے گا۔ گویا "گزشتہ را صلوٰۃ، آئندہ را احتیاط"!

محمد علی

رام پور ۱۱ر دسمبر ۱۹۰۷ء

(۲)

(۱۲)

دہلی ۲۱ر دسمبر ۱۹۱۴ء

جناب والا ۔ والا نامہ صادر ہوا تھا مگر میں ایسے مکروہات میں پھنسا رہا کہ فوراً جواب نہ دے سکا۔ جو مسودہ جناب نے بھائی صاحب[2] کو بھیجا تھا۔ وہ بھی میں نے دیکھا۔ حالات و واقعات اس عرصے میں اس قدر تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں کہ جیسا آپ کا خیال ہے بہت جلد کارروائی کرنے کی ضرورت ہے دو واقعات حال ہی میں ایسے پیش آئے ہیں جو غالباً اس وقت تک پیش نہیں آئے تھے ۔ جب جناب نے مسودہ تیار کیا ہوگا۔ صوبجات متحدہ کے مشہور ڈپٹی کلکٹر خان بہادر قاضی عزیزالدین نے کچھ عرصہ ہوا ایک پمفلٹ شائع کیا ہے۔ جس کا نام انھوں نے "ترکوں کی حماقت" رکھا ہے ۔ اس پمفلٹ میں تحریک کی گئی ہے کہ مسلمانانِ ہند متفقہ طور پر گورنمنٹ سے درخواست کریں کہ وہ خادم حرمین شریف ہو جائے ۔ اور ارضِ پاک پر اپنی سلطنت قائم کر دے اس کے متعلق میں نے حضور وائسرائے کو بذریعہ پرائیویٹ سکریٹری ایک تحریر بھیجی ہے جس کا نہایت خشک جواب بھیجا گیا ہے ۔ اور میری تحریر ہوم ڈپارٹمنٹ میں بھیج دی گئی ہے ۔ اب تک وہاں سے کوئی جواب نہیں آیا اس لیے کل میں نے ہوم ڈپارٹمنٹ کو بھی خط لکھا ہے ۔ اب تک اس معاملے پر جتنی خط و کتابت ہوئی ہے ۔ اُس کی نقل ہمرشتہ عریضہ ہذا ارسال خدمت ہے۔

---

[1] مولانا محمد علی کی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہو چکا تھا لیکن ابھی تنبیہ و سرزنش کا دور تھا۔ سزا، نظر بندی اور قید کا دور اس کے بعد آیا۔

[2] یعنی مولانا شوکت علی

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ کل بذریعہ اخبارات اطلاع ملی ہے کہ مصر آخر کار برطانیہ کی زیرِ حمایت لے لیا گیا۔ اور عثمانی سیادت ختم ہو گئی اِن واقعات کے بعد صورتِ حال اور بھی نازک ہو گئی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ان معاملات کے ان پہلوؤں پر لحاظ کر کے ایک تفصیلی مسوّدہ مرتب کرنے کی ضرورت ہے، جس میں اپنے محسوسات اور جذبات کا صاف صاف اظہار کیا جائے اور حفظِ ماتقدم کے خیال سے نہ صرف موجودہ حالات کے متعلق بلکہ ان نتائج کے متعلق بھی جو ان حالات سے پیدا ہو سکتے ہیں پوری صاف گوئی سے کام لیا جائے۔ یوں تو سیاسی معاملات کے متعلق بہت سے لیڈر ہر قوم میں ہوا ہی کرتے ہیں۔ لیکن ہماری زندگی کا سب سے اہم سوال مذہبی ہے۔ اور اس میں ہماری کوئی تحریک اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک مقدس گروہ علمار میں سے کوئی ہمارا سردار نہ ہو۔ جناب کو مشورہ دینا ہی سوءِ ادب ہے لیکن اب وقت آگیا ہے کہ پوری طرح یہ محسوس کرا دیا جائے کہ جہاں مذہب کا تعلق ہے وہاں ہم پر کسی دوسری طاقت کا اثر نہیں ہو سکتا۔ اپنی تحریر میں اس امر کو صاف الفاظ میں کہہ دینے کی ضرورت ہے کہ کہیں خدانخواستہ قسطنطنیہ بھی ترکوں کے ہاتھ سے نکل جائے تو بتقاضائے اخوت اسلام اُس کا رنج ہو گا۔ لیکن وہ تکلیف اُسی قسم کی تکلیف ہو گی جیسی کہ ایک بھائی کو دوسرے بھائی کی مصیبت دیکھ کر ہوتی ہے لیکن جیسا کہ عرصے سے کہا جا رہا ہے کہ اگر ترکوں کی سلطنت کو نیست و نابود کر کے عرب میں ایک چھوٹی سی سلطنت زیرِ سیادت برطانیہ قائم کر دی گئی یا ارضِ پاک کو نئے سلطان مصر کی مملکت میں شامل کر دیا گیا تو اُس وقت مسلمانوں کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اب ارضِ پاک بھی ہاتھوں سے گئی۔ ایک چھوٹی سی سلطنت جو چاروں طرف غیر اقوام کے حلقہ اثر میں محصور ہو حفاظت کعبہ کا کیا حق ادا کر سکتی ہے۔ یہ حقیقت اس عربی خلافت کی ہے جس کی تحریک سال ہا سال سے جاری ہے۔ بلجیم کا حشر صاف بتا رہا ہے کہ ایک چھوٹی سی سلطنت خواہ کتنی ہی آزاد کیوں نہ ہو اُس سلطنت کی آزادی برائے نام آزادی ہوتی ہے۔ مصر کی گزشتہ تاریخ سے

بھی صاف نظر آتا ہے کہ باوجودیکہ نام کے لیے آج بھی مصر عثمانی سیادت میں تھا لیکن جو حالت تھی وہ ہر شخص جانتا ہے۔ لارڈ کرزن نے بھی اپنے مشہور لکچر میں جو انہوں نے سرحدوں کے مختلف اقسام پر آکسفورڈ میں دیا تھا کہا تھا۔ "تدبر سیاسی کی اختراع کردہ سرحدوں کی اشکال و مصنوعات کا یکساں رجحان اس طرف ہے کہ کمزور شکلیں زیادہ شدید شکلوں میں بدلتی رہیں۔ حلقہائے اغراض حلقہ ہائے اثر کی شکل میں مبدل ہونے کی جانب اور عارضی اجارے دوامی اجاروں کی شکل میں مبدل ہونے کی جانب مائل رہتے ہیں۔ حلقہ ہائے اثر صیانت کی شکل اختیار کرنے کی طرف اور صیانت الحاق کامل کا پیش خیمہ ہونے کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اگر آج خدانخواستہ مصر کی عثمانی سیادت ٹوٹنے کے بعد عربوں کی خلافت قائم کرالی گئی تو کیا نتیجہ ہوگا۔ یہ مان بھی لیا جائے کہ ارضِ پاک کے حدود قائم کرکے اُس کو آزاد کہا جائے گا۔ لیکن کیا کوئی شخص بھی یقین کرسکتا ہے کہ اس صورت میں مسلمان اُس حکمِ ربّی کی "انما المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامھم ھذا[۱]" تعمیل اسی طرح کر رہے ہوں گے جس طرح کہ رسولِ مقبولؐ پر وحی نازل ہونے کے وقت سے آج تک کر رہے ہیں۔

ایک اہم مسئلہ حاجیوں اور زائرین سے متعلق ہے۔ ۴ نومبر کو اخبارات میں حرمین شریفین کی حفاظت کے متعلق سرکاری اعلان شائع ہوا تھا اس کی ایک نقل خدمت میں بھیجتا ہوں۔ اب غور سے دیکھا تو اس اعلان کے الفاظ اس قدر مبہم معلوم ہوتے ہیں جن سے تشفی ہونا کیا معنی ایک قسم کا اندیشہ معلوم ہوتا ہے۔ یعنی "یہ مقاماتِ مقدسہ برطانیہ کی بری و بحری فوجوں کے حملوں اور

---

[۱] سورہ توبہ کی آیت ۲۸، یا ایھا الذین آمنو کے اضافہ کے ساتھ۔ ترجمہ یہ ہے "مسلمانو! حقیقتِ حال اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مشرک نجس ہیں (یعنی شرک نے ان کے دلوں کی پاکی سلب کرلی ہے)، پس چاہیے کہ اب اس برس کے بعد (یعنی سنہ ۹ھ کے بعد سے) مسجد حرام کے نزدیک نہ آئیں۔

کارروائیوں سے مامون و مصئون رہیں گے تاوقتیکہ اِن مقامات و مزارات کے ہندوستانی زائرین سے تعرض نہ کیا جائے"۔ اس سال جو حاجی یا زائرین گئے تھے اُن کی واپسی کا انتظام تو ہو گیا ہے لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ جنگ چھ سال تک جاری رہے گی تو کیا دورانِ جنگ میں ترک ہندوستانی زائرین کو بربنائے مصلحتِ جنگی عرب میں آنے سے نہ روکیں گے۔ جنگ نے اگر طوالت پکڑی تو اُن کو یقیناً ایسا کرنا پڑے گا تو کیا اعلان مندرجہ بالا کے بموجب برطانوی افواج زائرین کے لیے راستہ صاف کریں گی۔ ہندوستان میں اس وقت باہر سے آنے والے کی جس قدر جانچ کی جاتی ہے اور درحقیقت یہ تو جنگ کی بڑی صورتوں میں سے ہے غرض کہ یہ ایک ایسی گتھی ہے جس کو فوراً سلجھانے کی ضرورت ہے ورنہ خدا جانے آیندہ ارضِ پاک کے متعلق کیا صورت پیش آئے ان تمام مشکلات پر اس وقت ہمیں کافی غور کر لینا چاہیے اور طے کر لینا چاہیے کہ آیندہ کیا ہو۔ اوّل تو ہندوستان کے مسلمان خود ہی دورانِ جنگ میں حج و زیارت کی غرض سے نہ جائیں گے اور نہ ان پر جانا فرض ہے۔ حال ہی میں اکثر اشخاص خود مصر میں آنے سے روکے گئے۔ مثلاً محمد علی پاشا، عمر طولون وغیرہ مصر میں داخل ہوتے ہی روک دیے گئے۔ خود خدیو نے ایک جرمن اخبار میں شائع کرایا ہے کہ وہ مصر میں آنے سے روکے گئے۔ ایسی حالت میں ہندوستانی زائرین کے دورانِ جنگ میں جانے پر کیوں اصرار کیا جائے[1]۔ قاضی عزیزالدین کے پمفلٹ نے ہوا کا رخ بتا دیا ہے اور اس وقت ہم لوگوں کا خاموش رہنا خودکشی سے کم نہیں۔ اب جو مسوّدہ جناب تیار فرمائیں اس میں ان تمام امور کا جو میں نے عرض کیے ہیں خاص خیال رکھا جائے۔ اس سال راولپنڈی کے اجلاس کانفرنس[2] میں جناب کی شرکت بہت ضروری ہے کیونکہ وہاں بہت سے احباب

---

[1] جنگ عظیم اوّل کی وجہ سے حج و زیارت کے لیے سفرِ حجاز، سفرِ بیت المقدس، سفرِ عراق میں زائرین کے عدم تحفظ کی وجہ سے یہ صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ جس پر محمد علی نے یہاں روشنی ڈالی۔

[2] کانفرنس سے مراد آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ہے۔ یہ اجلاس خان بہادر مولوی رحیم بخش کی صدارت میں ہوا تھا۔

سے تبادلۂ خیالات کا موقع ملے گا اور اس نازک زمانے میں بہتر ہو کہ جناب ۲۴ر تاریخ تک راولپنڈی ضرور بضرور تشریف لائیں۔

آپ کا عزیز نیاز مند
محمد علی

(۳)

⑭

پھنڈواڑہ ۳۰ر مئی ۱۹۱۶ء

حضور اقدس، السلام علیکم

عرصہ سے حضور کی خدمت میں کوئی عریضہ نہ لکھ سکا، کچھ تو علالت کچھ کاہلی اس کا باعث ہوئیں، شکر کا عجب حال ہے، میں نے حکیم اجمل خاں صاحب کی دوا ترک کرکے یہاں کے سول سرجن صاحب کا علاج شروع کر دیا تھا، اس سے اس قدر فائدہ ہوا کہ شکر ½۵ سے ½۲ فی صدی تین سے چار ہی روز میں رہ گئی مگر دوا نہ رہی، دہلی سے تار دے کر منگائی۔ اس عرصے میں پھر شکر ۶ فی صدی ہوگئی، اب دوا آگئی ہے، سول سرجن صاحب ہی کا علاج ہے، پیشاب کی مقدار کم ہوگئی ہے، جو مرض کی کمی کی نشانی ہے، آئندہ جمعہ کو قارورہ پھر بھیجوں گا، تاکہ شکر کی مقدار معلوم ہو جائے، یہاں امسال گرمی سخت پڑی جس سے مرض بڑھ گیا اور دو بار حرارت بھی ہوگئی، اس خوف سے کہ مبادا انتقال قیام اس کوردہ سے بھی بدتر جگہ کو نہ کر دیا جائے رجیسا کہ اب تک تجربہ ہوا ہے، میں نے یہیں گرمیاں گذارنا مناسب سمجھا ع

از دوزخیاں پرس کہ اعراف بہشت است

کیا عجب ہے کہ اس صبر کے باعث میرے دوزخ میں سے چند انگارے کم کر دیے جائیں، گو کہ اس پاک پروردگار سے جو گناہوں کا بخشنے والا ہے، امید ہے کہ بطفیل رسولِ اکرمؐ دوزخ کی آنچ کو ہم پر حرام فرما دے گا۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جو افواہیں حضور اقدس کے متعلق دشمنوں نے

اڑائی تھیں، ان کا نتیجہ سوائے ان کے خذلان کے کچھ نہ نکلا، یہ وہ ہوائی غبارے ہیں، جو ہوا کا رخ اور اُس کی تیزیٔ رفتار جانچنے کے لیے کبھی کبھی چھوڑے جاتے ہیں، اُن کا جواب وہی استقامت ہے، جو ہر مسلمان کا شیوہ ہونا چاہیے، کاش ہم بھی حضورؐ کی سی استقامت حاصل کر سکیں، ہمارے نبی صلعمؐ اُنؐ کے اصحاب پاک اور اہل بیت نے ہمارے لیے اپنے نقش چھوڑے تھے، مگر امتدادِ زمانہ کے باعث اور زائد تر اپنی کم ہمتی سے ہم نے وہ نقوش اپنے دلوں سے محو کر دیے تھے گو سبیل اللہ سے وہ نقوش ہرگز نہیں محو ہو سکتے تھے۔[1]

(۴)

(۱۴)

چھندواڑہ - ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۷ء

حضور والا السلام علیکم۔ مفصل عریضہ بعد میں لکھوں گا اس وقت شوکت صاحب ہی کی تحریر کے ساتھ یہ مختصر ملفوف کیے دیتا ہوں۔ اچھا ہوا کہ میرا ۸ جولائی کا عریضہ اس قدر دیر بعد ہی سہی مگر مل تو گیا۔ اگر نامناسب نہ ہو تو اس کی نقل رکھ کر اصل کو رجسٹر بلکہ بیمہ کرا کے میرے نام ارسال فرما دیجیے۔ میری طبیعت آج کل اچھی نہیں ہے۔ شکر کا زور ہے۔ دوا کچھ عرصہ سے بند تھی یہاں کے ڈاکٹر کے نسخے کی دوا یہاں کہیں نہیں ملتی۔ دہلی سے انصاری صاحب نے نسخہ لکھا۔ پہلی دفعہ دوا صرف تین دن کی ارسال کی جس سے تجربہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ بار دگر بہت سی دوا ارسال کی مگر راستہ میں شیشیاں چور چور ہو گئیں۔ مگر حضور اطمینان فرمائیں ڈاکٹر عبدالرحمن پہلے آنے والے تھے اس عرصہ میں ان کی زوجہ محترمہ کا یکایک انتقال ہو گیا اور وہ نہ آسکے مگر اب آ رہے ہیں۔ اُن کی دوا سے ایک سال سے زیادہ عرصہ تک نفع نہیں ہوا۔ حضور دعا فرمائیں کہ اس موذی مرض سے نجات ملے گو یہ جانتا ہوں کہ ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

---

[1] یہ خط صرف اتنا ہی دستیاب ہو سکا۔ باقی حصہ غائب ہے۔

الدنیا سجن المومنون و جنت الکافر[1]، تو خود رسولِ اکرمؐ روحی فداہ کا ارشاد ہے۔ پھر قیدِ حیات اور بندِ غم سب سے ایک ہی دم نجات ہو سکتی ہے۔ مولوی سلامت اللہ کی خدمت میں آداب۔ تبدیلی ہیئت پر مبارک باد۔ یا مکن یا پیل باناں دوستی الخ۔ ہاتھی بہت آہستہ خراموں میں ہے مگر جس کو اُس نے دبا لیا۔ وہ بوجھ میں ضرور مرا۔

دعا کا طالب

محمد علی

(۵)

⑮

بخدمت جناب مولانا عبدالباری صاحب

مضمون واحد ہے[2]، خداوند کریم کا فضل ہے صحت اچھی ہے، گو وزن ۲ اسیر کم ہو گیا ہے، حفظ کیا ہوا سب بھول گیا تھا، مگر اب تک دوبارہ پھر حفظ کر لیے ہیں، اور نماز فجر میں سورہ بقر کی دو سَو سے زائد آیات کی تلاوت ہو جاتی ہے، گھر سے اطلاع ملی تھی کہ لڑکی کے مردہ اولاد ہوئی تھی، خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ لڑکی خود بچ گئی، دعا فرمائیے میرے لیے دعا کی سخت ضرورت ہے کہ تزکیہ نفس ہو جائے، نفس امارہ بہت ستاتا ہے، فتح کی قوی امید ہے۔

تمھارے فضل کے بھوکے یقین رکھتے ہیں
کہ عید آئے گی بے شک مہِ صیام کے بعد

محمد علی

۲۴ر جنوری ۱۹۲۲ء

---

[1] حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں۔ الدنیا سجن للمومن و جنت للکافر

[2] یہ خط مولانا محمد علی نے مولانا شوکت علی کے خط کے ساتھ بھیجا تھا اس لیے ان مطالب کو دہرانے کی ضرورت نہیں سمجھی جو شوکت علی لکھ چکے تھے۔

(۶)

(۱۶)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
واعتصموا بحبل اللہ جمیعا

روزانہ ہمدرد
کوچہ چیلاں۔ دہلی

نمبر ٹیلیفون ۵۵۵۶
۲۵ مئی ۱۹۲۵ء

حضور والا۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ ایک مدت سے عریضہ لکھنے کا آرزومند، مگر اس غلامی کا بھلا ہو جس میں دو اخباروں نے مجھے مبتلا کر دیا کہ آج تک یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا اور آج بھی کام ضروری باقی ہے مگر اس خیال سے کہ اس طرح تو شاید کبھی بھی فرصت نہ ملے اور کاموں کو چھوڑ کر یہ عریضہ لکھ رہا ہوں۔ پریس کے کمپوزیٹر جن کی تنخواہیں اور "زیادہ وقت" کی اجرت نے دوالہ نکال دیا ہے گھنٹہ بھر بعد سر پر سوار ہوں گے کہ "مضمون" لاؤ اور یہاں صرف ورق سادہ ہی ہے۔ آج ہمدرد کے لیے بھی اپنے قلم ہی سے ایک مضمون لکھنا ہے تاکہ لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کروں۔ گزشتہ (ڈھائی ماہ) میں ساڑھے چھ ہزار باہر سے لاکر بھر چکا ہوں اور اس مہینہ میں تنخواہیں تک نہیں دے سکا۔ لوگوں کی بلیں چکانا تو درکنار۔ اب تک لوگوں سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا اس لیے کہ خود میرے مضامین اس میں مہینوں بعد بھی نظر نہ آتے تھے، گو بہت سے مضامین میرے املا سے لکھے جاتے تھے۔ جن خیالات کا اظہار ہمدرد میں ہوتا تھا وہ اکثر تو میرے خیالات کے خلاف نہ ہوتے تھے۔ لیکن وہ خود میرے خیالات نہ ہوتے تھے۔ اگر کہیں کمریڈ کے مضامین دے کر عملہ والوں سے کہا کہ ان خیالات کو اردو میں ادا کر دو تو یا تو مجھے خود ان کے لکھے ہوئے مضمون کو اس طرح دیکھنا پڑتا تھا کہ گھنٹوں درست کرنے میں لگ جاتے اور پھر بھی تسلی نہ ہوتی تھی اور بار بار خیال آتا تھا کہ اس سے کم وقت میں تو میں نے . . یہ مضمون لکھ ڈالا ہوتا۔ یا سارا مضمون مہمل ہو جاتا تھا جیسا کہ کئی بار ہوا اور "قہر درویش برجان درویش" کہہ کر خاموش ہو جانا پڑا

دو مہینہ تک اشتہار دیا تب جاکر ایک صاحب ایسے ملے ہیں جو اچھی اردو میں میرا مفہوم غالباً ادا کرسکیں۔ انگریزی وہ بھی کافی نہیں جانتے، اس لیے کہیں کہیں کمریڈ کی عبارت کو نہیں سمجھتے اور مجھے ان کی عبارت دیکھنے کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ لیکن امید ہے کہ کچھ عرصہ بعد اس کی ضرورت باقی نہ رہے۔ جس سے بہتر تو یہ ہوتا کہ کوئی انگریزی کا لکھنے والا مل جاتا تو آدھا وقت میرا بچ جاتا اور میں خود ہفتہ میں ایک یا دو مضامین ہمدرد کے لیے لکھ دیا کرتا مگر افسوس کہ مسلمان باوجود ایک جہان سے اعلان جنگ کرنے کے نہ صرف عربی میں کافی قابلیت نہیں رکھتے جس کا جاننا مذہب کے خیال سے مقدم تھا بلکہ وہ انگریزی بھی جس کا پڑھنا انہوں نے مقدم سمجھا، نہیں جانتے۔ جو جانتے ہیں وہ سرکاری نوکریوں میں گرفتار ہیں۔ یا دوچار بیرسٹری یا وکالت کی نذر ہوگئے ہیں۔ شعیب صاحب کے انکار کا مجھے پہلے سے شبہ ہوتا تو پہلے عملہ مہیا کرلیتا تب کہیں کمریڈ کے دوبارہ اجرا کا خیال کرتا اور اگر مہیا نہ ہوسکتا تو جاری کرنے کی جرأت ہی نہ کرتا۔ جہاں جہاں اخبار کے اجرا کے بعد کوشش کی گئی یہی جواب ملا کہ مجبور ہیں۔ وکالت کر رہے ہیں۔ جو ملتے ہیں وہ اس قدر نالائق ہوتے ہیں کہ ہندوؤں کے مقابلہ کے خیال سے بھی شرم آتی ہے۔ خود اردو کی یہ کیفیت ہے کہ حشرات الارض کی طرح متعدد رسالے نکلتے ہیں اور جلد پیوند خاک ہو جاتے ہیں۔ ایک رسالہ بھی مسلمانوں سے کامیابی کے ساتھ نہ چل سکا۔ اگر اتنے رسالے نکالنے والے متحد ہوکر دو تین رسالے نکالتے تو اچھے خاصے ہوتے؟ لیکن ہر ایک کو "عمارتے نو ساخت" کی فکر ہے۔ اتحاد، عمل اور اشتراک مفقود ہے۔ روزانہ اخبارات کی بھی یہی حالت ہے "معاصرانہ چشمک" اس درجہ تک پہنچ گئی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا انجام ہوگا۔ خیر یہ تو ایک طولانی داستانِ غم ہے اور اس ارادہ کے ساتھ یہ عریضہ لکھنا شروع کیا تھا کہ اپنا دکھڑا نہ روؤں گا۔ مگر ہمدرد کے ہمدرد اتنے کم ہیں کہ اگر آپ کے سامنے بھی نہ روؤں تو پھر تسکین کیونکر ہو۔ یہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ دراصل تسکین حاصل کرنے کے لیے بھی نہیں ہے۔ بلکہ عریضہ نہ لکھنے کی معذرت میں رہے، ایک پرچہ کمریڈ کا چھپ چکتا ہے تو دوسرے کا کام شروع

ہو جاتا ہے اور اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس نے یہاں ہفتہ بھر رہ کر میرا کام دیکھا ہے۔ اگر کوئی اور کام کرنا پڑتا ہے تو اتنی ہی دیر اخبار کی اشاعت میں لگ جاتی ہے۔ خواہ کام خانگی ضرورت کے مطابق ہو یا کسی قومی ضرورت کے باعث پورے پورے ہفتہ کی غلامی ایک کمرشل ہی کرا لیتا ہے۔ پھر ہمدرد کے لیے وقت کہاں سے نکالوں۔ چونکہ اس کے لیے برا بھلا دوسرے بھی لکھ سکتے ہیں اس لیے اسے ان پر چھوڑ دیتا ہوں۔ اور خود کمرشل کے لیے جس کے لیے ایک لکھنے والا ابھی نہیں ملا، وقف ہو جاتا ہوں۔ حساب کتاب، دفتر کا انتظام ان سب کا خدا حافظ ہے۔ مگر مالی مشکلات مجبور کر دیتی ہیں کہ ادھر بھی متوجہ ہوں۔ اب تک یہی ہوا ہے کہ جس نے میرے اہل و عیال کے لیے کچھ دیا وہ سب ہی اخباروں میں لگا دیا۔ لیکن یہ کب تک ہو سکتا ہے۔ اب کہیں سے کچھ آنے کی بھی سال بھر تک امید نہیں۔ یہ طریقہ یوں بھی نبھ نہیں سکتا تھا۔ یہ کام تو اسی طرح سے چل سکتا ہے کہ ہمدرد کے خریدار پیدا ہوں۔ عام مذاق کے مطابق گالی گلوچ قوم کے بے مفر ہے۔ اس لیے وہ راستہ حصول زر کا میرے لیے بند ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ میرے خیالات باوجودیکہ آج قوم میں سخت انتشار پیدا ہو گیا ہے اور پیدا کرا دیا گیا ہے۔ آج بھی لوگوں کو ہمدرد کی خریداری پر آمادہ کر سکتے ہیں۔ لیکن اب تک اس کا کچھ انتظام نہ ہو سکا۔ فاروق صاحب گورکھپوری ایک ہزار روپے لے کر چل دیے۔ اخبار کو بھی نقصان پہنچایا۔ (کیونکہ وہ میرے خیالات کی ترجمانی کر سکتے تھے)، اور ایک دیوالیہ کا اور بھی دوالہ نکال دیا۔ اب امید ہے کہ اس کا انتظام ہو جائے گا۔ اور اسی لیے پبلک سے اپیل کرنے کی ہمت کروں گا۔ دیکھیے کیا جواب ملتا ہے۔ اگر تین چار ہزار خریدار نہ ملے تو یا تو کمرشل کو بند کر دوں اور صرف ہمدرد کو عام قومی اصلاح کے لیے نکالوں یا ہمدرد کو بند کر دوں اور کمرشل کو خواص کی اصلاح کی نیت سے نکالتا رہوں یا پھر دونوں کو بند کر دوں اور کسی مسجد میں بیٹھ کر خود اپنی اصلاح کروں اور جو کچھ اسلام کو سمجھا ہوں اسے اوروں کو سمجھانے کی کوشش کروں۔ اتنی لمبی (لبنی)، چوڑی تمہید کے بعد عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قتل مرتد کے مسئلہ کے متعلق ائمہ اربعہ اور فقہائے متقدمین کی مفصل رائے درکار تھی تاکہ معلوم ہو سکے کہ ان بزرگوں نے کس طرح

استدلال کیا ہے۔ کمر یڈ میں میں نے قرآن کریم اور احادیث کے ساتھ بحث کی ہے
ہمدرد کا مضمون میرا لکھا ہوا نہ تھا۔ گو بہت سی آیات اور چند احادیث کا میں
نے حوالہ دے کر لکھنے کے لیے کہہ دیا تھا۔ مولوی محمد علی صاحب لاہوری کے ایک پمفلٹ
سے جو اس وقت تک میری نظر سے نہیں گزرا تھا۔ عارف صاحب نے چند چیزیں
لے کر اور بڑھا دیں اور چونکہ وہ انھیں غلط سمجھے اور ہدایہ وعنایہ کی عبارتوں
کا ترجمہ بھی غلط ہوا تھا اس لیے ہمدرد والے مضامین میں خامیاں رہ گئیں۔ کمریڈ
کے مضامین البتہ میرے ہیں۔ اس سلسلے میں صرف ایک مضمون کی کمی ہے یعنی یہ کہ
فقہانے رائے کس طرح قائم کی اور اگر غلط قائم کی تو سہو کس طرح واقع ہوا۔
خدا شاہد ہے کہ میں ان بزرگوں کی قوتِ ایمان، علم اور محنت شاقہ کا
خیال کرتا ہوں تو ان کی طرف منسوب کرنے سے لرزتا ہوں چہ جائیکہ زمیندار کی
ذاتیات کے مطابق خود کو امام اعظمؒ یا امام شافعیؒ سمجھوں۔ مگر جس مذہب میں
صاحبین کو امام اعظمؒ سے نہ صرف اختلافات کرنے کی اجازت ہے بلکہ جس میں
صاحبین کے متفقہ فتوی کو امام اعظمؒ کے فتوی پر ترجیح دی جاتی ہے۔ جس میں
امام اعظمؒ سے امام مالکؒ کے اختلافات کو روا رکھا گیا اور امام مالکؒ سے
امام شافعیؒ کے اختلافات کو اور امام شافعیؒ سے حنبلیوں کے اختلافات کو
وہ کیونکر کہہ سکتا ہے کہ کسی اور کا اختلاف خواہ ان سب بزرگوں سے ہی
کیوں نہ ہو، ناجائز ہے یا ناروا ہے یا کم از کم سوءِ ادب ہی ہے۔ بہر حال میں
رنے، خداوند کریم کی بارگاہ میں، سر نیاز جھکا کر قرآن کریم کو پڑھا ہے اور
اس کے کلام کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے رسولؐ کی احادیث کو اس
مضمون پر ڈھونڈ کر نکالا ہے اور ان میں اور قرآن کریم کی تطبیق کرنے کی
کوشش کی ہے جس طرح خدا کے وجود، رسولؐ کی رسالت اور اسلام کے سچے
ہونے پر ایمان لایا ہوں بالکل اسی طرح قتل مرتد کے خلاف اور قتل مفسد اور
قتل محارب کے موافق رائے قائم کی ہے یا تو یہ لکھ دیا جائے کہ اس طرح رائے
قائم کرنا جائز نہیں۔ خلاف اسلام، خلاف حکم قرآن و حدیث ہے یا پھر اس
طرح رائے قائم کرنے کی اجازت ہونی چاہیے اور اگر وہ رائے کسی مسئلہ میں غلط

ہو تو اس کی اصلاح بلا سب و شتم اور بلا "تکفیر" اور "الحاد" کا الزام لگائے ہوئے استدلال سے کی جائے جس کے لیے بحمد اللہ کہ راستہ کھلا ہوا ہے اور ہمیشہ کھلا رہے گا۔ "لا اکراہ فی الدین" پر میرا ایمان ہے۔ عمل پر سزا کا میں قائل ہوں لیکن عقائد پر سزا صرف آخرت میں ہوگی۔ اور ضرور ہوگی یہ میرا عقیدہ ہے۔ حقوق العباد کے خلاف جو کارروائی ہوگی اس کی سزا دینے یا معاف کرنے کا حق بندوں کو ہے۔ آخرت میں خداوند کریم بھی اس کی سزا دے گا کیونکہ حقوق العباد کی نگہداشت بھی خدا کا حکم ہے اور اس کی خلاف ورزی بھی خدا کی طرف سے سزا کی مستوجب ہے مگر عقائد کی گمراہی جو ان اعمال میں ظاہر نہ ہو جو حقوق العباد کے خلاف ہیں صرف خدا کی سزا ہی کے لیے مخصوص ہے۔ میرا ارادہ یہاں اس بحث کو چھیڑنے کا بھی نہ تھا۔ صرف فقہائے متقدمین کی اصل رائے تفصیل کے ساتھ اور ان کا سلیس ترجمہ اردو عبارت میں درکار ہے۔ افسوس ہے کہ مولوی کفایت اللہ صاحب کے مضمون نے اتنے عرصے تک انتظار دکھا کر پھر بھی تشنہ کام ہی چھوڑ دیا۔ مولوی عبدالرؤف صاحب داناپوری نے بھی اب تک باوجود تقاضے کے فقہا کی رائیں ارسال نہ فرمائیں۔ مولوی سلامت اللہ صاحب نے یا تو اس قدر شوراشوری سے مضمون لکھنے کے لیے غیر ضروری اجازت حاصل کرنا چاہی یا جب میں نے اس کا انتظار کرنا شروع کیا تو بے نمکی کا ثبوت دیا اور ایک عرصہ کے بعد اجازت سے بھی زیادہ غیر ضروری سوالات کا سلسلہ جاری کر دیا۔ جس کے جواب لکھنے کی اگر مجھے فرصت ہوتی تو اپنے کو خوش نصیب سمجھتا۔ اس سلسلہ کا آخری مضمون فقہا کی مفصل رایوں اور ان کے سلیس ترجمے کے ملنے پر موقوف ہے۔ ممکن ہے کہ فقہا نے بھی میری طرح بلکہ مجھ سے بھی کہیں زیادہ تمام احادیث کو پیش نظر رکھ کر استدلال فرمایا ہو اور "صرف" "من بدل دینہ فاقتلوہ" پر انحصار نہ کیا ہو اور بالخصوص حضرت عائشہؓ کی حدیثوں پر توجہ کی ہو جن میں خارج عن الاسلام ہونے کے ساتھ محارب باللہ و بالرسول کا جرم بھی صاف شامل ہے۔ اگر ایسا کیا گیا ہے اور ان کے استدلال نے مجھے قائل کر دیا تو ضرور بالضرور توبہ اور رجوع کر دوں گا لیکن کسی کو زبردستی مسلم بنانا یا قتل

مرتد کی دھمکی دے کر کسی کو منافقت میں رکھنا میرے نزدیک اسلام سے اتنا دور ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیونکر جزو اسلام ہو سکتا ہے؟ بہرحال میں اس مسئلہ میں فقہا کی مفصّل رایوں کا منتظر ہوں اور امیدوار ہوں کہ حضور میری مدد فرمائیں گے۔

ایک اور امر ہے جس کے متعلق حضور کی امداد کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ قاسم حسن کے ساتھ ان کے والد نے جو سلوک اب تک کیا ہے اس کے ہرگز وہ مستحق نہ تھے۔ امیر احمد مرحوم کے ساتھ اور قاسم کے ساتھ جو مرحوم سے کسی طرح برا نہیں ہے بلکہ اگر امیر احمد کی وفات کے بعد اس قسم کا مقابلہ کرنا جائز ہو تو میں کہہ سکتا ہوں کہ ان سے کہیں بہتر ہے بے جا سختی ان کو روا نہ تھی سب سے زیادہ یہ ہے کہ قاسم کی اہلیہ کے ساتھ قاسم کی صحت ایسی نہیں کہ ان کی اہلیہ اور لڑکی کو اطمینان ہو سکے۔ نہایت نامنصفانہ برتاؤ اب تک چلا جاتا ہے۔ دین مہر کی ادائیگی کے لیے کچھ نہیں۔ لڑکی کے لیے کچھ نہیں اور ایک کم عمر لڑکے سے قاسم حسن کی اطاعت شعاری کے باعث نکاح ہو جانے سے وہ عجیب حالت میں ہے۔ ماں اس شادی کے خلاف تھیں اور ہیں لیکن میں نے بہت سمجھایا ہے کہ اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب لڑکی کا گھر بنانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ قاسم بھی کوشاں ہیں مگر جو طرز عمل ان کے والد ماجد نے اختیار کیا ہے۔ اس سے خطرہ ہے کہ میکہ اور سسرال میں لڑائی جاری رہے اور لڑکے اور لڑکی میں ہمیشہ کے لیے رنجش پڑ جائے۔ ہم لوگوں کی کوشش کیا بارآور ہو سکتی ہے جبکہ ان کے والد ماجد اس طرح کارروائی کریں۔ اپنی جائیداد میں سے تو قاسم کو کچھ نہ دیا۔ جو جائیداد والدہ قاسم کے حصے میں آئی تھی اس میں سے بھی آج تک کچھ نہ دیا اور اب کوشش یہ تھی کہ لڑکی کے نام ہبہ کر دی جائے اور ممکن ہے کہ بعد کو لڑکی پر زور ڈال کر وہ بھی ابن احمد مرحوم کے لڑکے کے نام ہبہ کرا دی جاتی۔ بہرحال قاسم کی بیوی کے لیے اس میں سے بھی کچھ نہیں رہتا۔ سب احباب کے صلاح و مشورے کے بعد وقف علی الاولاد کی صورت اختیار کی گئی جس میں متولیہ اوّل زوجہ

قاسم حسن رکھی گئی اور اگر وہ چاہیں تو اپنی زندگی ہی میں لڑکی کو متولیہ بنا دیں اور خود تا حین حیات ایک حصہ آمدنی کا اپنے لیے لیتی رہیں۔ لڑکی متولیہ ثانیہ ہے۔ اس کو اختیار ہے کہ اپنے بعد اپنے شوہر کو یا اولاد کو یا کسی اور عزیز کو متولی بنا دے۔ شوہر اور زوجہ میں محبت کا دروازہ عمداً کھلا رکھا گیا ہے گو ابتدار قاسم کی اہلیہ سبط احمد اور ابن احمد مرحوم کی اولاد کی تولیت سے بالکل خارج رکھنا چاہتی ہیں۔ اب اس پر بھی ان کے والد ماجد ناراض ہیں اور نہ حساب مہر کے لیے راضی ہیں نہ تقسیم ہی کے لیے۔ نہ اس مصیبت میں کہ قاسم اور لڑکی دونوں سخت بیمار ہیں اور یہاں بڑے ہوئے ہیں ان کو ان کی والدہ کے ترکہ میں کچھ روپیہ ہی بھیجتے ہیں۔ بلکہ وہاں سے کوئی شخص لڑکی کو پوچھنے تک کو نہیں آیا ہے۔ بہ ظاہر قاسم کی والدہ کا ترکہ زیادہ محبوب ہے بہ نسبت قاسم کی لڑکی کے۔ قاسم حسن روپیہ کی طرف سے سخت پریشان ہے۔ میری جو حالت ہے وہ معلوم ہے مگر مجھ سے نہ دیکھا گیا اور جگہ سے کچھ عرصہ ہوا کچھ ملا تھا تو ایک حقیر رقم میں نے بھی زبردستی کر کے دے دی تھی۔ اب سوائے نالش کے چارہ نہیں۔ میں نے اب تک روک رکھا ہے۔ خان بہادر فصیح الدین صاحب کو دو تین بار لکھا کہ وہ بیچ میں پڑ کر صفائی کرا دیں اور تقسیم جائیداد کرا دیں اور پچھلے روپیہ میں سے کچھ دلوا دیں مگر اب تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ یہ سراسر زیادتی ہے۔ میں نے قاسم سے زیادہ اپنے چھوٹے بھائی سے محبت کرنے والا اور والد کی اطاعت کے لیے کوشاں کسی کو نہیں پایا مگر بیوی کا بھی حق ہے اس غریب کو کس پر چھوڑا جائے۔ قاسم بے عیب نہیں۔ ان کی اہلیہ گو مظلوم ضرور رہیں اور بہت دکھ سہ چکی ہیں۔ صلح کی طرف بہت زیادہ مائل نہیں ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بھی وہ اس بدسلوکی اور نا انصافی کے ہرگز مستحق نہیں۔ یہ سراسر نا انصافی ہے۔ کہ قاسم حسن کو والدہ کے ترکہ سے بھی صرف اس وجہ سے محروم رکھا جائے کہ وہ اپنی بیوی اور بیٹے کا خیال رکھتے ہیں اور اس ترکہ کو بھی ابن احمد مرحوم کی اولاد کو دے ڈالنے کو تیار نہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ حضور اس معاملہ

ہیں کیا رائے رکھتے ہیں۔ لیکن اگر حضور کو بھی میری طرح اس کا یقین ہو جائے کہ قاسم حسن کی والدہ کا ترکہ ابنِ احمد مرحوم کی اولاد کو نہیں ملنا چاہیے۔ بلکہ خود ان کی زوجہ اور اولاد کا حق ہے تو حضور ان کے والد ماجد اور بھاوج وغیرہم کو اس پر راضی کرنے کی کوشش کریں گے کہ گزشتہ سالوں کے منافع میں سے جس قدر ہو سکے انھیں دلوایا جائے۔ اور جائیداد تقسیم ہو کر اندراج ہو جائے اور متوّلیہ کو قبضہ دلوایا جائے۔ اب اس طولانی عریضہ کو ختم کرتا ہوں۔ الحمدللہ کہ قطب میاں صاحب حج بیت اللہ کو جا رہے ہیں۔ خدا اس جھگڑے کو مٹائے اور ارضِ پاک حجاز کی حکومت اور خلافت کا فیصلہ شریعت حقہ کے مطابق جلد سے جلد ہو۔ حضور کی علالت کا سن کر تار لکھا۔ پھر پھاڑ ڈالا کہ عریضہ لکھنا چاہیئے۔ مسودہ اب تک موجود ہے۔ مگر اس کی نوبت نہ آئی۔ پھر سنا کہ طبیعت ابھی صاف نہیں ہے۔ تو مجبور ہو کر تار دیا۔ خدا حضور کے سایہ کو ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ خربوزہ تو آ گئے اور کھا لیے گئے مگر روحانی چیزوں میں سے "روح خس" باقی ہے اب تک نہیں آ رہی ہے اور اگر یہاں مل جائے تو میں اس کا منتظر ہوں۔ جمال میاں اور محمد میاں اور چھوٹے صاجزادے کو پیار۔ سب کو سلام شوق بالخصوص مولانا سلامت اللہ، قطب میاں اور الطاف اور احسان بھائی کو؟

عقیدت کیش آپ کا پیارا مرید
محمد علی

مولوی محمد عرفان

(۱۷)

ہائیڈ پارک ہوٹل، لندن[1]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برادرم عرفان!

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔ میں تم سے سخت ناراض ہوں اور جو کچھ اثر تم نے میرے دل و دماغ پر دہلی رہ کر قائم کر لیا تھا وہ تمھارے بمبئی کے قیام میں بتدریج زائل ہوتا جاتا ہے۔ تم نے مجھے خطوط لکھنا کیوں بند کر دیا؟ بھوپال آنے میں اس قدر تساہل کیوں کیا جب میں لب گور تھا اور اب جبکہ تم کو اخبارات تک سے معلوم ہو گیا کہ میں پیرس میں موت کے منہ میں پڑا تھا تب بھی تم نے دو سطریں لکھ کر عیادت اور مزاج پرسی تک نہ کی۔ لطف یہ ہی کہ میری علالت تک کے حالات جو اخبارات میں چھپے تھے وہ آپ کے اڈیٹر صاحب نے خود بقول آپ کے گما دیے اور آپ نے اس کو ایک معمولی چیز سمجھا۔ میں نے پیرس میں جو تکلیف اٹھائی وہ ساری عمر کبھی نہ اٹھائی تھی۔ اور حالانکہ بھائی صاحب اور بھتیجے صاحب اور داماد صاحب موجود تھے۔ ایک دکھیا بیوی کا دم تھا کہ اکیلی تیمارداری کر رہی تھی اور ایک ڈاکٹر بہجت وہبی کو خدا زندہ و سلامت رکھے اور بامراد کرے کہ وہ غریب صبح کو اپنے کارخانہ جانے سے پیشتر دیکھ بھال کے جاتا تھا اور میرے کام کرتا تھا اور رات کو تھکا ہارا آتا تھا تب بھی گھنٹہ بھر میری دیکھ بھال کرتا تھا، اسپیشلسٹوں کو بھی وہی ڈھونڈھتا تھا اور لاتا تھا اور ان کو تمام معلومات میری علالت کے متعلق بہم پہنچاتا تھا، ان کی ہدایات مجھے سمجھاتا تھا اور دوائیں وغیرہ خرید کر لاتا تھا بلکہ عمل تک اپنے ہاتھ سے تیار کیا کرتا تھا۔ جب سے یہاں آیا ہوں دوبار صاحب

---

[1] مکتوب پر تاریخ درج نہیں لیکن صاف ظاہر ہے کہ یہ خط مولانا محمد علی نے دسمبر ۱۹۳۰ء میں تحریر فرمایا تھا

فراش ہو چکا ہوں۔ ایک بار تین دن کے لیے ۱۴، ۱۵ اور ۱۶ نومبر کو اور اب ۲۵ نومبر سے صاحب فراش ہوں۔ بیچ میں بھی اپنی تقریر کرنے کے بعد سخت تکلیف اٹھائی اور شب کے بارہ تک درد قلنج میں مبتلا رہا اور ڈیڑھ دن گھر سے نہ نکلا۔ لیکن اب تو نکلنا چاہوں بھی تو نہیں نکل سکتا۔ دل کی خرابی کے باعث دوران خون ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے نیچے کا سارا جسم سخت ورم میں مبتلا ہے۔ دمے والوں کی طرح شب کو سانس چلتی ہے، اس لیے لیٹ بھی نہیں سکتا، ۲۴ گھنٹہ پلنگ پر بیٹھا رہنا پڑتا ہے۔

مگر اس پر بھی وہ کام کر رہا ہوں جو نہ کسی سے ہو سکتا ہے نہ کوئی کرتا ہے۔ با اثر لوگوں پر گفتگو سے اثر ڈالتا ہوں، ٹیلیفون پر رات دن گھنٹوں باتیں ہوا کرتی ہیں خواہ ٹائمز کا فارن اڈیٹر ہو یا مسٹر برنارڈ شا، اور ایسے لوگوں کو اپنے سونے کے کمرہ میں بلا بھی بھیجتا ہوں اور گھنٹوں ان سے باتیں ہوا کرتی ہیں۔ چنانچہ وزیر ہند نے نہایت شرافت سے خود ہی یہاں آنے پر اصرار کیا۔ اور بالآخر جب میں بالکل مجبور و معذور تھا تو گزشتہ چہارشنبہ ۲۶ نومبر کو جس وقت میں اس ہوٹل میں آ گیا ان کو بھی بلا لیا۔ وہ تو گھنٹوں باتیں ہوتیں۔ مگر شوکت صاحب آ گئے اور میں نے ان کو نکالا تو کہنے لگے میں اس لیے ٹھہرنا چاہتا ہوں کہ تمھیں زیادہ باتیں نہ کرنے دوں حالانکہ ان کو علم تھا اور خود بھی چاہتے تھے کہ زیادہ باتیں اور صاف صاف باتیں ہوں، غریب وزیر ہند نے وعدہ کیا کہ اب دس منٹ اور لے گا اور ڈاکٹر کے حکم کے خلاف مجھے تھکائے گا نہیں۔ پھر بھی کوئی آدھ گھنٹے اور ٹھہرا اور پہلے بھی تقریباً آدھ گھنٹے باتیں ہو چکی تھیں۔ اس طرح گھنٹہ بھر اب ملا۔ کوئی پندرہ منٹ نواب احمد سعید خاں کے ہوٹل میں اسی طرح کی باتیں ہوئی تھیں مجھ سے اعتراف کیا کہ طرح طرح کے لوگوں سے ملا ہوں۔ کسی وزیر ہند نے اتنے مختلف الخیال لوگوں سے گفت و شنید نہیں کی۔ مگر تم نے جو باتیں بتائیں وہ تو عجیب و غریب ہیں۔ پیچیدہ ترین مسائل پر جو سمجھ ہی میں نہیں آتے تھے سر ج ایک روشنی کا سیلاب ٹوٹ پڑا۔ اسی طرح اخبار اسپیکٹیٹر (SPECTATOR)

کے اڈیٹر سے دو گھنٹے باتیں ہوائیں اور اس پر پورا پورا اثر پڑا۔ اسی طرح ٹائمز کے فارن اڈیٹر پر جس کے متعلق ہندوستان اور اسلامی ممالک پر مضامین لکھنا اور لکھوانا ہے، اس سے ڈیڑھ گھنٹے تک یعنی ساڑھے دس سے شب کے بارہ بجے تک ٹیلیفون پر گفتگو ہو چکی تھی اور خود ہی اس نے ملنے کے لیے آنے کی درخواست کی۔ سوا گھنٹہ اس سے ترکی وغیرہ اور نجد اور یمن اور آخر شش ہندوستان کے متعلق گفتگو ہوئی۔ یہ بھی گرویدہ ہو کر گیا ہے اور دونوں اخباروں میں خود اڈیٹروں کے مضمون ان خیالات کے جو میں نے ان پر ظاہر کیے، شائع ہوں گے۔ اچھا اب رخصت ہوتا ہوں۔ یہ خط حیات کو بھوپال پڑھنے کے لیے بھیج دو۔ مجھ میں اتنی جان نہیں ہے کہ اپنے ہاتھ سے چند سطریں بھی لکھ سکوں۔ پلنگ پر نہ لکھا گیا تو میز کرسی پر دس دن میں پہلی بار خط لکھا۔ دوسرے خط سکریٹری ٹائپ کرتی ہے۔ حیات سے کہنا کہ وہی MRS. KEELEY یا اب MISS MANTON سکریٹری ہیں مگر مجھے خوف ہے کہ بیس ان کی تنخواہ کا جو وہی ہے، دیر تک متحمل نہ ہو سکوں گا کام کی جگہ سے دوری نے مجبور کر کے مسز ماکنڈی کے مکان سے جہاں ۶ گنی ہفتہ دینا پڑتا تھا یہاں بھجوایا ہے، جہاں تقریباً بیس پونڈ ہفتہ کا بل آیا ہے اور وہ بھی رعایتی، مگر ڈاکٹروں کا قرب ہے، کام کا قرب ہے۔ گلنار و شعیب اور شوکت بھائی اور زاہد کا قرب ہے، اور غالباً اب موٹر کار رکھنا بھی بند کر دوں اور ٹیکسی پر گذر کر سکوں۔ ہفتہ وار نہ سہی نو دو ہفتے میں ایک بار تو تم براہِ راست چند سطور ہی مجھے لکھ سکتے تھے اگر یہ بھی نہیں کر سکتے تو پھر ہمارا سلسلہ بند۔ یوں بھی میں چند دن کا مہمان ہوں۔ یہ کہنا کہ فرصت نہیں ملتی، پیسہ نہ ہونے کے باعث بہت پریشان تھے وغیرہ وغیرہ، بے کار کے عذرات ہوں گے اور بدتر از گناہ۔ تم گپ بازی اور سیر سپاٹے کے عاشق ہو، کام سے وقت ملا تو اس میں صرف کیا، بھلا ایک دور افتادہ مریض کو دو سطریں لکھنے کے لیے وقت کس طرح ملتا۔

ہاں اتنا اور لکھ دیتا ہوں کہ نہ ہندو لیڈر قابلیت کا ثبوت دے رہے

ہیں اور نہ مسلمان، سب سے زیادہ اہم کمیٹی وہ ہے جو ترکیبی حکومت کا ڈھانچہ تیار کر رہی ہے اور اس میں اس قدر وقت ان کی بد لیاقتی اور عدم تدبّر سے ضائع ہو رہا ہے کہ خدا کی پناہ۔ مگر باوجود میرے پہلے سے کہلانے کے آغا خاں شفیع[1] اور جناح نے اس میں میرا نام نہیں رکھا حالانکہ پہلی کمیٹی میں صرف میری موجودگی جلسہ کے باعث میرا نام تھا اور اس پر آغا خاں کے ذریعے سے مجھے کہلوایا گیا کہ تمھاری صحت اس کی متحمل نہ ہو سکے گی۔ جب وہ کمیٹی اتنی عریض و طویل ہو گئی کہ سب کو اس میں داخل کرنا پڑا تو اب مختلف کمیٹیاں ہر بحث کے لیے بن رہی ہیں اب تک ایک میں میرا نام نہیں ہے۔ میں نے آغا خاں کو صاف صاف ٹیلیفون پر سنائیں اور ممکن ہے کہ خود ہنود کی درخواست پر میرا نام بڑھا دیا جائے۔ البتہ ہندو مسلم کمیٹی میں ضرور میرا نام ہو گا۔ اس معاملے میں شوکت صاحب نے میری غیر حاضری میں حسب معمول ڈھیل کی اور سب بدمعاشوں پر اعتماد کیا اور شفیع داؤدی کی طرح ہر ایک کے ساتھ مل کر کام کرنے کے ذوق میں تدبّر سے کام نہ لیا اور ہر ایک ان کو آلہ کار بنانا چاہتا ہے، ان کو صلاح کار و مشیر کوئی نہیں بناتا۔ وہ لوگ خود صلاح کار و مشیر اور مختار عام بن بیٹھے ہیں۔ میں نے آکر ایک دو بار کھڑکھڑایا تو آنکھیں کھلیں اور ابھی اور ان شاء اللہ کھولوں گا۔ اچھا اب رخصت۔

تمھارا اور تم سے بیزار
محمد علی

---

[1] شفیع سے مراد سر میاں محمد شفیع ہیں۔

نواب سیّد علی حسن خاں

(۱۸)

مکرمی!

السلام علیکم۔ ہمدم کے ذریعے سے آپ کے برادر محترم نواب نور الحسن[1] خاں صاحب کے انتقال پُر ملال کا حال معلوم ہوا۔ خدا مرحوم کو غریقِ رحمت فرمائے اور آپ کو اور مرحوم کے سب پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

میں نے خط و کتابت تقریباً ترک کردی ہے مگر دل نہ مانا کہ اس موقع پر اظہار ہمدردی سے دریغ کروں۔ حالانکہ جانتا ہوں کہ اس قسم کے اظہار سے کچھ حاصل نہ ہوگا نہ شاید اس کے لکھنے سے کہ آج بازارِ اجل ساری دنیا میں گرم ہے ہم کو بھی اپنے مصائب پر صبر کرنا چاہیے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

خدا سے دعا ہے کہ وہ ہم کو ان حوادث سے عبرت حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ایمان کو جان و مال پر ترجیح دینے کی ہمت دے۔ یہ سب اس کی امانتیں ہیں اور خدا ہم سب کو امانت میں خیانت سے بچائے۔ آپ بھی ہمارے لیے دعا فرمائیے کہ ثبات قدم عطا فرمائے "ربنا اغفرلنا ذنوبنا واسرافنا فی امرنا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکافرین"۔

برادرم رشید الدین حسن صاحب[2] کی خدمت میں بھی آداب عرض کرتا ہوں۔ خدا ان کو اور ان کی زوجہ محترمہ کو بھی صبر عطا فرمائے۔ والسّلام!

نیازمند: محمد علی

چھندواڑہ (ممالک متوسط) ۷ نومبر ۱۹۱۷ء

---

[1] یہ نواب صدیق حسن خاں کے بڑے بیٹے تھے۔

[2] نواب صاحب کے چھوٹے بیٹے۔

علی محمد علی خاں راجہ محمود آباد

(۱۹)

[راجہ صاحب محمود آباد کے نام یہ خط اسی قدر دستیاب ہوا ہے۔ جہاں تک مضمون کا تعلق ہے یہ خط مکمل ہے لیکن آغاز و اختتام کے الفاظ نہ ہونے کی وجہ سے بہ حیثیت خط ناقص ہے۔ مسئلہ وہی مسلم یونی ورسٹی کے قیام کا ہے کہ گورنمنٹ کے چارٹر کے مطابق "ہندو یونی ورسٹی مدراس" کی سی شرائط پر منظور کرلی جائے یا رد کردی جائے۔ اس مسئلے کا ذکر مولانا عبدالباری فرنگی محلی، اور مولانا حسرت موہانی کے خط میں آچکا ہے۔ وہی زمانہ اس خط کی تحریر کا بھی ہے]

چھنڈواڑہ

. . . .

میں بہ وثوق تمام کہہ سکتا ہوں کہ میری مختصر پبلک زندگی میں اس واقعہ سے زیادہ اہم کوئی واقعہ پیش نہیں آیا کہ میں نے بظاہر اپنے کھلے ہوئے اور دیرینہ اصولوں کے سراسر خلاف ایک جمہوری حق کو ایک محدود جماعت کے سپرد کرنے کی تجویز جمہور کے سامنے پیش کی مگر آخرکار چند واقعات ایسے پیش آئے کہ خود ان حضرات کو جن کی مخالفت کو مٹانے کی غرض سے مجھے ان کے ساتھ متذکرہ بالا سمجھوتہ کرنا پڑا تھا، ۱۰ر مارچ ۱۳ء کو لکھنؤ میں تسلیم کرنا پڑا کہ جب تک فاؤنڈیشن کمیٹی کو پھر مدعو نہ کیا جائے اور کل معاملات کو اس کے سامنے نہ پیش کیا جائے کوئی کارروائی ناجائز طریقے پر نہیں ہو سکے گی۔ اگست ۱۹۱۵ء میں آں جناب نے چند اصحاب کو شملہ مدعو فرمایا اور اس امر کی کوشش کی کہ مسلمان ایک ایسی یونی ورسٹی کو جو ہندو یونی ورسٹی کے اصولوں پر مبنی ہو قبول کرلیں۔

۱۰ر اپریل کے لیے فاؤنڈیشن کمیٹی کا ایک جلسہ پھر تجویز کیا گیا اور میں مشکور ہوں کہ آں جناب نے مجھے فراموش نہیں فرمایا، مگر کیا بےجا ہوگا، اگر میں عرض کردوں کہ اصل مدعا شوریٰ نہ تھا بلکہ مجھے اپنی رائے سے متاثر کرنا مقصود

تھا، میرے دیرینہ دوست سید سجاد حیدر صاحب یہاں آئے اور ان سے یونیورسٹی کے مسئلہ پر دیر تک بحث ہوتی رہی۔

بہ ظاہر ہے کہ ۱۰ / اپریل ۱۹۱۱ء کو مسلمان اگر طوعاً نہیں تو کرہاً ضرور ان امور پر راضی ہو گئے جن کے خلاف وہ اور میں اس وقت تک دونوں تھے

غالباً آپ سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ میں ۱۰ / اپریل ۱۹۱۱ء کے فیصلوں سے ہرگز مطمئن نہیں ہوا۔

آج پھر فاؤنڈیشن کمیٹی کو مدعو کیا جا رہا ہے اور قوم کے دیرینہ خواب کی اس طرح تعبیر کی جائے گی کہ جس طرح کی یونی ورسٹی ایک دوسری قوم نے بظاہر اپنی قومی خصوصیات و ضروریات کو ملحوظ رکھ کر لینا قبول کی ہے، اسی طرح کی یونی ورسٹی ہم بھی علانیہ اپنی قومی خصوصیات و ضروریات کے خلاف قبول کریں، کہاں ۱۱۔۱۲۔۱۳۔ اگست ۱۹۱۲ء کے مطالبے اور دعوے تھے اور کہاں آج کی ہمتیں اور ارادے ہیں۔

اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کون عظیم الشان تعلیمی فائدہ اسی سال اس کی بنیاد رکھے جانے سے حاصل ہو جائے گا جو ایک دو سال کے توقف و تامل سے فوت ہو جائے گا۔

پھر کیا وجہ ہے کہ اس عجلت سے کام لیا جا رہا ہے اور ایک متنازعہ فیہ مسئلہ کو جس کا دوران جنگ میں چھیڑنا خود سرکار عالیہ کے پیش کردہ اصول کے خلاف ہے چھیڑا جا رہا ہے۔

جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے میں بہ وثوق تمام کہہ سکتا ہوں کہ کوئی وجہ اس عجلت کی موجود نہیں اور متعدد وجوہ اس عجلت کے خلاف موجود ہیں۔

ایک عرصہ تک میں نے انتظار کیا کہ ان حضرات کا رجحان معلوم ہو جو کم از کم ۱۰ / اپریل ۱۹۱۱ء سے بیشتر میرے ہم خیال تھے۔ لیکن جب وقت تنگ رہ گیا تو میں نے مجبور ہو کر ایک تحریک ۲۵ / مارچ کے جلسہ کے لیے سکریٹری صاحب کی خدمت میں مع ایک مفصل عریضہ کے داخل ایجنڈا کرنے کے لیے ارسال کر دی۔

مگر اب معلوم ہوا کہ جلسہ ۸ / اپریل کو ہوگا اور لوگوں کا خیال ہے کہ آن

جناب نہایت سرگرمی سے مسلمانوں سے نہ صرف ۱۱-۱۲ راگست ۱۹۱۱ء و ۲۱-۲۷ ر جولائی ۱۹۱۳ء کے فیصلوں کے خلاف فیصلہ کرانا چاہتے ہیں بلکہ اپریل ۱۹۱۶ء کے فیصلہ کے بھی خلاف فیصلہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور مجھے یہاں تک اطلاع ملی ہے کہ آپ علانیہ فرماتے ہیں کہ اگر ضرورت ہوگی تو میں دس ہزار آدمی اپنی رائے کے موافق رائے دینے کے لیے لے آؤں گا۔ یہ وہ خیالات ہیں جو آپ کے متعلق میں اپنے دل میں ہرگز جاگزیں نہیں ہوتے دینا چاہتا۔

اگر آں جناب سید سجاد حیدر صاحب یا کسی دوسرے صاحب کو جو آں جناب کی رائے سے پوری طرح واقف ہوں یہاں روانہ فرمائیں تو امید ہے کہ وہ مندرجہ تحت سوالوں کا جواب آں جناب کی طرف سے دے سکیں۔

(۱) یونی ورسٹی کے مسئلہ کو تا اختتام جنگ کیوں نہ ملتوی رکھا جائے۔ اور اس عرصہ میں وہ تمام کارروائی کالج کی ترقی داصلاح کے متعلق کیوں نہ کرلی جائے جو بلا توسط سرکار عالیہ ہم آج بھی کرنے کے مجاز ہیں۔

(۲) وہ کون سا تعلیمی فائدہ ہے جو یونی ورسٹی کے متعلق اس وقت آخری فیصلہ کرنے میں متصور ہے مگر ایک دو سال بعد فوت ہوجائے گا۔

(۳) کیا جنگ کے باعث قیام یونی ورسٹی میں باوجود ہمارے فیصلہ کردینے کے کہ جیسی بھی ملے قبول کرلی جائے، رکاوٹیں پیش نہ آئیں گی؟

(۴) کیا ہم عنقریب کافی اور عمدہ اسٹاف جو یونی ورسٹی کے شایان شان ہو مہیا کرسکیں گے؟

(۵) کیا علی گڑھ کالج کے ارباب حل وعقد پر آپ کو اعتماد ہے کہ وہ یونی ورسٹی کو مناسب طریقہ پر چلاسکیں گے؟

(۶) اگر آپ کو ان حضرات پر اعتماد ہے تو آپ اب تک کیوں ان سے اس قدر کشیدہ رہے ہیں اور کیوں علی گڑھ کالج کے معاملات میں آپ نے اس سرگرمی کا جس کی آپ کے ہر جاننے والے کو آپ سے توقع تھی اب تک اظہار نہیں فرمایا اور کیوں انتخاب صدر کانفرنس کے معاملہ میں آپ کی جانب سے ارباب حل وعقد علی گڑھ کی اس قدر مخالفت یا ان کی جانب سے آپ کی اور آپ کے ہم

خیال اصحاب کی مخالفت ہوئی۔

..... آپ کیا قوم کا جاہل شخص بھی اب سمجھ گیا ہے کہ یونی ورسٹی کا مسئلہ بہ حالت موجودہ قوم کی موت اور زیست کا مسئلہ ہے ہماری نظربندی نے ہمیں مجبور کر دیا ہے کہ بہت سے قومی معاملات میں کوئی حصہ نہ لیں۔ مگر چونکہ تعلیمی معاملات میں ہم ایک حد تک آزاد ہیں اور خط و کتابت کر سکتے ہیں، اس لیے کم از کم مکاتبت اور مراسلت میں معذور نہیں، اپنا تو اس پر عمل ہے

فریاد و فغانِ بلبلِ ناشاد کیے جا
مہمانِ قفس خاطرِ صیاد کیے جا
فریاد ہو یا نالہ ہو یا آہِ جگر سوز
جو ہو سکے تجھ سے دلِ ناشاد کیے جا

مشکل یہ ہے کہ ہم کو آج انھیں سے شکایت پیدا ہوتی ہے جن کی تعریف میں ہماری زبانیں کل سوکھتی تھیں، استبدادیوں کا جائز استبداد کہیں سے احرار کو دستیاب ہو گیا ہے اور اسے ہمارے سب سے بڑے حریت پسند زیبِ بدن کیے ہوئے ہیں، بھلا کہہ نہیں سکتے، برا کہنے کو جی نہیں چاہتا۔

دل برد و حق آنست کہ دلبر نتواں گفت
بیداد تواں دید و ستمگر نتواں گفت

موجودہ زمانہ ہمیشہ نہ رہے گا مگر جو فیصلہ ہم اور آپ آج کریں گے اس کا اثر ہمارے بچوں اور آنے والی نسلوں کی تعلیم پر صدیوں تک پڑتا رہے گا، کیا آپ کو یہ گوارا ہے کہ ان کے لیے ہم اپنی کم ہمتی بطور ورثہ کے چھوڑ جائیں ......"

لارڈ مارلے[۱]

(۲۰)

یور لارڈ شپ

اپنے انگلستان پہنچنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد مجھے یور لارڈ شپ کو ایک نیاز نامہ ارسال کرنے کی عزت حاصل ہوئی تھی۔ جس میں میں نے جناب سے چند معاملات کے متعلق گفتگو کرنے کے لیے جنھوں نے مسلمانوں کے دلوں میں اضطراب پیدا کر رکھا ہے شرف ملاقات کی درخواست کی تھی۔ اور اس میں تعارف کا خط بھی ملفوف کیا تھا۔ جو از راہِ مہربانی آنریبل مسٹر لارنس جینکس چیف جسٹس آف بنگال نے یور لارڈ شپ کے نام دیا تھا۔ اس کے جواب میں مطلع کیا گیا کہ جناب بہت مصروف ہیں، اس لیے میری درخواست منظور نہیں کر سکتے۔

کیا میں اُمید کر سکتا ہوں یور لارڈ شپ مجھے اور میرے دوست سیّد وزیر حسن سکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ کو ایک ملاقات کا شرف بخش سکیں گے ؟ مجھے ڈر ہے کہ جناب کے دل میں صرف ہماری طرف سے نہیں بلکہ تمام ہندوستان کی مسلمان قوم کی طرف سے بھی آیا کسی قسم کی برائی تو نہیں ڈال دی گئی ہے۔ ہم نے بارہا کوششیں کیں لیکن اس بارے میں ناکامیاب رہے (اگر کامیابی ہوئی بھی تو بہت قلیل) ، کہ اپنے جوابات اخبارات میں چھپوائیں۔ اس لیے اور بھی زیادہ ضروری ہوا کہ ہم کسی بہت زیادہ ہمدرد اور فراغ حوصلہ وزیر کی باریابی حاصل کر کے ان پر اپنے خیالات جو ہندوستان کے مسلمانوں کے خیالات کا انعکاس ہیں ظاہر کر سکیں جو ہندوستان کے مسلمانوں کی بہبودی اور سلطنت کی بہبودی کے لیے بھی ضروری ہیں۔ اس بات سے ہم ناواقف نہیں ہیں کہ آپ کا تعلق ہندوستان کی خدمت سے براہِ راست نہیں ہے اور

---

[۱] اس وقت کے مشہور آزاد خیال وزیر ہند۔

اگر ہم آپ کو بلا ضرورت اس زمانے میں تکلیف دیں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم کو کافی سمجھ نہیں۔ اگر ہم اس کو ملتوی کر سکتے اور کسی دوسرے وزیر سے مل سکتے تو ہم ضرور ایسا کرتے۔ ہمیں یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ایسی روشن خیال وزارت کے زمانے میں بھی ہندوستان کے متعلق اتنی کم معلومات رکھی جاتی ہے اور کل انگلستان میں ایک درجن اشخاص بھی ایسے نہیں ہیں جن کی ہندوستان کی بابت معلومات کسی طرح بھی قابل اطمینان تصوّر کی جا سکیں اور اگر ان سب کی معلومات کو جمع بھی کر دیا جائے۔ تو وہ مجموعہ جناب کی معلومات کے برابر نہیں ہوتا۔ ہم کسی خوشامد کی غرض سے نہیں کہتے بلکہ دراصل یہی ایک ایسی بات ہے جو ہم کو مجبور کرتی ہے کہ ہم آپ سے کسی قریبی تاریخ میں شرف باریابی حاصل کرنے کی مؤدّبانہ درخواست کریں۔

ہم اپنے خیالات کا اظہار کم از کم ایک گروہ کے سامنے آزاد اخبارات کے ذریعے سے کر سکتے ہیں۔ جنھوں نے اس کی ہم کو اجازت دے دی ہے۔ مگر چند ایسے معاملات ہیں۔ ان کے لیے بہتر یہ ہے کہ ان کو بجائے اخبارات یا عوام کے سامنے پیش کرنے کے ان کے متعلق براہ راست اراکین سے گفتگو کرنی چاہیے۔ کیا آپ برائے مہربانی خوشی سے ہم کو شرف باریابی بخشیں گے۔ اور نہ صرف ہم کو ہی بلکہ ہمارے ہندوستانی بھائیوں اور ہم مذہبوں کو بھی مشکوریت کا موقع دیں گے۔ امید ہے کہ آپ جواب سے جلد مشرف فرمائیں گے۔

میں ہوں آپ کا نیازمند اور تابعدار

محمد علی ایڈیٹر ہمدرد و کامریڈ

لارڈ کریو

(۲۱)

[ستمبر ۱۹۱۳ء میں سفر لندن اور اس کی غایت سے متعلق ضروری نوٹ جیمس مسٹن کے نام خطوط کے شروع میں آچکا ہے۔ لارڈ مارلے اور لارڈ کریو کے نام محمد علی کے خطوط سے برٹش استعمار کی ان ریشہ دوانیوں پر روشنی پڑتی ہے جو لندن میں ان کے خلاف کی جارہی تھیں۔ ہندوستان کی حکومت کو معلوم ہوا کہ محمد علی، وزیر حسن کو لے کر لندن چلے گئے تو سرکاری حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند نے لارڈ کریو سکریٹری آف اسٹیٹ برائے امور ہند کو ایک طویل تار دیا کہ محمد علی اور وزیر حسن پر مشتمل وفد جو لندن پہنچا ہے۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں کا نمائندہ نہیں ہیں اس لیے سرکاری طور پر ان کی ہمت افزائی اور پذیرائی نہیں کی جانی چاہیے۔ محمد علی مسلمانوں کے نمائندہ ہونے کے علاوہ کامریڈ اور ہمدرد کے ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی ایک مقام رکھتے تھے اور کوئی وجہ نہ تھی کہ ان کو اہمیت نہ دی جاتی۔ وائسرائے نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے اپنے تار میں راجہ صاحب محمود آباد کی رائے نقل کی تھی اور لکھا تھا کہ میں نے محمد علی کے بارے میں راجہ صاحب کی رائے دریافت کی تو انھوں نے واضح الفاظ میں جواب دیا کہ محمد علی انتہائی بدذات اور شریر شخص ہے اور وہ مسلمانوں کے مسئلے کو نقصان پہنچانے کے سوا اور کچھ نہیں کرسکتا۔"

اس رائے اور ہارڈنگ کے مشورے کا نتیجہ یہ نکلا کہ لارڈ مارلے وزیر ہند نے محمد علی سے ملاقات سے انکار کردیا اور اخبارات میں ان کے خلاف مضامین و مراسلات کا الگ سلسلہ شروع کرادیا گیا۔ محمد علی کا خاصا وقت مشن کی تکمیل کی بجائے اپنی صفائی پیش کرنے میں صرف ہونے لگا اور بالآخر یہ وفد ناکام ہندوستان لوٹ آیا۔ وفد کی ناکامی کی ذمہ داری میں راجہ صاحب محمود آباد کے علاوہ نواب صاحب رام پور کا بھی حصہ تھا جیسا کہ محمد علی کے خط بنام مکتوب الیہ نامعلوم

سے اندازہ ہوتا ہے]

یور لارڈ شپ

اگرچہ ہمیں بہت کچھ افسوس ہے کہ یور لارڈ شپ نے ہماری التماس کے مطابق شرف ملاقات نہ بخشنے کا قطعی فیصلہ کر لیا ہے۔ تاہم ہمیں اعتماد ہے کہ یور لارڈ شپ ہز ہائی نس آغا خاں کی اس چٹھی کی نقل پر مناسب توجہ فرمائیں گے جو ہمیں موصول ہوئی ہے ہم یہ تو ظاہر کر چکے ہیں کہ ٹائمز اور دیگر یورپین اخبارات کس طرح سے ہمیں برا بھلا کہہ رہے ہیں اور یہ کہ جب ہم نے اپنی صفائی کے لیے خط بھیجے تو انھوں نے یا تو ان کو شائع ہی نہیں کیا یا بہت بُری طرح کانٹ چھانٹ کر دی' یا تلخیص کر دی اور ہم کو پبلک ڈ تر دینے کے متعلق ہز ہائی نس آغا خاں کی تجویز کی ماہیت اور غرض کے متعلق غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے۔ جس سے عرفاً ہمارے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ قابل التفات وہ جھلک ہے جو یہ تحریریں نہ صرف ہمارے بلکہ "بڑھتی ہوئی جماعت" (جیسا کہ ہز ہائی نس کہتے ہیں' اور مسلمانان ہند جن کے ہم نمایندے ہیں) کے سیاسی رخ اور مزاج پر ڈالتی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہز ہائی نس آغا خاں کی مراسلت نہ صرف سوسائٹی میں بلکہ سیاسی حلقے میں بھی ہماری بریّت کرتی ہے۔ اور یہ کہ اخبارات کی غلط انداز تحریر کسی نہج ہمارے خلاف جن کے ہم نمایندے ہیں۔ حضور ملک معظم کی گورنمنٹ کے دل میں وہ بُرا خیال نہ بٹھلا دیں گے جس کو آغا خاں لایعنی اور سراسر شرارت آمیز قیاس کرتے ہیں یعنی یہ کہ ہم اور وہ لوگ جن کے ہم نمایندے ہیں۔ مذہب تلک[1] یا سیاسی یا اسلامی دیوانوں کے ساتھ کسی نوع ہم خیال یا ہمدرد ہیں' گورنمنٹ سے ہماری عقیدت مندی جیسا کہ آغا خاں فرماتے ہیں" بلا شک و شبہ ہے" اور جو اتہام ہماری قوم پر لگائے گئے ہیں۔ وہ عموماً بے بنیاد ہیں۔ یہ ہے وہ نفس الامر جسے ہز ہائی نس صدق دل سے تسلیم کرتے ہیں اور اپنے مراسلت میں اس کو بھی بالکل صاف کرتے ہیں کہ اُن کو اُن تباہ کن پیچیدگیوں سے کوئی سروکار نہیں

---

[1] لوکمانیہ تلک کانگریس کے انتہا پسند رہنما۔

ہے جو ہز ہائی نس کی روانگی کے بعد پیدا ہو گئی تھیں اور نہ ۱۳؍ اکتوبر کی ٹائمز کی اشاعت سے ان کا کوئی تعلق ہے ہم اس نامہ و پیام کی پوری نقل ارسالِ خدمت کر رہے ہیں جو رائٹ آنریبل مسٹر امیر علی[1] ہم میں سے ایک کے مابین ہوئی ہے تا کہ انڈیا آفس میں ان تباہ کن پیچیدگیوں کا کوئی سرکاری انکار کر دیا جائے ہم یور لارڈ شپ کی اس قدر تضیع اوقات پر معذرت چاہتے ہیں ۔

ہم ہیں
یور لارڈ شپ کے کمترین اور تابعدار خادم
محمد علی اور سیّد وزیر حسن[2]

---

[1] سیّد امیر علی انگریزی زبان کے مشہور مصنّف، اس زمانے میں انگلستان میں پریوی کونسل کے رکن تھے اور مسلم لیگ کی لندن برانچ کے صدر

[2] ہمدرد، دہلی مورخہ ۲۳؍ دسمبر ۱۹۱۳ء

مولوی محمود احمد عباسی

(۲۲)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برادرم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، شرمندہ ہوں کہ آپ کے ۱۳ر اپریل کے خط کا ۳ر مئی کو جواب دے رہا ہوں۔ آپ غالباً ایک بار غریب خانہ پر تشریف لائے تھے۔ مگر وہ وقت میرے لیے نزع کے وقت کی طرح ہوتا ہے اگر چند منٹ بھی کسی اور طرف توجہ کرنی پڑتی ہے تو اس دن کا اخبار ایک دو اطراف کی ڈاکوں کو کھو دیتا ہے اور ایک ملاقاتی کا لحاظ رکھنا سیکڑوں خریداروں کے ساتھ بدمعاملگی کا مجرم بنا دیتا ہے۔ لیکن مجھے افسوس ہوا کہ آپ تشریف نہ لائے۔ حالانکہ میں نے عثمان (اپنے بھانجے اور مینجر) سے کہہ دیا ہے کہ بھائی تم جانتے ہو اس وقت میں کسی سے ملنا ناممکن ہے، شام کے لیے وقت مقرر کردو۔ خود مجھ سے ساری عمر وقت کی پابندی نہ ہوئی، لیکن اب اس کا طالب ہوں کہ لوگ ملنے سے پہلے وقت مقرر کرلیا کریں یا شام کو آیا کریں۔ کیا کروں اگر صبح کو کسی سے ملاقات کرتا ہوں تو اس دن کا اخبار وقت پر نہیں نکل سکتا۔ یوں بھی طوالت کے باعث (جس کا سبب محض یہ خواہش ہوتی ہے کہ جو کچھ میرے ذمہ میں ہے دوسروں کو سمجھا دوں، اگر زیادہ محنت کرنا پڑے تو گوارا کیا جائے مگر کہیں ایسا نہ ہو کہ چند الفاظ یا فقروں کی کمی کے باعث میرے خیالات دوسروں کے دماغ وقلب تک نہ پہنچ سکیں) بعض دن کئی ڈاکیں نکل جاتی ہیں اور مقامی فروخت میں بھی کمی ہو جاتی ہے لیکن اس نقصان سے بھی فائدہ تو خریداروں ہی کو پہنچ جاتا ہے۔ اگر محض کسی سے ملاقات کے باعث اخبار وقت پر نہ نکل سکے تو خریداروں کے سامنے کوئی عذر پیش نہیں کرسکتا۔ کاش آپ کسی دن شام کو مجھ سے مل لیتے تو آپ کو نہ خط لکھنا پڑتا، نہ اتنی دیر جواب کا انتظار کرنا پڑتا اور میں بھی سب باتیں آدھ گھنٹے میں آپ کے گوش گذار کرسکتا

جن کے لکھنے کے لیے دو گھنٹے درکار ہیں۔

برادرم! اس وقت سارا اسٹاف "ہمدرد" کا میں ہوں جو روز ۸، ۱۰ گھنٹے کی محنت میں ایک لیڈر لکھ دیتا ہوں (جو دو دو تین تین بلکہ چار چار پانچ پانچ لیڈروں کے برابر ہو جاتا ہے)، اور ایک غریب جعفری ہے جو تاروں کا ترجمہ کرتا ہے اور اخبار کو ترتیب دیتا ہے۔ بعض دن ایک اور سب ایڈیٹر جواب علیحدہ ہو چکے ہیں، لیڈر یا نوٹ لکھ دیتے ہیں۔ جعفری بیمار ہو گیا تھا تو وہی تاروں کا ترجمہ کر دیتے تھے مگر اپنے صبح کے مطب کے بعد، اس لیے کہ ڈاکٹر بھی ہیں۔ ایسی حالت میں اگر خود اس اخبار کے ضروری بزنس (BUSINESS) سے بھی غافل رہنا پڑے تو کون سی تعجب کی بات ہے؟ یہ معذرت امید ہے کہ قبول ہو گی۔ اس وقت پانچ بجے ہیں۔ ابھی تھکا ہارا ایک ۸ کالم کا مضمون ختم کر کے پلنگ پر آ لیٹا ہوں۔ لیکن لیٹے لیٹے مشکل نہ بھی ہوتا تب بھی آپ کو خط لکھنا آسان نہ تھا۔ ہاں عبدالرحمن صدیقی نے مجھ سے دو بار آپ کے متعلق ذکر کیا تھا۔ برادر بزرگ فرید احمد صاحب نے بھی دو تین بار زبانی، تحریری اور ٹیلیفون پر ذکر فرمایا تھا لیکن جواب دینا مشکل تھا۔ دبی زبان سے عبدالرحمن سے البتہ اس قدر کہا تھا کہ محمود احمد صاحب کو نوکری کی تلاش ہے یا وہ بھی میری طرح پاگل ہو گئے ہیں جو "ہمدرد" میں کام کرنا چاہتے ہیں اور میری ہی طرح ان کو بھی اپنے دل پر قابو نہیں، وہ مجبور کر رہا ہے کہ جو پیغام خدا نے تمھیں دیا ہے وہ دوسروں تک پہنچا دو اور بلاغ ہی تک محدود نہیں رکھتا بلکہ باخع النفس بھی بنائے ڈالتا ہے۔ ان کا جواب مجھے مطمئن نہ کر سکا۔ فرید احمد صاحب سے یہ پوچھنے کی ہمت نہ تھی۔ آپ کے انجینئر بھائی سے شاید پوچھ لیتا، مگر ان سے ملنا نہ ہوا، حالانکہ ان سے ملنے کا بہت ہی متمنی تھا۔

والدہ مرحومہ کی قبر اور آمنہ مرحومہ (میری لڑکی) کی قبر کے پتھر انہی کی معرفت تیار ہوئے ہیں اور لوحِ مزار بھی۔ مگر اب تک کام ختم نہیں ہو سکا۔ حالانکہ تقریباً دو سال کی مدت گذر گئی۔ جب جب ملاقات ہوتی ہے تقاضا ہو جاتا ہے۔ اللہ اللہ کر کے اب والدہ کی قبر پر تو لوح کندہ ہو کر لگ گئی، گو پتھر قبر پر ٹھیک طرح نہیں جمائے گئے ہیں اور چاروں کونوں کے DECORATIVE پتھر ابھی نصب نہیں ہوئے ہیں

اور لڑکی کی لوحِ مزار تیار بھی نہیں ہوئی ہے، نہ پتھر علی گڈھ بھیجے جاسکے ہیں وہ بیچارے بھی سخت مصروف ہیں۔

خیر اب خود آپ کا خط آگیا ہے۔ براہِ راست یہ بظاہر بیہودہ سوال کرتا ہوں ''ہمدرد'' کا سرمایہ نہ کبھی تھا نہ اب ہے۔ سب کی تنخواہیں مل جاتی ہیں۔ مگر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ پندرہ دن دیر سے ملیں گی یا ڈیڑھ دو مہینے کی دیر سے' کاغذی، ایسوسی ایٹڈ پریس اور مالک مکان کو تو آٹھ آٹھ دس دس ماہ' اور ایک ایک سال کا بھی انتظار کرنا پڑا ہے۔ یہ اس لیے کہ پہلے جب آدھا خرچ کمریڈ کے خریداروں پر پڑتا تھا۔ دونوں اخباروں پر پانچ سو سے لے کر ایک ہزار بارہ سو تک خسارہ ماہواری ہو جاتا تھا اور اب جب کہ سب خرچ ہمدرد ہی پر پڑتا ہے۔ پندرہ سو روپیہ ماہوار کا خسارہ ہے۔ خدا شاہد ہے کہ اس لیے ہرگز اس کارخانے کو نہیں چلا رہا ہوں کہ اپنے اور بال بچوں کے اخراجات کے لیے رقم نکالنا مقصود ہے۔ جب سے کمریڈ نکالنے کا خیال ہوا تھا صرف ایک غرض سامنے تھی کہ جو پیغام خدا نے مجھے پہنچایا ہے اسے دنیا تک پہنچا دوں۔ لیکن اب دنیا کی ذہنیت اتنی بدل گئی ہے کہ اخبار اور سفر کرکے تقریر کے ذریعہ سے یہ پیغام دنیا تک نہیں پہنچا سکتا اس کے لیے مصارف کا انتظام اب ممکن نہیں۔ ارادہ کیا ہے کہ اپنی اس محدود ''دنیا'' جو ''ہمدرد'' پڑھتی ہے، کو ایک بار اچھی طرح اطلاع دے دوں کہ اگر وہ اسے جاری رکھنا چاہتی ہے تو اس کا قرض ادا کرے اور خریدار بڑھائے تاکہ خواص کی امداد کا انتظار نہ کرنا پڑے (اور اب تو انتظار بھی نہیں کرتا، اس لیے کہ یقین ہو گیا ہے کہ امداد نہیں آئے گی) اگر وہ ایسا نہیں کر سکتی تو پھر اس کارخانے کو بند کر دوں اور قوتِ لایموت کے لیے چند گھنٹے کوئی کام کرکے ہر مہینے چالیس، پچاس یا ساٹھ خود پیدا کر لیا کروں، اتنا ہی بیوی اور بچے بھی پیدا کر لیا کریں، باقی وقت میں انھیں تعلیم دوں، خود تعلیم حاصل کروں اور چند گھنٹے روزانہ اس لیے بچا لیا کروں کہ جو کوئی مجھ سے مشورہ طلب کرنے کے لیے آئے اس کو اپنی رائے سے مطلع کر سکوں تاکہ ''گوشہ نشینی'' اور خود غرضی

کا مجرم نہ بنوں۔ اس طرح پبلک کی وہ خدمت کرسکوں جو ایک پچاس ساٹھ روپیہ کی آمدنی والا کرسکتا ہے۔

اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ بھی اس زمانے میں جب کہ "ہمدرد" کی حالت یہ ہے، ہاتھ بٹانے کے لیے بیتاب ہیں یا خود کسب معاش کے لیے اسی طرح مجبور ہیں جس طرح "ہمدرد" کو بند کرکے میں مجبور ہوں گا اور "ہمدرد" کی سب ایڈیٹری اسی طرح کرنا چاہتے ہیں۔ جس طرح میں "ہمدرد" کو بند کرکے شاید تین چار لڑکوں کی پرائیویٹ ٹیوٹری کرنے لگوں۔ یقیناً میں ایمانداری سے اپنی تنخواہ کے برابر محنت کیا کروں گا۔ لیکن مجھے اس سے بحث نہ ہوگی کہ وہ لڑکے کون ہیں اور کس کے ہیں۔ کیا آپ کو بھی آج اس سے بحث نہیں کہ آپ "ہمدرد" کے سب ایڈیٹر مقرر ہوتے ہیں یا کسی اور اخبار کے۔ یا آپ کی نظر انتخاب خاص "ہمدرد" پر پڑی ہے؟ آپ نے کہا کہ "ہمدرد" میں کام کرنے کا محرک وہ معاوضہ نہیں ہے جو چند ابیض منقوش کی شکل میں حاصل ہو، میں اسے تسلیم کرنے کو تیار رہوں۔ لیکن کیا آپ واقعی اس شخص کے ساتھ رہ کر اس کے مصائب میں شریک ہونا چاہتے ہیں جس کے خیالات کو آج مطلق ہر دلعزیزی حاصل نہیں، حالانکہ وہ سمجھتا ہے کہ آج سے زیادہ وہ کبھی محنت نہیں کیا کرتا تھا اور آج سے زیادہ صحیح رہنمائی اس نے کبھی نہ کی تھی اور آج سے زیادہ وہ ہر دلعزیزی کا کبھی بھی مستحق نہ تھا۔ نہ معلوم آپ "ہمدرد" کو پڑھتے بھی ہیں یا نہیں۔ ۱ر اکتوبر ۱۹۲۶ء سے اس وقت تک سات مہینے مسلسل اتنی محنت میں نے کی ہے کہ کہہ نہیں سکتا اور اردو میں اپنے نزدیک صحیح مذہبی اور سیاسی خیالات کا اتنا انبار لگا دیا ہے کہ چند کتابیں میرے مضامین سے مرتب ہوسکتی ہیں جو باوجود میری زود نویسی کے اس قابل ہوں گی کہ ان سے لوگ دیر تک فائدہ حاصل کرسکیں لیکن جن کے سامنے ان خیالات کا آج اظہار کرنے کی جسارت کروں گا وہ مجھے پاگل سمجھیں گے اور کہیں گے کہ یہ خودستائی اس شخص کے بیوقوف اور بیہودہ ہونے کی صاف دلیل ہے۔ اس خودستائی کی "ہمدرد" کے مضامین پڑھ کر آپ بھی کسی قدر تائید کرسکتے ہیں تو آئیے، میرے مصائب میں شریک ہوجیے۔ اگر یہ نہیں ہے تو بزنس

_____ کے BUSINESS کے طور پر طے کر لیجئے کہ تاروں اور انگریزی اخبارات کے CUTTINGS کا کتنے روپیہ ماہوار پر ترجمہ کر سکیے گا اور اخبار کو مرتب کرنے میں مدد دے سکیے گا۔ ہمدرد میں جو اشتہار نکل رہا ہے وہ محض بزنس کی کارروائی ہے مگر میں نے اب تک اس کو بھی انجام نہیں دیا اس لیے آس بالکل ٹوٹی نہ تھی اور امید تھی کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ صحیح معنوں میں ASSISTANT بھی مل سکے گا۔ آج کل تجربہ تو یہی کہہ رہا ہے کہ ASSISTANT تو نہیں RESISTANT بہت سے مل جائیں گے۔

تحریری جواب عنایت کرو اور پھر اگر جی چاہے تو ایک دن کے لیے آکر مل جاؤ۔ میں یہاں سے ۸ یا ۹ کو بمبئی چلا جاؤں گا۔ ۲۳ / ۲۴ تک آنا ہوگا بہتر ہے کہ اس سے پہلے ہی سب کچھ طے ہو جائے۔

جواب کا منتظر اور دیر لگانے کی معافی کا خواستگار

آپ کا بھائی

محمد علی

۳ مئی ۱۹۲۷ء

داؤد صاحب کی قبر پر میری طرف سے فاتحہ پڑھ لیجیے گا۔ ½ ۱۱ برس کی عمر میں علی گڈھ گیا تھا۔ تو وہ میرے بھائیوں کے ہادی اور رہنما تھے۔ آج تک اس پر لطف زمانے کو نہیں بھولا ہوں۔

محمد علی

مظہر الحق

(۲۴)

[مظہر الحق نے مولانا محمد علی کو ایک خط کے ساتھ بعض انگریزی اخبارات کے تراشے بھی بھیجے تھے جو دیناپور (بہار) کے فساد سے متعلق تھے۔ خط میں انھوں نے شکایت کی تھی کہ ان اخبارات میں حقیقت حال کی صحیح تصویر پیش نہیں کی اسی سلسلے میں انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ کامریڈ اس وقت ہوتا تو مسلمانوں کی خوب خدمت انجام دے سکتا تھا لہٰذا کامریڈ کو پھر جاری کیجئے۔ اس کی ضرورت ہے۔ انھوں نے محمد علی کو پٹنہ آنے کی دعوت بھی دی تھی۔ یہ خط ان کے اسی خط کے جواب میں ہے]

برادرم السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کی انگریزی تحریر مرقومہ ۷ رماہ حال موصول ہوئی۔ جس کا شکریہ بھی ہے اور شکایت بھی۔ شکریہ تو یاد فرمائی کا اور شکایت اس امر کی کہ آپ نے ..... ایک غیر ملکی اور اجنبی زبان کو ذریعہ تخاطب قرار دیا۔ حالانکہ خود آپ کی بھی اور آپ کے مخاطب کی بھی مادری، قومی اور ملکی زبان دیسی موجود ہے جس میں اس سے بدرجہا زیادہ سہولت اور عمدگی کے ساتھ خط وکتابت ہو سکتی ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنی قومی اور ملکی زبان کو چھوڑ کر ایک غیر زبان کو کیوں روزمرّہ کی ضروریات میں استعمال کیا جائے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ایک انگریز دوسرے انگریز کو جرمن زبان میں، ایک جرمنی اپنے ہم قوم کو روسی زبان میں، اور ایک روسی دوسرے روسی کو جاپانی میں خط تحریر کیا کرتا ہے؟ ان کی قومی غیرت اور عصبیت کبھی اس کی مقتضی ہوگی کہ اپنی قومی زبان کو چھوڑ کر کوئی دوسری زبان روزمرہ کی ضروریات میں استعمال کیا کریں۔ افسوس ہے کہ جدید تعلیم یافتہ ہندوستانیوں میں عموماً اور مسلمان انگریزی جوانوں میں خصوصاً غلامانہ ذہنیت کی دوسری خرابیوں کی طرح یہ مرض بھی عام ہے کہ لکھیں گے تو انگریزی میں، بات کریں گے تو انگریزی میں اور سوچیں گے تو انگریزی میں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا غلامی ہوگی کہ باوجود اپنی شائستہ وشستہ زبان کے ایک غیر مانوس اور ثقیل زبان کو ذریعہ تکلم وآلۂ تحریر بنایا جائے۔ شاید

یہی ذہنیت اس تقاضے کا باعث ہے کہ کمریڈ کو پھر جاری کیا جائے مگر واقعہ یہ ہے کہ کمریڈ کی اشاعت سے مقصد و منشا غیر اردو دانوں تک مسلمانوں کے خیالات پہنچانا اور ان کے حیات کی ترجمانی کرنا تھا۔ اس سے ہرگز مقصد یہ نہ تھا کہ مسلمانوں کے لیے علی الخصوص ان مسلمانوں کے لیے بھی جن کی اردو مادری زبان ہو، یہ انگریزی جریدہ مرتب کیا جائے۔ ایسے لوگوں کے لیے تو بقول شوکت صاحب انگریزی رسائل و اخبارات عیاشی کے مترادف ہیں یعنی LUXURY کے، جہاں تک ملّی ضروریات کا تعلق ہے اردو جرائد و اخبارات تقریباً کافی و وافی ہیں۔ ہمدرد کے لیے فی الواقع میں اپنا بہت کچھ وقت صرف کرتا ہوں اور اتنی محنت کرکے طول طویل مقالات افتتاحیہ لکھتا ہوں، جو کبھی پہلے نہ کی تھی۔ گزشتہ اکتوبر سے اس وقت تک اہم سیاسی و مذہبی معاملات پر ایک سلسلہ مضامین ہمدرد میں شائع ہوا ہے، جو اس قابل ہے کہ مسلمان غور سے پڑھیں اور عمل پیرا ہوں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہمدرد نہیں پڑھتے اور شاید خریدار بھی نہ ہوں، آپ بیرسٹری کے ذریعے معقول آمدنی پیدا کرکے شبستانِ عشرت میں محوِ آرام ہیں۔ جب آپ اپنی جیبیں پُر کرکے عدالت سے اپنے عشرت کدے پر واپس تشریف لاتے ہیں اور شام کی ہوا خوری کے بعد سگریٹ ہاتھ میں لے کر یا مشروبات میں سے کسی چیز کا گلاس سامنے رکھ کر آرام کرسی پر دراز ہوتے ہیں۔ اس وقت کے لیے آپ کو کمریڈ کی ضرورت ہوتی ہے کہ آپ پڑھیں اور اپنا دل بہلائیں۔ لیکن میرا مقصد اخبار کی اشاعت سے یہ نہیں ہے کہ میں آپ جیسے حضرات کے لیے سامان عیش فراہم کروں بلکہ ان لوگوں تک اپنے خیالات پہنچانا چاہتا ہوں جو مضمون پڑھ کر عمل کے لیے بھی آمادہ ہوں۔

میں خونِ جگر پی پی کر سات سات آٹھ آٹھ گھنٹے اور بعض دن دس دس بارہ بارہ گھنٹے کی محنت سے اخبار کے لیے مضمون لکھتا ہوں، اخبار شائع کرتا ہوں ڈیڑھ ہزار ماہوار کا خسارہ اٹھاتا ہوں، پندرہ ہزار کا مقروض ہوں۔ اس پر مجھ سے تو یہ فرمائش کہ کمریڈ نکالو، اخبار شائع کرو، یہ کرو، وہ کرو، مگر آپ حضرات کا یہ تغافل ہے مسیحیوں کی طرح مسلمانوں کا تو یہ عقیدہ نہیں ہے کہ حضرت

مسیح علیہ السلام کے کفارہ گناہ سے اور سب نجات یافتہ ہوگئے۔ میری طرح آپ کو بھی اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔ میری محنت اور میرا ایثار آپ کی نجات کے لیے کافی نہیں

رہا نفس معاملہ، آپ دیناپور کے تفتیش کے لیے پٹنہ بلاتے ہیں۔ وہاں حاضر ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہیں بیٹھا ہوا ان وجوہ واسباب کو خوب جان لیتا ہوں جو دیناپور تو کیا ہندوستان کے کسی گوشہ میں واقع ہوں۔ عقل مند وہ ہے جو دوسروں کے تجربے سے متنبہ ہوجائے۔ معمولی عقل والا وہ ہے جو اپنے تجربے سے متنبہ ہوجائے اور فاترالعقل وہ ہے جو اپنے تجربے سے بھی متنبہ نہ ہو۔ خیر خدا کا شکر ہے کہ آپ دیناپور کے واقعات سے تو متنبہ ہوئے۔ انگریزی محاورہ حقیقت حال کو خوب واضح کردیتا ہے اور معنی خیز ہے "DENAPORE RIOT BROUGHT IT HOME" جب تک یہ مصیبت دوسروں ہی کے گھر آئی تھی آپ غافل تھے۔ اب کہیں جاکر خود آپ کے گھر آئی ہے۔ مگر کیا آپ . . . . جیسے شہرت طلب اور متعصب لونڈے کی بیہودہ نگاری کا جواب NECCESSITY میں دے کر چھوٹ جائیں گے؟ ہرگز نہیں۔ اب تک مسلمانان بہار سب صوبوں والوں کے پیچھے ہیں۔ آج تک نہ ایک اخبار خود نکال سکے اور نہ ان اخبارات کی مدد کرسکے جو دوسرے صوبوں سے نکل رہے ہیں۔ ہمدرد تک کی طرف سے جو لاپرواہی ہے۔ اس کو میں جانتا ہوں ہمدرد مسلمانوں کی ایک SEARCH (ضرورت) ہے کہ میڈیا آپ کے لیے LUXURY (سامان عیش) ہے۔ جیسا کہ عرض کرچکا ہوں۔

آپ نے مہاتما گاندھی سے بہت خط و کتابت کی لیکن عملاً کچھ نہ کیا۔ میں صرف اس خط کا جواب دے رہا ہوں۔ اس کے بعد اس وقت تک ہرگز ایک لفظ بھی جواب میں نہ لکھوں گا جب تک کہ آپ عملاً کچھ نہ کریں۔ بقول غالبؔ

جب تک دہان زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل ہے تجھ سے راہ سخن وا کرے کوئی

والسلام

آپ کا خیر طلب اور آپ سے عمل طلب
محمد علی[1]

---

[1] ہمدرد دہلی مورخہ ۷ر جولائی ۱۹۲۶ء

مولانا غلام رسول مہر

(۱)

(۲۴)

[مولانا مہر صاحب نے ذیل کے خط کے شروع میں ایک مفصل نوٹ دیا تھا جس سے اس خط کے مباحث اور اس کے پس منظر پر روشنی پڑتی ہے۔

مہر صاحب لکھتے ہیں۔

"یہ مکتوب مختصر سی تمہید کا متقاضی ہے۔ سلطان عبدالعزیز مرحوم والی نجد نے حجاز فتح کر لیا تھا۔ اہلِ حجاز نے جنوری ۱۹۲۶ء میں انھیں بادشاہ تسلیم کر لیا۔ مجلسِ خلافت میں حجاز کے انتظام کے متعلق اختلاف رائے موجود تھا۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور ان کے رفقا رچاہتے تھے کہ حجاز کو ایک بین المِلّی انتظامی ادارے کے حوالہ کر دیا جائے۔ دوسرے گروہ کے نزدیک یہ تجویز بجائے خود بھی ناقابل عمل تھی اور اس میں خرابی کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ آزاد اسلامی حکومتیں اس باب میں چنداں سرگرم نہ تھیں اور صرف مسلمانانِ ہند کی طرف سے اس کے پیش ہونے کا کوئی اثر نہ ہو سکتا تھا۔ نہ وہ تنہا انتظام کا سارا بار اٹھا سکتے تھے، نہ ان کی محکومی کے پیشِ نظر سلطان یا اہلِ حجاز سے اس تجویز کے قبول کی امید ہو سکتی تھی، نہ بہ صورت موجودہ کوئی اور مؤثر قدم اٹھایا جا سکتا تھا۔ پنجاب کے تمام ارکانِ خلافت بالاتفاق مولانا محمد علی کی رائے کے خلاف تھے۔ یہی زمانہ ہے جب مولانا نے انھیں "پنجابی ٹولہ" کہہ کر پکارنا شروع کیا۔

سلطان عبدالعزیز نے ۱۹۲۶ء میں حج کے موقع پر ایک موتمر منعقد کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے تمام اسلامی ملکوں کو دعوت نامے بھیجے۔ مدعوین میں مجلسِ خلافت بھی شامل تھی۔ نمائندوں

کے انتخاب کے لیے مجلس مذکورہ کا ایک اجلاس دہلی میں بلایا گیا۔ اس میں دستور کے مطابق مختلف اصحاب نے مختلف نام پیش کیے، ارکان پنجاب کی طرف سے مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم کا نام پیش کیا گیا۔ جیسا کہ اندیشہ تھا، ووٹوں کے سلسلے میں خاصی کش مکش اور گرمی پیدا ہوئی۔ مولانا نے جو تفصیلات اپنے مکتوب گرامی میں پیش کی ہیں یا جو قیاس آرائی فرمائی ہے اسے معرض بحث میں لانے کا یہ موقع نہیں تاہم اس حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ ارکان پنجاب کا پیش کردہ نام منظور نہ ہو سکا اور مولانا محمد علی مرحوم جن اصحاب کو منتخب کرانا چاہتے تھے وہ کثرت رائے سے منتخب ہو گئے۔

چونکہ رائے شماری کی گرمئ ہنگامہ میں ایک گونہ ناخوشگواری پیدا ہو گئی تھی، اس لیے مولانا ابوالکلام آزاد اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم نے دونوں فریقوں کو سمجھا کر حالات کو طبعی رفتار پر لانے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں وہ مولانا محمد علی مرحوم سے بھی ملے جس کا ذکر مولانا نے فرمایا ہے۔

میں اس زمانے میں "زمیندار" میں تھا اور پیش نظر معاملے میں اختلاف رائے کے باوجود بے تکلف مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی سے ملتا تھا۔ اپنے فہم و بصیرت کے مطابق میری کوشش یہی تھی کہ ایک خاص معاملے میں اختلاف کے باعث تعلقات میں ناخوشگواری پیدا نہ ہو۔ اس ضمن میں اپنے خیال کے مطابق معذرت کے مناسب پہلو بھی پیش کرتا رہتا تھا۔

مولانا کی صحت اس وقت بھی خاصی خراب تھی۔ بیماریوں کا غلبہ تھا۔ اپنے معتقدات و آراء میں یگانہ خلوص و پختگی کے باعث وہ خفیف سے اختلاف پر بھی غصے میں آجاتے تھے اور سخت سے سخت باتیں کہہ دینے میں بھی تامل نہ فرماتے تھے۔ اس کی شہادت

خود مکتوب بھی پیش کر رہا ہے۔ خدا شاہد ہے کہ ان کی کسی بھی بات پر کبھی ملال پیدا نہ ہوا۔ ان کی بے مثال شخصیت اور بے مثال قربانیوں کے باعث دل میں انتہائی عزت و احترام کے جو جذبات موجزن تھے وہ برابر قائم رہے۔ محاسن کی فراوانی نے انھیں محبوبیت کا ایسا پیکر بنا دیا تھا جس سے نیازمندانہ وابستگی بہرحال زندگی کی ایک عزیز متاع تھی۔ وہ یقیناً ان یگانہ افراد میں سے تھے جن کی جگہ دس عظیم الشان شخصیتیں مل کر بھی پُر نہیں کرسکتیں

یہ تحریر رنج کی تھی۔ لیکن اب کہ ان کی وفات پر ربع صدی سے زیادہ مدت گزر چکی ہے[1]، اسے ان کے آثار متبرکہ کے طور پر شائع کر دینا غالباً نامناسب نہ سمجھا جائے گا۔"!

برادرم مہر!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ آپ سے جب سے گفتگو ہوئی تھی تو اس قسم کی بحث کو بے سود سمجھ کر میں کمرہ سے اٹھ کر چلا آیا تھا۔ مگر شوکت صاحب سے آپ کی گفتگو جاری رہی اور اس کے بعد وہ مُصر تھے کہ میں آپ کے متعلق یہ خیال کروں اور وہ خیال کروں۔ میں نے اس بنا پر آپ سے تفصیل کے ساتھ گفتگو کرنے کے لیے عرض کیا، ایک دن میرے مہمان ہو کر رہیے۔ اور تنہائی میں گفتگو کیجیے۔ مگر آپ نہ رُک سکے اور صرف تھوڑی دیر یوں ہی سی بات چیت ہو کر رہ گئی۔

میرا ارادہ تھا کہ آپ کی (خاص آپ کی بھی)، اور اہلِ پنجاب اور جو اہلِ حدیث شریک تھے ان کی اور جناب صدر[2] کی روش کے متعلق تفصیل کے ساتھ ہمدرد میں لکھوں کہ جلسے میں کس طرح جتھ بندی سے کام لیا گیا اور باوجود کہ پنجاب کے تیرہ ووٹ ایک ہی پلڑے میں رکھے جاتے تھے کس طرح باقی ہندوستان نے

---

[1] اور اب تو تقریباً نصف صدی یا پورے اڑتالیس سال گزر رہے ہیں۔

[2] مولانا ابوالکلام آزاد

نفریباً بلا استثنا آپ کی جتھہ بندی کے خلاف رائے دے کر اسے شکست دی۔ مگر اس کے متعلق ہدایات مولانا عبدالماجد دریابادی کے مواجہہ میں جو ایک بڑی حد تک ابن سعود کے مویئد ہیں، دے کر آپ سے دوبارہ ملنے کے بعد میں نے ان ہدایات کو نظر انداز کرتے کے لیے "ہمدرد" کے عملے سے کہا تاہم یکم مئی کے "زمیندار" میں پہلا مضمون ہی اس جتھہ بندی کو پھر قائم رکھنے کی کوشش میں لکھا ہوا نظر آتا ہے[1]۔ الحمد للہ کہ اب جو کچھ سب وشتم ہے وہ شوکت صاحب، صلح کل شوکت صاحب، بھولے بھالے بڑے بھائی صاحب کے لیے وقف ہے اور ہیں صرف" ایک دو عظیم الشان شخصیتوں " کی مجہول شمولیت سے زیادہ سخت کسی لقب کا مستحق نہ سمجھا گیا۔ آپ فرمائیں گے کہ " خلافت" کا رویہ صحیح نہ تھا۔ مضمون ایک نامہ نگار کا تھا اڈیٹر ذمہ دار نہیں ہے، وغیرہ وغیرہ۔ مگر دیکھیے کہ اہل حدیث کی جتھہ بندی سید سلیمان[2] اور صاحب صدر کیا مولوی کفایت اللہ صاحب[3] تک کی حمایت میں جھلک رہی ہے اور پھر دعویٰ یہ ہے کہ نہ میں خود اہل حدیث ہوں نہ میرے پیشوا اور مقتدا مولانا عبدالقادر قصوری جن کا انتخاب اہل حدیث کی طرف سے مع اسمٰعیل صاحب غزنوی اور غالباً ان کے والد[4] کے، چنیا نوالہ یا چینیاں

---

[1] شاہ ابن سعود نے مکہ معظمہ میں موتمر عالم اسلامی میں مجلس خلافت کے نمائندگان کو بھیجنے کی درخواست کی تھی۔ نمائندگان وفد کے انتخاب کے لیے جو جلسہ دہلی میں ہوا، اس میں اختلاف پیدا ہو گیا چونکہ اس اجلاس میں مولانا عبدالقادر یا کوئی دوسرا اہل حدیث عالم منتخب نہیں ہو سکا تھا۔ اس لیے ان حضرات نے زمیندار کے ایک مضمون میں اپنی ناراضگی کا اظہار کیا تھا۔ یہاں اشارہ اسی طرف ہے۔ اہل حدیث علماء کو سلطان نے چونکہ الگ سے دعوت نامہ بھیج دیا تھا اس لیے وہ تمام حضرات بھی شرکت موتمر سے محروم نہ رہے۔

[2] مولانا سید سلیمان ندوی اگرچہ مجلس خلافت کے وفد میں شامل تھے بلکہ رئیس وفد وہی تھے لیکن انتخاب نمائندگان کے جلسے میں ان کی رائے مولانا محمد علی کی رائے اور انداز فکر کے خلاف تھی مولانا محمد علی نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

[3] مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ شاہجہانپوری ثم دہلوی

[4] مولانا سید محمد اسمٰعیل غزنوی کے والد مولانا سید عبدالواحد غزنوی کی طرف اشارہ ہے۔

والی مسجد کے جلسہ میں کیا گیا ہے۔ بھائی مہر! یہ جھوٹا انکار، جھوٹی عقیدت مندی چھوڑ دو۔ جھوٹی صلح سے سچی لڑائی اچھی۔ درک اسفل کا مقام بلاوجہ مقرر نہیں کیا گیا ہے ؎

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں

تمہارے "تمہارے ہر طرح نیاز مند" سالک صاحب ع
کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزل ہا

کی ٹگہ پٹہ[1] کا جواب نہ رمضان میں دیا نہ عید کے بعد ہی دیا۔ تمہارے اور تمہارے "راجہ" ظفر علی خاں صرف "مالک" نہ کہ "مدیر مسئول" کے پروپیگنڈا کا جن کا "زمیندار" کی نکمی پالیسی سے بقول تمہارے کوئی تعلق نہیں ہے[2] جواب دینا ضروری تھا۔ لیکن پھر نہیں دیا۔ حالانکہ دو بار تم نے اور تمہارے جتھہ والوں نے منہ کی کھائی اور پھر بار بار بگڑی بات کو بنانے کی کوشش کرنے لگے۔ اس کا بھانڈا پھوڑنے کا ارادہ تھا مگر تحمل سے کام لیا گیا۔ اس کے بعد بھی تم لوگ باز نہ آئے۔ جلسہ میں صدر کی اعانت سے تمہارے جتھہ نے ہر امکانی کوشش ہماری ہی تجویز کی مخالفت میں کی یہاں تک کہ شوکت کا اور میرا نام جس طرح تم نے زمیندار کی فہرست "اہل حق" یعنی اہل حدیث اور بزعم خود ضعفائے بیرون پنجاب مثلاً حکیم صاحب اور "ندوی المذہب" سید سلیمان سے خارج کر دیا تھا اسی طرح تمہارے صدر صاحب نے اپنی فہرست سے بھی خارج کیا اور مجھے مجبور کیا کہ میں تم لوگوں کی طرح سے پس پردہ نہیں بلکہ صاف صاف خود اپنا اور شوکت صاحب کا نام پیش کروں۔ پھر جب ووٹ گننے کا وقت آیا تو تم نے

---

[1] یہ پنجابی کا لفظ "ڈھگ" ہے۔

[2] میں نے دو تین مرتبہ اخبار میں لکھا تھا کہ مولانا ظفر علی خاں "زمیندار" کے مالک ہیں لیکن پالیسی کے ذمہ دار اڈیٹر ہیں مقصود یہ تھا کہ "زمیندار" کی کسی تحریر سے مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی خاں کے باہمی تعلقات میں فرق نہ آئے اور جواب صرف اڈیٹروں سے مانگا جائے۔ ان تفصیلات پر بحث غیر ضروری بھی ہے اور غیر مناسب بھی۔

سکریٹری خلافت کمیٹی پر اپنی بیہودہ بے اعتمادی کا ثبوت اس طرح دیا کہ خود ووٹ شماری کرنے بیٹھ گئے۔ ایک اور شخص نے تم پر بے اعتمادی کا ثبوت اسی طرح دیا مگر ہم نے بند کر دیا اور سکریٹری کی طرح تمھیں بھی رسمًا رائے شماری کرنے دی۔ وہ تو خدا ہی کو منظور تھا کہ تم لوگ ذلیل ہو، اور تم نے شعیب غریب کے ۱۶ ووٹ گنے۔ اگر تم نے بھی افضل کی طرح، اگنے ہوتے تو تمھارے صدر صاحب کا کاسٹنگ ووٹ ضرور اس غریب کے خلاف ہوتا۔ پھر ظفر علی خاں کے کذب و افترا کا پردہ چاک کرنے کے جرم میں جناب صدر کی طرف سے ذاتیات کی گندگیوں کا غواص ٹھہرایا گیا۔ گو ہم لوگ تمھاری طرح جلسہ سے فرار نہ ہو جاتے۔ ووٹ دوبارہ گنے گئے اور ۱۸ نکلے تم ذلیل تر ہوئے مگر اس پر بھی تم نے عبرت حاصل نہ کی۔ اب مطالبہ ہوا کہ عبدالقادر صاحب صدر الصدور جماعت اہلِ حدیث و پنجاب بیان خلافت کے ووٹ بھی گنے جائیں۔ اب تمھارے نمائندے کے فقط ۱۶ ووٹ نکلے اور ۱۷ اور تم ذلیل ہوئے۔ ظفر علی خاں کے ۹ ووٹوں نے تمھیں اور ذلیل کیا۔ تاہم ان حقیقتوں پر میں نے پردہ پڑا رہنے دیا۔ شام ہی کو حکیم صاحب[۱] اور تمھارے صدر[۲] صاحب تشریف لائے اور مجھے یقین دلایا کہ تمھارے صدر الصدور قصوری صاحب نے بھی اپنی بے قصوری کا ثبوت تم کو سمجھا کر دیا اور طے پایا کہ تم اور ظفر علی صاحب اور اہلِ حدیث خلافت کے وفد کے خلاف کچھ نہ لکھو گے اور جلسے کی روداد کے متعلق کوئی مخاصمانہ و معاندانہ پہلو اختیار نہ کیا جائے گا مگر افسوس کہ تم سے رہا نہ گیا، اور آخرش یہ تحریر چھپ ہی گئی۔

اب تم سے اتنی التجا ہے کہ آئندہ مجھ سے اپنی عقیدتمندی وغیرہ کا دعویٰ میرے سامنے نہ کرو گے۔ میں کسی سے منافقانہ ملنا نہیں چاہتا۔ میں جن کو اچھا سمجھتا ہوں ان سے تو شاید اسے چھپا بھی لوں مگر جن کو برا سمجھتا ہوں ان پر کسی نہ کسی طرح اور اکثر بلا سخت و سست کہے ہوئے اسے ظاہر کر ہی دیتا ہوں

---

[۱] مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم (مہر)

[۲] مولانا ابوالکلام آزاد

ایک بار نہیں بلکہ کئی بار تم "زمیندار" میں میرے خلاف لغو بیانیوں کے "سہواً" چھپ جانے کا اعتذار کر چکے ہو۔ اب آئندہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تم کو اہل حدیث اور حنبلی اور "غیر مقلد" نہیں "وہابی" اور "غیر مقلدوں" کی تقلید جامد کرنے والا اور وہابیوں کی ہر بدعت کی اسی طرح حمایت کرنے والا سمجھتا ہوں، جس طرح بعض غالی حنفی سلطان ابن سعود کے متعلق ہر خبر کا جو ان کے خلاف ہو یقین کرنے والے ثابت ہوئے ہیں۔ گو یہ بھی معلوم ہے کہ تم جب مجھے نماز پڑھاتے ہو تو نہ رفع یدین کرتے ہو نہ آمین بالجہر کہتے ہو اور برخلاف اس کے ظفر علی خاں جب ایک اہلِ حدیث کے پیچھے حجاز میں نماز پڑھتے ہیں تو آمین بالجہر پکارتے ہیں۔ میں تم کو اپنا دوست نہیں سمجھتا بلکہ حاسد اور دشمن جانتا ہوں۔ اگر چاہتا تو جو وقت اس خط کی تحریر لکھنے میں صرف کیا ہے "ہمدرد" کا ایک مضمون اسی مطلب کا لکھنے میں صرف کرتا۔ لیکن ارضِ پاک حجاز کا قصد ہے[1] یہ نہیں چاہتا کہ حق کی حمایت ہی میں کیوں نہ ہو تمہارے اور جتھے کی قلعی کھولنے میں "ہمدرد" کے کالموں کو صرف کردوں اور عین اس وقت جب کہ ہنود کی مخالفت سے مسلمانوں کو بچانے کی تدابیر سوچی جارہی ہیں آپس کے بعض وعناد کو شہرت دوں اس لیے تمھیں کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔

برادرم! "ایک دو عظیم الشان شخصیتوں" پر رشک وحسد نہ کرو "ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ واسع علیم"۔ یہ شخصیتوں کی "پرستش" یوں ہی نہیں ہوا کرتی۔ ہمارے پاس تم سے اور تمھارے جتھے والوں سے زیادہ دولت وثروت نہ تھی، نہ ہی خاندانی وجاہت سے ہم اس درجہ کو پہنچے ہیں۔ قوم کی خدمت کرتے ہیں، اللہ سے ڈرتے ہیں، گو اور زیادہ ڈرنا چاہیے۔ اور لومۃ لائم کی پرواہ نہیں کرتے۔ سلطان جابر اور "عظیم الشان شخصیتوں" کے آگے بھی صاف بات کہنے سے نہیں چوکتے اور منافقانہ کسی سے نہیں ملتے۔ اگر یہ طریقہ استعمال

---

[1] محمد علی نے حجاز کا یہ سفر اسی ماہ یعنی مئی ۱۹۲۶ء میں موتمر عالم اسلامی کے موقع پر کیا تھا۔ موتمر کے انعقاد کی تاریخ ابتداءً ۲ جون مقرر کی گئی تھی لیکن التوا کے بعد ۷ جون سے موتمر کا آغاز ہوا تھا۔

کروگے تو اسی درجے پر پہنچ جاؤگے ورنہ ایک دوسرے ظفرعلی خاں بن جاؤگے۔

تم نے نہ صبر و تحمّل کا اب تک ثبوت دیا ہے نہ انکسارِ حقیقی اور صفائے قلب کا۔ تم سے اس کی امید نہیں کہ "ٹھنڈے دل سے" اس عریضہ کو پڑھوگے اور اس پر غور کروگے۔ لیکن خداوندکریم سے دعا ہے کہ تمھارے دل میں اس کا یقین ڈال دے کہ جس غرض سے یہ خط لکھا گیا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ ایک آخری کوشش اور کرلی جائے۔ ایک نوجوان مسلمان، جس کو اس نے قابلیت سے محروم ہرگز نہیں رکھا ہے۔ راہِ راست پر آجائے اور ریاکاری اور رشک و حسد اور غلو اور جتھہ بندی کو چھوڑ کر حق پرستی اور حق گوئی کو اپنا شعار بنائے اور آئندہ چل کر قوم اور ملک کی بہترین خدمت کرسکے۔

یہ تحریر نج کی ہے اور شائع کرنے کی غرض سے نہیں بھیجی جاتی۔ ۸، ۹ مئی کے جلسے کے انتظامات کا بوجھ اور "کمریڈ و ہمدرد" کے قرضے کی ادائیگی کی فکر اور پھر اپنے سفرِ حجاز اور حج کے اخراجات کی فراہمی مارے ڈالتی ہے۔ ایسے وقت میں اتنا وقت میرے پاس نہیں ہے کہ میں محض بحث مباحثے میں اُلجھا رہوں۔

اگر میری اس تحریر کی سختی کو جائز سمجھتے ہو تو خیر، ورنہ اسے للہ معاف کردو کہ زندگی کا اعتبار کیا ہے اور میں صحت کو پہلے ہی خیرباد کہہ چکا ہوں۔ اگر نہیں معاف کرسکتے تو ایک بار دل کھول کر مجھے بُرا بھلا کہہ لو، میں چلنے سے پہلے للہ معاف کرتا جاؤں گا اور کہنے کی معافی چاہ لوں گا۔

والسلام!

تمھارا خیر طلب بھائی

محمد علی

۲ر مئی ۱۹۲۶ء

(۲)

(۲۵)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برادرم مہر!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ تمھارا ایک طول طویل محبت نامہ "بہ اندازِ صحافت" تحریر کردہ مجھے چلتے وقت ملا تھا اور شاید ستمبر میں دوسرا مختصر محبت نامہ ملا جس میں امید ظاہر کی گئی تھی کہ میں ضرور اس کا جواب دوں گا پہلے خط کا جواب دینا ایک بڑھی ہوئی بحث کو اور بڑھانا تھا اور میں اس سے تنگ آگیا تھا اس لیے جواب دینا نہ چاہا۔ مگر دوسرے محبت نامہ کا جواب ضرور دیتا اگر سر کھجانے کی بھی فرصت ملتی۔ اتنا دور دراز کا سفر اس طرح کیا گیا تھا کہ پانچ منٹ بھی رختِ سفر باندھنے کے لیے نہ ملے تھے۔ یہی نہیں زادِ راہ مہیا کرنے کے لیے بھی وقت نہ ملا تھا۔ کیونکہ جو کچھ میری دریوزہ گری کے باعث ملا تھا وہ سب "ہمدرد" و "کامریڈ" کے قرض ادا کرنے کے لیے تھا اور وہ بھی ناکافی تھا۔ میرے لیے، بچوں کے لیے اور "ہمدرد" کے جاری رکھنے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ چلنے سے دو تین روز پیشتر ہی میری بیوی کا کچھ روپیہ ان کے بھائی کے پاس تھا اس میں سے دو ہزار راستے میں دیے جانے کا وعدہ کیا گیا تو جان میں جان پڑی۔ ایک دوست نے کچھ آخری دن دیا تو وہ بچوں کے کھانے کے لیے چھوڑ گیا۔ علاوہ بیماری کی فکر کے اور علاج کے باعث فرصت نہ ہونے کے مرکزی خلافت کمیٹی کے جلسے، کانگریس کمیٹی کے احمد آباد والے جلسے اور سب سے زیادہ دہلی کی خلافت کانفرنس کے جلسے نے مصروف رکھا تھا۔ بمبئی جاکر ایک دو دن ملے تو کچھ رختِ سفر درست کیا۔ ٹیکسی کے کرایے نے ادھیڑ ڈالا۔ مگر وقت کی کمی کے باعث ٹیکسی لینا ناگزیر امر تھا۔ اس رواداری میں باوجود کوشش

---

[1] مولانا محمد علی جولائی ۱۹۲۶ء میں وفد خلافت لے کر حجاز سے واپس آئے تھے۔ اس سفر میں انھیں حج کی سعادت بھی نصیب ہوئی تھی۔ مولانا مہر صاحب نے انھیں مبارکباد کا خط لکھا تھا۔ دوسرا خط ستمبر میں لکھا تھا اس کے بھی کچھ عرصے کے بعد مولانا محمد علی نے یہ خط لکھا۔ اغلب ہے کہ یہ خط ۱۹۲۶ء کے اواخر کا ہے۔

کے تمھارے مختصر محبّت نامہ کا بھی جواب نہ دے سکا۔ معافی کا خواستگار ہوں۔

یہ معذرت میرے ذمّہ باقی تھی۔ قرضہ ادا کر کے اب تمھارے آخری محبّت نامہ کا جواب مختصراً دیتا ہوں اس لیے کہ رپورٹ کی تیاری میں ہم سب لوگ مشغول ہیں اور ملنے والوں کے ہجوم کے باعث اس کے لیے بھی وقت نہیں ملتا

حج و زیارت پر مبارکباد کا شکریہ قبول کرو۔ بھائی خدا کے گھر اور رسولِ خدا (روحی فداء) کے مرقد منور کی زیارت کو جاتے وقت ہم میں سے گنہگار سے گنہگار بھی (جیسا کہ میں ہوں) نیت کو بخیر کرنے اور رکھنے کی کوشش کرتا ہے' میں نے بھی یہی کوشش کی۔ اب یہ کوشش کامیاب ہوئی یا ناکام رہی اسے وہی خدا جانتا ہے جو نیتوں کا پرکھنے والا ہے۔ اسلام اور خدا کے گھر اور رسولِ خدا کے مولد و مدفن کی بہتری کے لئے جو کچھ ہم کر سکتے تھے ہم نے کیا۔ جو کچھ وہاں دیکھا ہے اور جو جو اثر دل پر ہوا اس کو یہاں آکر بیان کر رہے ہیں اور وہ بھی آئندہ کام کے جاری رکھنے کی غرض سے۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت اتحاد و اتفاق ہے مگر اتحاد و اتفاق اسی وقت اچھا ہے جبکہ حق پر ہو' ورنہ باطل پر اتفاق تو نہایت آسانی سے ہو سکتا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ جو کوششیں ہم سب مسلمانوں کو حق پر متحد کرنے کی کر رہے ہیں ان کو کامیاب کرے۔ ہم اہلِ حدیث یا کسی اور جماعت سے لڑنا نہیں چاہتے مگر جس طرح ضرورت کے وقت احناف کی ایک جماعت کی مخالفت سے ہم نہیں ڈرتے اور ان سے ہم نے اختلاف کیا۔ اسی طرح ضرورت پڑے گی تو اہلِ حدیث کی جماعت کی مخالفت سے ہم انشاءاللہ نہیں ڈریں گے اور اختلاف کریں گے۔ دعا کرو کہ خدا حق سے نہ پھیرے اور کسی جماعت کی باطل پرستی سے ہم کو ان کی تقلید پر آمادہ نہ کرے بلکہ عدل و قسط پر اور حق پر ہم کو قائم رکھے۔ شوکت صاحب کا سلام شوق بھی میرے سلام شوق کے ساتھ شامل ہے اور میری بیوی کی طرف سے بھی تبریک و تہنیت کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ میری صحت یہاں اتنی خراب تھی کہ اگر حج و زیارت اور اسلام کی

خدمت مقصودِ سفر نہ ہوتے تو اتنے دور دراز کا سفر اور وہ بھی بغیر طبی مشیر کی ہمراہی کے ہرگز نہ کیا جاتا مگر الحمد للہ کہ صحت قیاس سے کہیں بہتر رہی۔ البتہ غالب کا ایک شعر صادق آتا ہے ؎

موت ان کی ہے جو بس مر کے وہیں دفن ہوئے
زندگی ان کی جو اس کوچے سے گھائل آئے

ایک بار تو DIABETIC NEURITIS نے فالج کی شکل پیدا کر دی تھی اور موتمر کے دوسرے اجلاس میں اسی باعث تاخیر ہوئی۔ خیال ہوا کہ میاں کی طرف سے بلاوا آگیا اور باوجود اپنے گناہوں کے ان کی رحمت کے تصور سے مطمئن تھا بلکہ خوش اور مگن۔ خیر مر کے وہیں دفن ہونے اور نجدیوں کے ہاتھ سے ہڈیوں کے منتشر کئے جانے، کی نوبت نہ آئی مگر اس کوچے سے گھائل آنے کے سبب بظاہر ایک نئی زندگی پا کر آیا ہوں۔ امید تو یہ ہے کہ دو شگافوں میں سے اس شگاف میں جو مدینہ منورہ میں دیا گیا تھا ذرا سا چھید ہمیشہ باقی رہے گا۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ واسع علیم۔

اب رخصت ہوتا ہوں۔ دیکھو کب ملنا نصیب ہو۔ لاہور اور پنجاب آنے کا ارادہ تو ضرور ہے بشرطیکہ میرے آنے سے کہیں اور انتشار نہ بڑھ جائے اب یہ لکھو کہ "زمیندار" میں ہو یا قطع تعلق کر لیا۔ آئندہ کیا ارادہ ہے؟ والسلام!

تمہارا خیر طلب بھائی
محمد علی

نشاط النساء بیگم حسرت موہانی

(۲۶)

چھنڈواڑہ
۲۳/ فروری ۱۹۱۸ء

میری عزیز و محترم بہن

خدا آپ کو جلد با مراد کرے اور حسرت کی قید کا خاتمہ بالخیر فرمائے۔ آپ سے بہت محجوب ہوں کہ عرصہ ہوا آپ کے محبت ناموں کا جواب نہ دے سکا۔ آپ ضرور مجھ سے سخت خفا ہوں گی۔ مگر میں ضرور آپ سے اپنا قصور معاف کرالونگا یقین کیجئے کہ کسی کو خط لکھ کر اس قدر مسرت نہیں ہوتی جس قدر آپ کو لکھ کر اور نہ کسی کے خط ملنے سے اتنی خوشی میسر ہوتی ہے جتنی آپ کے محبت نامہ کے ملنے سے۔ حسرت کی خداداد ہمت و استقلال و حوصلہ کا معترف و مداح تو پندرہ سولہ برس سے ہوں جب سے انگلستان سے واپس آکر ان سے ملنا ہوا اور باوجود اس کے کہ ایک زمانہ میں میرے اور ان کے سیاسی خیالات میں گونہ اختلاف تھا۔ میں ان کی دوستی کو اپنے لیے باعث فخر و امتیاز سمجھتا تھا اور جب چند غلام سیرت طلبائے سابق نے حسرت کو ۱۹۰۸ء کے بعد اولڈ بوائز ایسوسی ایشن سے خارج کرنا چاہا تو میں نے اس کی سخت مخالفت کی اور ان کی ذلیل کوششوں کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ بعد میں تو ہمارے سیاسی خیالات میں کبھی اختلاف نہ رہا اور ع

من تو شدم تو من شدی من جاں شدم تو تن شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

کا مضمون تھا۔ اگر مجھے اس زمانے میں اپنی کسی کارروائی پر کسی کی اتفاق رائے سے دلی خوشی ہوتی تھی تو وہ حسرت ہی تھے۔ مگر آپ سے محبت پہلے حسرت کے تعلق سے پیدا ہوئی تھی۔ اس سے زیادہ گزشتہ دو سال میں بلا واسطہ خود آپ کی ہمت و استقلال و حوصلہ کے باعث پیدا ہوگئی ہے۔ دل سے آپ

کے لیے دعا نکلتی ہے اور آپ کی جرأت اور ثبات قدم کو دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے اور خود اپنے دل میں طاقت زیادہ پانے لگتا ہوں۔ بہت سے لوگ نظربند ہوئے۔ ان کے بہت سے دوست، احباب اور رشتہ دار تھے۔ سب نے ان نظربندوں کے لیے کچھ نہ کچھ کیا اور حق رفاقت ادا کیا۔ لیکن آپ نے باوجود عورت ہونے کے ان سب کو شرما دیا اور خلق پر آشکارا کر دیا کہ حق رفاقت اس طرح ادا کرتے ہیں۔ حسرت کا مرتبہ ہم سب سے بڑا ہے۔ کیونکہ حسرت نے وہ مصائب نہ صرف بطیب خاطر برداشت کیے ہیں جن سے ہم کو اب تک واسطہ نہیں پڑا ہے۔ بلکہ خود مردانہ وار ان کا ایک طرح مطالبہ کیا اور ان کو دعوت دی۔ حسرت جب چھوٹیں گے۔ تو ان کی عزت و احترام دو برس پہلے کی عزت و احترام سے کہیں زیادہ ہوگا۔ مگر بھائی حسرت سے کہہ دیجیے کہ برادرم باوجود اس ہمت و استقلال کے تمھارا مرتبہ ہماری نظر میں ایک نحیف الجثہ عورت سے کم ہی رہے گا۔ جس کے سینہ میں بہ ظاہر تم سے بھی بڑا دل موجود تھا اور جس نے تمھاری غیر حاضری میں مسلمانوں کو ہمت و استقلال جرأت اور حوصلہ کا وہ سبق دیا جو تم خود آزاد ہو کر نہ دے سکتے تھے اور جو شاید قید ہو کر بھی تم نے نہ دیا حالانکہ مجھ سے زیادہ شاید ہی کوئی اس سبق کی عظمت کرتا ہوگا جو تم نے مصائب کو خود دعوت دے کر ہم کو سکھایا۔

میری پیاری بہن۔ اگر خط لکھنے میں میری طرف سے کوتاہی ہوئی ہے تو اس کو میری ناقدرشناسی پر محمول نہ فرمائیے بلکہ میری کاہلی پر اور سنسرشپ کے باعث میری افسردگی طبع پر۔ اس تین ماہ کے عرصہ میں تو تین بار میں علیل بھی ہوگیا۔ اب مجھ میں بالکل جان نہیں ہے۔ اور کسل و ماندگی ہمیشہ نرغہ کیے رہتی ہیں۔ میری قوت جواب تک امراض کا مقابلہ کر سکتی تھی اب بہت کچھ سلب ہو چکی ہے اور جب کبھی بھی آزادی نصیب ہو آزاد ہو کر پھر میں شاید صحت کے اس درجہ پر نہ پہنچ سکوں گا۔ جو چار پانچ برس پہلے میسر تھا۔ مگر مجھے زندگی کی زیادہ خواہش نہیں۔ اگر تمنا ہے تو اس کی کہ جو دن زندگی کے باقی ہیں اس میں اپنے بیشتر کے بے شمار گناہوں کی تلافی کچھ نہ کچھ کر سکوں۔ مگر

خوف ہے کہ پچھلا حساب تو بے باق نہ ہو سکے گا۔ آگے کو نامۂ اعمال میں تازہ گناہوں کا روز اندراج ہوا کرے گا۔ کاش اپنے وطن اصلی کی طرف لوٹنے سے قبل دینِ رسول اکرمؐ کی تھوڑی بہت خدمت کر لوں۔ اب تو ایک یہی آرزو ہے۔ دیکھیے کب پوری ہوتی ہے اور کیونکر۔

آپ فرماتی ہیں کہ مدراس سے واپسی کے وقت آپ نے والدہ صاحبہ کے نام رائے پور سے یا رائے چور سے تار دیا تھا کہ آپ ملنے کے لیے آنا چاہتی ہیں۔ پہلے جس کارڈ میں یہ مذکور تھا اس کا یہ حصہ مشکل سے پڑھا جاتا تھا اور سنسر صاحب کے پاس جا کر وہ کارڈ پھر واپس نہ آیا۔ مگر بعد کے کارڈ سے یہ امر بالکل واضح ہو گیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ تار ہم کو مطلق نہیں ملا۔ اگر ملتا تو اسی وقت جواب دیا جاتا کہ آیئے اور ضرور آیئے۔ ہمارے مہمانوں کے متعلق قیود ہیں۔ والدہ کے مہمان ان کے پاس آ جا سکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم کو اجازت ان کے مہمانوں سے ملنے کی نہ ملے تو ہم خود کسی دوسری جگہ قیام کریں اور مکان پر والدہ صاحبہ کے پاس ان کے مہمان کو ٹھہرا دیں۔

مگر غالباً آپ کے متعلق تو گورنمنٹ کو اجازت دینے میں عذر بھی نہ ہوتا گو ہم سے ابتداءً یہی کہا گیا تھا کہ کسی کے ملنے میں عذر نہ ہو گا۔ صرف اطلاع درکار ہے۔ یہ ضرور رہا کہ جب آپ مدراس تھیں تو اس سے ایک یا دو روز بیشتر والدہ صاحبہ نے یکایک لوگوں کے اصرار سے کلکتہ[1] جانے کا قصد کر کے براہ رام پور دہلی روانہ ہو گئی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ آپ بھی ہمراہ چلیں۔ مگر آپ کا مدراس جانا۔ اور وہاں کے واقعات بعد کو معلوم ہوئے تو ان کو افسوس باقی نہ رہا بلکہ یہی انسب جانا کہ آپ مدراس گئیں۔ مسز نائیڈو کی پریشانی پر بے اختیار ہنسی آئی۔ بھلا آپ جیسے لوگ کہیں دربار داری کر سکتے ہیں جہاں آپ نے کئی اور بت توڑے ہیں۔ وہاں اچھا ہوا کہ یہ "آداب دربار" کا بت

---

[1] اخیر دسمبر ۱۹۱۷ء میں مولانا محمد علی مسلم لیگ کے اجلاس کلکتہ کے صدر مقرر ہوئے تھے۔ لیکن مولانا اپنی نظر بندی کی وجہ سے اس میں شریک نہ ہو سکے۔ کرسی صدارت پر مولانا کا فوٹو رکھ دیا گیا۔ اس موقع پر لوگوں کا اصرار تھا کہ بی اماں والدہ محمد علی کلکتہ تشریف لائیں اور اجلاس میں شریک ہوں۔

بھی توڑ دیا۔ بقول اقبالؔ ؎

سومنات عقل را محمود عشق

آپ کو تو معلوم ہے کہ میں پردہ کا (یعنی شرعی پردہ کا) کتنا بڑا حامی ہوں اور ہر مسلم کو بھی ہونا چاہیے۔ شیخ عبداللہ کی حمایت کرنے والی بعض خواتین میری اس سختی سے مجھ سے ناراض بھی ہوئیں مگر مجھے رسول اللہؐ کی ناراضی کا ان کی ناراضی سے کہیں زیادہ خیال تھا اور یورپ کی کورانہ تقلید سے میں ہمیشہ سے متنفر تھا۔ مگر میرا خیال عورتوں کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کے متعلق ہمیشہ یہی رہا ہے کہ اس کا حصول ان کے لیے جائز ہی نہیں بلکہ ضروری ہے اور حقوق نسواں کا حامی اسلام اور مسلمانوں سے زیادہ کون ہو سکتا ہے۔ البتہ اسلام دین وسط ہے۔ افراط وتفریط کو اس میں مطلق دخل نہیں۔ اس لیے جو کچھ آپ حسرت اور حسرت سے زیادہ حق کی حمایت کرتی ہیں۔ اس کو میں جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن اور ضروری سمجھتا ہوں آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ بعض مسلمانوں کو والدہ ماجدہ کے اجلاس ہائے کانگریس ولیگ میں جانے میں بھی کسی قدر عذر تھا اور رسمی پردہ کی دلدادگی اس زمانے میں بھی جب کہ دین اور شریعت حقہ خود خطرے میں ہیں بدستور باقی معلوم ہوتی تھی۔ مجھے تو اس کا بھی افسوس ہے کہ انھوں نے کلکتہ میں کیوں ان عذروں کا اتنا بھی پاس کیا اور جو کچھ انھیں فرمانا تھا خود زبانی کیوں نہ فرمایا۔ اگر ایسا کرتیں تو کم از کم ایک فائدہ تو یہ ہوتا کہ لوگوں کو صاف معلوم ہو جاتا کہ وہ کوئی کٹھ پتلی نہیں ہیں جنھیں کل کے بچے نچائیں (معاذ اللہ) جو لوگ ان سے واقف ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ ہم دونوں ان کے پاؤں کے انگوٹھے کے ناخن برابر بھی نہیں ہیں اور جو کچھ ہیں وہ بھی انھیں کا طفیل ہے۔ ایک زمانے میں بعض تعلیم یافتہ مسلمانوں میں یہ فیشن میں داخل تھا کہ خواتین کے مضامین اخباروں میں شائع ہوا کریں اور جلسوں میں ان کی حاضری سے آرائش محفل کی جائے۔ جس زمانے میں لوگوں کو یہ شوق چرایا تھا میں دل ہی دل میں کڑھتا تھا اور اس خیال سے لرزتا تھا کہ دیکھیے یہ فیشن آئندہ کیا رنگ لائے۔ اقبالؔ نے تو ان "پردہ نشینوں" کی خوب خبر لی ہے ؎

شوقِ تحریر مضامین میں گھلی جاتی ہیں
بیٹھ کر پردہ میں بے پردہ ہوئی جاتی ہیں

اور مولانا سید اکبر حسین نے تو اور بھی سخت سست کہا ہے۔ وہ تعلیم یافتہ حضرات جو اس طرح تقلید یورپ پر کمر بستہ تھے۔ اس کو ایک طریقہ مسلمان خواتین کی قابلیت دکھانے کا سمجھتے تھے اور اس الزام کو مٹانا چاہتے تھے کہ ہماری پردہ نشین بیبیاں "پنجرے کی پکھیرو" ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ شیخ عبداللہ کی نمائشوں اور کانفرنسوں کے یہ فیشن منسوخ ہو گیا۔

مگر اس مشکل زمانے میں جب بے پردہ مرد پردوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ اور "شوق تحریر مضامین" بلکہ دھواں دھار تقاریر کے کرنے کا ذوق رفو چکر ہو گیا تھا۔ آپ نے ثابت کر دیا کہ مسلمان بیبیاں اپنے شوہروں کی ایسی رفیق ہوتی ہیں۔ خولہ کی یاد آپ نے تازہ کر دی۔ میرا تو ہمیشہ سے یہی عقیدہ ہے کہ ہمارے انحطاط کے اثر سے اگر کوئی حصہ اب تک محفوظ ہے تو وہ ہماری خواتین ہیں اس گئے گزرے زمانے میں بھی جب کہ "قربانی" ایک لفظ بے معنی رہ گیا ہے جو پریس اور پلیٹ فارموں ہی پر استعمال ہوا کرتا ہے۔ ہماری خواتین ہر شہر اور ہر قصبہ اور ہر قریہ میں بڑی تعداد میں موجود ہیں جو باپ کے لیے یا بھائی کے لیے، شوہر کے لیے یا اولاد کے لیے وہ قربانیاں ہر روز اور ہر گھڑی خوشی خوشی قبول کرتی ہیں جن کا عشر عشیر بھی اگر ہمارے مرد، ملک اور قوم، خدا اور رسولؐ کے لیے گوارا کریں تو ہمارے انحطاط کا آج ہی خاتمہ ہو جائے۔ خیر مرد کچھ کریں یا نہ کریں اب وہ وقت آ رہا ہے کہ ہماری عورتیں اپنی قربانیوں کے دائرے کو وسیع کر کے بلکہ ان کے رخ کو خدا اور رسولؐ کی طرف پھیر کر وہ اصلاح اخلاق جاری کریں گی کہ ہمارے تمام مصائب قومی و ملکی کا خاتمہ ہو جائے گا۔

والدہ ماجدہ تو پھر عمر رسیدہ ہیں۔ مگر اب جوان لڑکیاں کتخدا اور ناکتخدا دونوں خدا اور رسولؐ کے لیے وہ خدمتیں انجام دیں گی کہ مردوں کو خواہ مخواہ شرم آئے گی اور وہ دین مبین کی خدمت کی طرف رجوع کریں گے اس میں انشاءاللہ تعالیٰ آپ کا بڑا حصہ ہو گا اور پھر نہ صرف یہاں بلکہ اللہ میاں کے ہاں بھی نہ

ہماری اس قدر پوچھ ہوگی نہ برادر حسرت کی، بلکہ آپ کی اور آپ کی بہنوں کی۔

میں نے اس خط میں حسرت کی عزت و احترام میں اگر کمی کی ہے تو ان سے کہہ دیجئے، کہ وہ باوجود اس کے کہ ان کے اشعار پڑھتا ہوں اور وجد کرتا ہوں خدا انھیں اجر دے گا۔ کس طرح روح کو تازہ کرتے ہیں۔ ان سے کہہ دیجیے کہ بھائی اگر قید کا یہی نتیجہ ہے تو میں گورنمنٹ کو میموریل بھیجنے کو تیار ہوں کہ برائے خدا و رسولؐ حسرت کو آزاد نہ کیجیے۔ اشعار میں بیڑی کی جھنکار پھر کون سنائے گا۔ مزا تو جب آتا کہ ہم اور وہ ایک ہی سلسلۂ سلاسل[۱] میں مقید ہوتے۔ اور خود ان کی زبانی روز تازہ کلام سننے میں آتا۔ کہیے میرٹھ کا تحفہ کب تک ملے گا۔ للت پور، جھانسی، الہ آباد، نینی، فیض آباد، لکھنؤ سب کا تحفہ تو مل گیا[۲]۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

ہم لوگ خوش ہیں۔ خدا کے فضل سے صبر و شکر کا پیمانہ اب تک خالی نہیں ہوا جب اس کی مرضی ہوگی۔ جسم بھی آزاد ہو جائے گا۔ روح تو پہلے سے کہیں زیادہ آزاد ہے

آخر میں اپنی اہلیہ کی طرف سے معذرت کرتا ہوں کہ اس بار بھی شرف ملاقات انھیں نصیب نہ ہوسکا۔ حمیدہ کی علالت کا سلسلہ برابر جاری رہا اور وہ دہلی سے واپسی کے وقت علی گڑھ جانے لگیں تو معلوم ہوا کہ آپ وہاں نہیں ہیں۔ خیر یار باقی صحبت یار باقی۔ خدا پھر ملائے گا۔

آپ کا عزیز بھائی

محمد علی

مکرر یہ کہ دو تصویریں بھیجتا ہوں۔ بڑا گروپ آپ کے لیے اور ہم دونوں کی تصویر حسرت کے لیے

محمد علی

---

[۱] "سلسلۂ سلاسل" ترکیب کھٹکتی ہے۔ سلاسل، سلسلہ (زنجیر) کی جمع ہے۔ معنی ہوئے "زنجیروں کی زنجیر" یہ لفظاً اور قواعد کے لحاظ سے تو ایک بے معنی ترکیب ہوئی لیکن مفہوم کے لحاظ سے یہ غلط نہیں۔ مراد یہ ہے کہ پابند و مقید کرنے والی وہ زنجیریں جن میں حسرت، محمد علی اور دوسرے ایثار پیشہ اور اصحاب عزیمت جکڑے ہوئے ہیں ایک ہی زنجیر سے جڑی ہوئی ہوتیں۔ [۲] حسرت ان سب مقامات کے جیلوں میں رہ چکے تھے۔ تحفہ سے مراد ان کا تازہ کلام ہے۔ حسرت اس وقت میرٹھ جیل میں تھے۔

پنڈت جواہر لال نہرو

(۱)

(۲۷)

فیری ولا، بھوالی، یو۔پی
۱۹۲۳ء

عزیزی جواہر

میں تم سے بیان نہیں کرسکتا کہ مجھے اپنے صوبے کی پہلی سیاسی کانفرنس میں جو میری رہائی کے بعد پہلی بار منعقد ہو رہی ہے شریک نہ ہوسکنے کا کس قدر افسوس ہے مگر میرے غیر رسمی سے تار کے بعد مجھے اعتماد ہے کہ تم مطمئن ہوگئے ہوگے کہ اگر یہ کسی طرح بھی میرے لئے ممکن ہوتا تو میں یقیناً تمھارے ساتھ ہوتا۔ دہلی سے واپسی کے بعد میری طبیعت بہت زیادہ خراب ہوگئی۔ اور بخار نے جس کی گرفت میں مجھے کئی دن گزارتے پڑے مجھے مجبور کردیا کہ میں الموڑہ جانے کا ارادہ جہاں مجھے پہلی اکتوبر کو جانا تھا، ترک کردوں میں بستر مرگ سے اُٹھا ہی تھا کہ الموڑہ کی ایک مضبوط فوجی کمک نے مجھے ترک موالات کے اس قلعے میں لاکر ڈال دیا اور مجھے اپنے پرانے دوست سر ولیم "مالیس" (مارس)، کے پیچھے بالکل دیوی نیمیسس کی طرح چلنا پڑا۔

جب میں دہلی میں تھا اور یہاں کا موسم خشک اور تابناک تھا، تب میری لڑکی کا ٹمپریچر خاصا نمایاں اور محسوس طور پر گھٹ گیا تھا یعنی سہ پہر میں اوسطاً °۱۰۰ اور شام کے وقت اوسطاً °۱۰۱ رہنے لگا تھا مگر میری واپسی سے کچھ ہی دنوں پہلے کی بات ہے کہ موسم پھر مرطوب ہونا شروع ہوا اور نتیجہ یہ ہوا کہ دس یا بارہ دنوں میں ٹمپریچر پھر بہ تدریج °۱۰۳ تک پہنچ گیا مگر پانچویں تاریخ سے آمنہ کی صحت پھر بہتر ہونے لگی اور اب سہ پہر میں اس کا ٹمپریچر °۱۰۰ اور شام کے وقت °۱۰۱٫۴ رہا کرتا ہے۔ واقعتہً مجھ کو توقع

ہے کہ وہ ماہ اکتوبر میں بہت بہتر ہوگی۔ میں یہ پورا مہینہ اُسی کے پاس گزارنا چاہتا ہوں تاکہ محتاط تیمارداری کے ساتھ اس موسم سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جاسکے۔ بہ قول انگریزی مثل کے: جب سورج چمک رہا ہو گھاس کو اُلٹ پلٹ کر سکھا لینا چاہیے۔ مگر شوکت کی رہائی، جو اب کسی دن بھی ہو سکتی ہے، مجھے برابر متحرک رکھے گی اور اب میں بمبئی پریسیڈنسی کے لئے پابہ رکاب ہوں۔ اگر شوکت اپنی میعاد پوری ہی کر کے رہا ہوئے۔ یعنی ۳۱ر اکتوبر کو، تو ۷ر نومبر سے پہلے میں بھوالی واپس آنے کی امید نہیں رکھ سکتا۔ اس خیال سے فطری طور پر آمنہ مجھے سفر کی اجازت نہیں دے رہی ہے۔ بڑی مشکلوں سے وہ سترھویں اور اٹھارھویں کے لئے مجھے جالندھر جانے دینے پر راضی ہوئی ہے۔ اس غرض سے میں بھوالی سے ۱۵ر کو چلنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مگر چونکہ مولانا عبدالباری (جنھوں نے ازراہِ شفقت و محبّت میرے لکھنؤ نہ حاضر ہو سکنے کو معاف کر دیا تھا اور خود ہی بھوالی تشریف لانے کا ارادہ رکھتے تھے)، دوبارہ آمادۂ سفر ہوئے اور دونوں بار روک لئے گئے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں لکھنؤ ہوتا ہوا جالندھر جاؤں اس خیال سے میں نے یہ انتظام کیا ہے کہ ۱۴ر کو میں بھوالی سے لکھنؤ جاؤں اور ۱۶ر کو وہاں سے جالندھر کو چل پڑوں۔ تم پنجاب میل سے چل کر ۱۶ر کو ضرور میرے ہمراہ ہو جاؤ۔ ہمیں بہت سی باتیں کرنا ہیں اور بہت سے فیصلے کرنا ہیں۔

ازراہِ کرم اپنی کانفرنس کو میری ناگزیر غیر حاضری پر میرا شدید رنج و تاسف پہنچا دو۔ یقین کرو کہ اگر میں آسکتا تو ہرگز ہرگز پیچھے نہ رہ جاتا۔ مجھے امید واثق ہے کہ تمھاری یہ کانفرنس "صوبجات متحدہ" کے نام سے "صوبجات غیر متحدہ" ہونے کا داغ مٹا دے گی۔ اب خود کاشی کے مقدس سرزمین سے پراونشیل کانگریس آمبلی کو ایک وسیع تر اور محکم و استوار تر سنگٹھن کا پیغام ملک کو دینا چاہیے۔ یعنی نیشنل کانگریس کے سنگٹھن کا پیغام جس کا مطمحِ نظر اُس مظلوم، مقہور اور مصیبت کی ماری ہوئی انسانیت کا اتحاد ہو جو مغرب کے ظلم و جور کے ہاتھوں ناقابل بیان اذیتیں اور ذلتیں جھیل رہی

ہے۔ اس کانفرنس سے ہم سب کو شدھ اور صحیح معنوں میں پاک ہو کر نکلنا چاہیئے۔ اس طرح شدھ اور پاک ہو کر کہ ہمارے اندر نارواداری، تعصّب اور تنگ نظری نام کو بھی باقی نہ رہ جائے تاکہ ہم مادرِ وطن کو شدید ترین قسم کی کچل کر اور توڑ مروڑ کر رکھ دینے والی غلامی سے آزاد کرا سکیں۔ اُس غلامی سے جس نے تنہا ہمارے جسموں ہی کو غلام نہیں بنا رکھا ہے بلکہ ہماری روحوں کو بھی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ خدائے برحق تمھاری کوششوں کو کامیابی کا تاج عطا کرے اور اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو تازہ جرأت اور فتحیاب ہونے کا عزم و ارادہ مرحمت فرمائے۔ اگر عہدِ قدیم کی روحانیت کا کوئی جزو بھی کاشی میں باقی رہ گیا ہے تو آؤ ہم اپنے عظیم قائد اور راہنما گاندھی جی کا کام ازسرِ نو شروع کریں۔ اور پورے مذہبی جوش کے ساتھ تمام دنیوی اغراض سے بلند و بے تعلق ہو کر شروع کریں۔ ہندوستان کی نجات، شرق کی نجات اور سچ پوچھو تو پوری انسانیت کی نجات کا راز اسی راہ پر چلنے میں مضمر ہے۔

سب کے لئے پیار اور محبّت اور تمھارے لئے بوسہ ہائے اخلاص

تمھارا محبّت آگیں

محمد علی

(۲)

(۲۸)

کھوالی، یو۔پی

۷ر نومبر ۱۹۲۳ء

عزیزی جواہر

تمھارے پہلی تاریخ کے خط کا بہت بہت شکریہ۔ ہم نے جالندھر، امرتسر اور خصوصاً لاہور میں جہاں کے "لیڈر حضرات" مایوس کن حد تک تنگ نظر واقع ہوئے ہیں۔ تمھاری غیر موجودگی سچ مچ بہت محسوس کی۔ غور کرو، وہ تارکین

موالات جو وکیلوں اور بیرسٹروں سے اصرار کر رہے تھے کہ وہ اپنا پیشہ وکالت چھوڑ دیں۔ آج وہ ایک موالاتی وزیر سے جو ایک مسلمان ہے۔ اس بات پر جھگڑ رہے ہیں کہ سرکاری ملازمتوں میں فی صد کتنی ملازمتیں مسلمانوں کو ملنی چاہئیں اور کتنی ہندوؤں کو! ان لاہوری لیڈروں پر مجھے گاندھی ازم کا کہیں اثر نہیں ملا۔ ستیا نم اور گنتی کے کچھ اور لوگ ضرور ملے جن پر گاندھی ازم کا تھوڑا بہت اثر ہے مگر ان لیڈروں کی اکثریت پر اس فلسفے کا کوئی اثر نہیں ہے۔ یہ وہی پنجاب ہے جس کی رسوائی نے پورے ہندوستان کو بیدار کر دیا! سچ پوچھو تو یہ پنجاب میرے لئے ہمیشہ ایک معمّا رہا ہے۔ کس قدر حیرت و افسوس کی بات ہے کہ وہ لوگ جو بعض موقعوں پر اتنے بہادر رہتے ہیں، جو برطانوی ہندوستانی فوجوں کا جزو غالب ہیں اور جو بہت جلد برافروختہ ہو جایا کرتے ہیں، وہی لوگ اپنی وہ کھلی کھلی ذلتیں اور رسوائیاں جو انھیں برطانوی راج کے ہاتھوں اٹھانی پڑیں اتنی جلدی بھول جائیں اور اپنے بدیسی، غاصب وجابر فرمانرواؤں کا جبر وظلم برداشت کرتے رہنے پر تو راضی و قانع رہیں مگر چھوٹی چھوٹی اور حقیر چیزوں کے لئے باہم دست و گریباں رہنے سے باز نہ آئیں۔ یہ بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آتی۔ ہم لوگوں نے وینکٹا پیّا پر زور ڈال کر اُن سے یہ بات منوالی ہے کہ آئندہ مجلس عاملہ کا اجلاس امرتسر میں سکھوں کے مسئلے پر غور کرنے کی غرض سے منعقد کیا جائے۔ اس اجلاس میں ہم پنجاب اور یو پی کے فرقہ وارانہ اختلافات پر بھی غور کریں گے۔ اس میں کوئی شک و شبہہ نہیں ہے کہ اس موقعے پر تمھاری موجودگی نہایت ضروری ہے۔ اگر تم پھر بیمار پڑے تو میں تم کو کبھی معاف نہیں کروں گا؛ اپنی صحت بحال رکھو اور امرتسر میں ایک مناسب فیصلے تک پہنچنے میں ہمارا ہاتھ بٹاؤ۔ میں لکھنؤ میل سے ۱۲ کو امرتسر پہنچ جاؤں گا۔

الٰہ آباد میں ریڈنگ کے استقبال کی حقیقت سے اگر تم نے مجھ کو مطلع نہ کیا ہوتا تو میں تو "لیڈر" کے پرجوش وتابناک بیانات پڑھ کر اس شبہہ میں

پڑجاتا کہ الہ آباد تمھارا، تمھارے والد کا اور ان نصب العینوں کا وفادار نہیں ثابت ہوا جو تم نے اس کے سامنے رکھے تھے۔ مگر ہم "لیڈر" کو بھی خوب جانتے ہیں! اس کے بمبئی کے نامہ نگار نے کمال بے حیائی کے ساتھ یہ اعلان فرما دیا تھا کہ میرے بمبئی پہنچنے پر زیادہ سے زیادہ پچاس آدمیوں نے اسٹیشن پر میرا استقبال کیا۔ وہ تو کہیئے کہ ہر جگہ موجود رہنے والے فوٹو گرافر اور سینما کے آدمی بھی اسٹیشن پر موجود تھے اور اُن کی لی ہوئی ایک تصویر بمبئی کرانیکل کے سنڈے ایڈیشن نے شائع کر دی۔ اس تصویر میں دو ہزار سے لے کر تین ہزار اشخاص تک شاید تم شمار کر لو گے۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ جو گاڑی میرے لئے اور والدہ کے لئے آئی تھی اُس گاڑی تک میں بڑی مشکلوں سے پہنچ پایا۔ اتنی بھیڑ تھی۔ خیر "لیڈر" اور اس "جھول" کے دوسرے پرچوں کو ہم جانتے ہیں۔

پیام محبت اندو[1] کے لئے، مسز جے[2] کے لیے، "سروپ آپا"[3] اور والد کے لیے،

تمھارا محبت آگیں
محمد علی

(۳)

(۲۹)

نیشنل مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ　　　　نجی
۱۵ / جنوری ۱۹۲۴ء

عزیزی جواہر
تمھارا خط مجھے ابھی ابھی ملا ہے۔ میں تمھارے اس بے محل انکسار پر ایک

---

[1] مسز اندرا گاندھی کا بچپن کا پیار کا نام۔
[2] مسز جے کا مطلب "مسز جواہر لال" یعنی کملا نہرو۔
[3] پنڈت جی کی بہن مسز وجے لکشمی پنڈت کا کنوار پنے کا نام۔

یا پھر" نہایت غصہ اور طیش کے ساتھ" احتجاج کروں گا اور ضرور کروں گا پیارے جواہر، جانتے ہو مجلس عاملہ میں میں تمہاری موجودگی سکریٹری کی حیثیت سے کیوں پسند کرتا ہوں[1]؟ صرف اس لئے پسند کرتا ہوں کہ مجلس کے بعض ارکان سکریٹری کی حیثیت سے تمہاری موجودگی کو بے اعتمادی اور ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ یہ حضرات خود مجھ پر اعتماد رکھتے اور مجلسِ عاملہ میں بہ حیثیت صدر خود میری موجودگی کو پسند کرتے ہیں؟ میرے یہ دوست مجھ سے کیا کرانا چاہتے ہیں۔ اس بات کا علم تو مجھے دہلی میں ہوا اور مجھ کو سخت تکلیف ہوئی۔ یہ حضرات میری قیادت بڑے ہی خوشامدانہ اور دل خوش کن لفظوں میں تسلیم کیا کرتے ہیں مگر حقیقت میں چاہا یہ کرتے ہیں کہ میں اُن کی قیادت نہ کریں بلکہ وہ خود میری قیادت و رہبری فرمایا کریں۔ جب کبھی میں نے اُن کے سامنے کوئی تجویز رہبرانہ قسم کی رکھی ہے تب یہ لوگ کترا کر نکل گئے ہیں۔ صدر کی حیثیت سے میری جو ذمہ داریاں ہیں میں ان کو اٹھا کر طاق پر تو نہیں رکھ سکتا، اور یہ جو میں اپنے آپ کو مجبور پا رہا ہوں کہ پارٹی بازی کی 'تنگ نظری سے بچنے کی غرض سے تمہاری' کچلو کی' دیش پانڈے کی' اور بعض دوسرے ارکانِ مجلسِ عاملہ کی پناہ ڈھونڈھوں سو میری یہ پناہ گزینی ٹھیک ٹھیک " حیوانات کو بے رحمی سے بچانے" کی قسم کی ایک چیز ہے۔

یقیناً ہماری مجلسِ عاملہ کوئی بڑی متحد الخیال مجلس نہیں ہے۔ اور اس سے کوئی بات آسانی کے ساتھ نہیں منوائی جا سکتی۔ مگر یہ "کام کرے گی" اور یہ کام خصوصاً تم جیسے لوگوں کے بل بوتے پر ہو گا جن کی حق پرستی اور غیر جانب داری پر اعتماد کرنا تجربے نے مجھے سکھا دیا ہے۔ ہمارا یہ آرکسٹرا اس فارسی مثل ہی کے مطابق کام کرے گا۔

مصرع من چہ سرایم و تنبورہ من چہ می سراید

---

[1] مولانا محمد علی اس زمانہ میں کانگریس کے صدر اور جواہر لال نہرو اس کے ایک جنرل سکریٹری تھے۔

"میں کون سا راگ الاپ رہا ہوں اور میرا تنبورہ کون سا سُر بجا رہا ہے"۔ مگر اس کا کوئی علاج نہیں ہے اور میں تمھارے کہے بغیر اس بات کو جانتا ہوں کہ تم پچھلی حماقتوں پر آنسو بہانے کے قائل نہیں ہو۔ تو اب جی بُرا مت کرو۔ خوش رہو اور آؤ کام شروع کیا جائے یہ کیا ہم بددل ہو چکے ہیں؟" ہرگز نہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا دفتر ابھی نہیں آسکا ہے اُن کو تار دو کہ رختِ سفر باندھیں اور روانہ ہو جائیں۔ میرا خیال ہے کہ میری چھٹیاں بھی ختم ہو چکیں اور مجھے تمام صوبوں سے خط و کتابت شروع کر دینی چاہیے نیز اپنی کمیٹی کے ممبروں سے فرداً فرداً۔ میرے پاس کوئی اچھا مختصر نویس ٹائپسٹ نہیں ہے، جو میرے پرسنل اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کرے۔ اس حالت میں تمھیں یہ کرنا پڑے گا کہ سکریٹریٹ کے کلرکوں میں سے ایک کلرک، جس کو تم سب سے بہتر سمجھو، میرے پاس بھیج دو۔ اس ترکیب سے مجھ کو اس بات کا موقع مل جائے گا کہ اگر وہ کام کا آدمی نہ نکلا اور ہم اس کی تنخواہ پر روپیہ صرف برباد ہی کرتے نظر آئے تو میں اسے نکال باہر کروں گا۔ میرے لیے ایک واقعی اسٹینوگرافر کی تلاش میں بھی رہو۔

درخواستوں سے متعلق مجھے موقع دو کہ سیکڑوں درخواستوں میں سے جو چند تم نے چنی ہیں اُن میں سے کچھ درخواستوں پر ایک نظر میں بھی ڈال لوں۔ ضروری ہے کہ ہم اپنا معیار اونچا رکھیں۔ اس لئے کہ نالائقوں کی ایک پوری فوج کے مقابلے میں چند ہوشیار اور لائق آدمی بہتر ثابت ہوا کرتے ہیں میں شیروانی کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ انڈر سکریٹری شپ کی جگہوں میں سے کوئی ایک جگہ قبول کرلیں، مگر ظاہر ہے کہ یہ وہ جگہ نہ ہو گی جس کی تمھیں سخت ضرورت ہے یعنی اس شخص کی جگہ جو کانگریس کے روزمرّہ کے جملہ فرائض اپنے ذمے لے لے۔ شیروانی کانگریس کے صیغۂ ممبرشپ کے چارج کے لیے اچھا آدمی ثابت ہو گا اس لئے کہ وہ تمام صوبوں کو اپنی اپنی ممبرشپ بڑھانے کے لیے برابر لکھتے رہنے اور تاکید کرتے رہنے کے سوا وقتاً فوقتاً تمام

صوبائی مرکزوں میں پہنچ کر یہ بھی دیکھ سکتا ہے کہ صوبے اس کام سے غافل نہیں ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ تم ایسے آدمی چاہتے ہو جو بہت زیادہ حرکت میں نہ رہیں بلکہ ایک جگہ جم کر کام کریں۔ مگر ہمارے یہاں کچھ ایسے صیغے بھی ہیں جہاں انڈر سکریٹری کو مرکز کے انسپکٹر جنرل یا کمشنر کی صورت سے کام کرنا اور شکست رد اور کاہل صوبوں کو کھڑکھڑاتے رہنا پڑے گا۔

تم نے اپنے صوبے کے دیوالیہ ہونے کی جو شکایت کی ہے سو تقریباً یہی حال تمام دوسرے صوبوں کا بھی ہوگا۔ ممبرشپ فیس خواہ کم ہی آئے مگر کچھ تو آنی چاہیے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم تیزی کے ساتھ ممبروں کی تعداد بڑھائیں اور صوبوں کو اس کے لیے برابر لکھتے اور تاکید کرتے رہیں مگر تلک سوراج فنڈ کو ازسرِنو زندہ کرنا چاہیے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ اس کام کو یو۔پی سے شروع کروں۔ میں یو۔پی کی خلافت کمیٹیوں کو جن کا "مہربان" دوستوں نے مجھے صدر بنا رکھا ہے، لکھ رہا ہوں کہ وہ کانگریس کمیٹیوں سے مل کر اور ان کے مشورے سے مجھے دعوت نامے بھجوائیں اور لکھیں کہ اگر میں اُن کے دعوت ناموں پر حاضر ہوں تو وہ مجھے کیا نذرانے دیں گی۔ کیا تم یو۔پی کے ایک مختصر سے دورے میں میرے ساتھ رہ سکتے ہو یا تم اپنے دفتر کی تنظیم کی غرض سے الہ آباد ہی میں جمے رہنا چاہتے ہو؟ ایک اچھے ہندو کا میرے ساتھ رہنا ازبس ضروری ہے۔ اگر تم خود نہیں آسکتے ہو تو پھر کس کو تجویز کرتے ہو؟

مجلس عاملہ کی میٹنگ کے لیے جنوری کے اخیر ہفتے میں کوئی مناسب تاریخ مقرر کردو۔ اس لیے کہ اس سے پہلے کوئی میٹنگ ممکن نہ ہوگی ہاں اگر مہاتما جی کی علالت نے ہمیں اس سے پہلے ہی پونا جانے پر مجبور کردیا تو ظاہر ہے کہ میٹنگ کچھ پہلے ہی کرلینی پڑے گی۔ اور کیوں نہ یہ میٹنگ ہم پونا ہی میں بلالیں؟

مجھے تمہارا وہ تار ملا جس میں تم نے لاجپت رائے کا تار نقل کیا ہے۔ آخر

انھوں نے ہمیں سمجھ کیا رکھا ہے جو ہم سے وہ مہاتما جی کی رہائی کا ایک قومی مطالبہ منظم کرانا چاہتے ہیں؟ میرا تو یہ خیال ہے کہ میرے دوست اُس درجۂ ترکِ موالات کا جسے انھوں نے کبھی قبول کر لیا تھا، ذرّہ ذرّہ اپنے قلب و دماغ سے نکال پھینکنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ جس حکومت نے علالت کی بنا پر خود ان کو رہا کیا وہ شاید مہاتما جی کو اُن سے کہیں زیادہ سنگین علالت کے بعد بھی قید و بند میں نہ رکھے۔ مگر جہاں تک مہاتما جی کی رہائی کے لیے مطالبے کا تعلق ہے سو اس کو ہمیں اپنے مالویاؤں اور رگوڑوں کے لیے چھوڑ دینا چاہیے اور جہاں تک لالہ جی کا تعلق ہے سو اُن کے لیے بہتر ہوگا کہ وہ کھل کر اُسی جماعت کے ساتھ ہو جائیں جس سے اُن کا تعلق ایک ظاہری چیز ہے۔ کیا یہ ایک عجیب سی بات نہیں ہے کہ جو لوگ روح و معنی کے لحاظ سے مہاتما جی کے شدید ترین مخالف رہے ہیں وہی آج حکومت سے مہاتما جی کی رہائی کے مطالبے میں سب سے زیادہ بلند آواز ہیں۔ ہمارا تو مہاتما جی کی رہائی سے متعلق صرف ایک مطالبہ ہے، مگر یہ مطالبہ حکومت سے نہیں ہے۔ قوم سے ہے۔

اندو اور تمھاری ہمشیر کو پیار، اور تمھاری والدہ اور بیوی کے لیے محبت آگیں ادب و احترام

تمھارا محبت آگیں

محمد علی

(۴)

(۳۰)

جامعہ ملیہ اسلامیہ، علی گڑھ

۲۱/ جنوری ۱۹۲۴ء

عزیزی جواہر

اس خیال سے کہ ممکن ہے کوئی براہِ راست مجھے تار سے مطلع نہ کرے میں مالویہ جی کے ساتھ تمھاری گرفتاری کی خبر کے لیے ہر روز صبح کو لیڈر بغور دیکھا

کرتا تھا ۔ مگر آج کے پرچے نے میری تشویش دور کردی اس لیے کہ میں نے دیکھا کہ پنڈت جی نے بالآخر گورنر کو "رام کرہی لیا" اور وہ نہ صرف پریاگ آیا بلکہ تم کو اپنے ساتھ گورنمنٹ ہاؤس لے گیا اور وہاں تم سے خوب گھل مل کر تمھاری میونسپلٹی کی اُس قرارداد پر باتیں کرے جس کی رو سے میونسپلٹی گنگا، جمنا اور اُس تیسری نظر نہ آنے والی مقدس ندی کا چارج خود لے لینا چاہتی ہے جو سنگم کے قریب ان دونوں دریاؤں کے نیچے ہی نیچے بہہ کر اس مقام کو تربینی بناتی ہے ۔ اب تم بتاؤ کہ میں نے صورت حال ٹھیک سمجھی ہے یا نہیں ؟ یا تم اب بھی، اگر اور کسی غرض سے نہیں تو اس "بدقسمتی یا مصیبت" میں پنڈت جی جیسے شخص کو اپنا ایک "اجنبی، ہم بستر" بنا کر ایک نیا تجربہ کرنے کی غرض سے' اب بھی جیل جانے پر تلے ہوئے ہو ؟ اگر کل کے "لیڈر" میں تم گرفتار نہ کرلیے گئے تو میں تمھارے تینوں خطوں کا جواب کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں ۔ مگر اس وقت میں تمھیں اتنا بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں ۲۴ر کی شب میں دہلی جارہا ہوں اور وہاں سے ۲۵ر کی شب میں اکسپریس سے کلیان کو اور وہاں سے ۲۷ر کی شب میں ملنے والی ٹرین سے اپنے باپو سے ملنے کی غرض سے پونا جارہا ہوں ! اور ایسا میں اس لیے کررہا ہوں کہ جب میں نے ۱۶ر کو دریافت کیا کہ کیا میں آسکتا ہوں تو مجھے جواب ملا کہ تم آسکتے ہو مگر باپو نہیں چاہتے کہ ہم میں سے کوئی اپنی جگہ چھوڑ کر ہٹے ۔ بعد میں حکیم جی اور انصاری کو بھی بتایا گیا کہ یہ لوگ بھی میرے ساتھ آنا چاہیں تو آسکتے ہیں مگر کسی قسم کا مظاہرہ نہ ہونا چاہیے ۔ ہر قسم کے شور وغل سے بچنے کے خیال سے ہم نے کسی سے کچھ کہے بغیر جانے کا ارادہ کیا، مگر انصاری نے ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے ہمیں فوراً چل پڑنے سے روک دیا کہ مبادا ہمارے جذبات جن کو دبایا نہیں جاسکتا باپو پر اثر انداز ہوں اور ان کو ابھی سے بہت زیادہ تھکا دیں ۔ اس لیے ہم نے کچھ دنوں بعد جانے کا فیصلہ کیا اور ۲۷ر کو پونا پہنچنا طے پایا ۔ اس طرح میں باپو کے حکم کے مطابق اپنی جگہ چھوڑ کر بھی نہ ہٹوں گا ۔ اس لیے کہ ۲۹ر اور ۳۰ر کو بمبئی میں میری موجودگی ضروری ہے ۔ اور باپو کی قوت

بھی اس وقت تک کسی قدر بحال ہو جائے گی۔ اب یہ خط میں تم سے یہ پوچھنے کی غرض سے لکھ رہا ہوں کہ تم بھی ان "تین بندو قچیوں" کا ساتھ دینا پسند کروگے اور راہ میں کہیں سے یا کلیان اسٹیشن سے ہمارے ساتھ چل کر، ۲۷ر کو باپوسے ملوگے؟ اگر آسکتے ہو تو فوراً تار دو اور بتاؤ کہ کہاں سے ہمارے ساتھ ہوگے۔ مگر دیکھنا یہ بات کسی اور سے نہ کہنا، یعنی بجز اُن دوستوں کے جو اس بات کو اپنے ہی تک رکھ سکتے ہوں۔ باقی کل۔

تمھارا محبت آگیں

محمد علی

تکملہ: آج کل میں "ساسٹر آئی ٹیس" میں مبتلا ہوں۔ یہ ایک ایسی وبا ہے جس میں تمام "اعتدال پسند" مبتلا ہیں اگرچہ وہ مزدور پارٹی کو اس کی فتح پر مبارکباد بھی دے رہے ہیں۔ شاستری کی حماقت نے میرا دو دن کا کام خاک میں ملا دیا۔ اور اب جب کہ میں نے اپنے اُس تار کا جواب نہ پاکر جو میں نے انھیں دیا تھا، چار دن کے انتظار کے بعد اُن کے بیان کے جواب میں اپنا ایک بیان بھیجا ہے تو آپ نے خط کے ذریعے معافی مانگی ہے!!! مجھے اس بیان کی اشاعت روک لینی پڑی۔

(۵)

(۳۱)

ماتھران

۱۵ر جون ۱۹۲۴ء

بمبئی

عزیزی جواہر

میں تمھیں اتنے دنوں تک کوئی خط نہیں لکھ سکا۔ تم میری اس کوتاہ قلمی کو معاف کردو۔ تم جانتے ہو کہ مجھے اپنی بیٹی کے انتقال کے بعد کچھ آرام کی کس قدر ضرورت تھی۔ مگر تم شاید اس بات کو محسوس کرتے ہوگے کہ اوائل

اپریل میں شوکت کی علالت کے عود کر آنے کے سبب میں اس آرام سے کس طرح محروم رہ گیا۔ ایک شوکت کی علالت ہی نے مجھے آرام سے محروم نہیں رکھا، جُو ہُو کی گفتگو اور میرا بالائی ہند کا سفر جو مجھے ۲۰ ر مئی کو ماتھران سے لے گیا اور ۳ ر جون کو یہاں واپس لے آیا، یہ حوادث بھی میرے آرام میں حائل ہوئے۔ مجھ کو اپنی چھٹی یا آرام کے دن "ٹکڑوں میں" لینے پڑے مگر میں ان چھٹی یا آرام کے دنوں کا اس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا پسند نہیں کرتا تمھارے خطوط نمبر ۶۵۰/۳۰، ۷۵۰/۲۵، ۷۵۲/۷۲، اور ۷۸۶ یہ سب اُس وقت پہنچے جب میں دہلی، لاہور، علی گڑھ، رام پور (صرف ریلوے اسٹیشن بر ٹُرِسٹِس قلمرو!) نینی تال اور لکھنؤ کے دورے پر تھا۔ اور خط نمبر ۸۲۴/۵۳ اُس وقت ملا جب میں اس طویل سفر کی ماندگی دور کر رہا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ خطوط جس موضوع پر ہیں اُس سے متعلق میں نے کوئی بات تمھیں سمجھانے کی نہیں پائی، اس کے معنی یہ ہوئے کہ کانگریس کے کام میں کوئی واقعی رکاوٹ نہیں پڑی (کانگریس کے کام میں اُس کے صدر حضرات کی سُستی سے کبھی کوئی خرابی یا رکاوٹ واقع نہیں ہو سکتی اگر وہ اپنے عہد میں اتنے عقل مند ہوں کہ ایک محنتی" کام کرنے والے سکریٹری کا انتخاب کر سکیں) تمھارا آخری خط نمبر ۸۶۲/۴۰ جو مہاراشٹر میں انتخابات پر کونڈا وینکٹاپیا جی کے فیصلے سے متعلق ہے اُس سے اگرچہ یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس معاملے میں خود مجھے کچھ کرنا پڑے گا، پھر بھی وہ کوئی شگون نیک نہیں لایا، اور اب دیکھو قسمت کی سی قطعیت کے ساتھ مانڈلیک (؟) کا پوسٹ کارڈ آدھمکا ہے۔ جو بالآخر مجھ پر حرکت و عمل کے دورے سے طاری کر دینے میں کامیاب نظر آ رہا ہے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاسوں میں فیصلے دینے کو میں بہت بُرا سمجھتا ہوں لیکن ایسے فیصلے اگر پیشگی دینے پڑیں تو اس سے بدتر کوئی بات نہیں ہو سکتی اس کے متعلق میں نے تم کو علیحدہ لکھا ہے اور جو خطوط میں نے پارانجپائی اور مانڈلیک کو لکھے ہیں ان کی نقلیں بھی منسلک کر دی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اس باب میں تم مجھ سے اتفاق کرو گے کہ دفعہ ۱۹ کا آخری فقرہ کسی خاص صوبے

کے نمایندوں کی ٹولی سے متعلق نہیں ہے بلکہ وہ پوری آل انڈیا کانگریس کمیٹی سے متعلق ہے۔ گمان غالب ہے کہ مانڈلیک میرا فیصلہ پسند نہ کریں گے اور میں نے اگر اور کسی غرض سے نہیں تو "صلح و آشتی" ہی کی غرض سے، ان کے گروہ یا جتھے کو اجازت دے دی ہوتی کہ وہ آئیں اور احمد آباد میں ہمارے ساتھ ہو جائیں مگر "صلح و آشتی" مجھے میسر آنے والی نہیں ہے۔ اس لئے میں نے فیصلہ کر لیا کہ قانون کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالوں گا۔ جو صوبہ اپنے نمایندے وقت کے اندر یا قاعدے کے مطابق نہیں چن سکتا وہ دنیا کی شکایت نہیں کر سکتا اگر وہ بغیر کسی نمایندگی کے رہ جائے۔ اور اگر ہم اس کے پرانے نمایندوں کو بدستور دعوت نامے بھیجتے رہے تو وہ یوں ہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے گا اور نئے نمایندوں کے انتخاب میں عجلت و تندہی سے کام نہ لے گا اس کو جو کچھ شکایت ہو سکتی ہے وہ صوبے کی تنقیدی جماعت سے ہو سکتی ہے۔ میری اپنی ہی پریشانیاں بہت ہیں، دوسروں کی پریشانیاں میں اپنے سر کیونکر لے لوں۔ ان باتوں کے باوجود مجھے اندیشہ ہے کہ مسٹر مانڈلیک مجھے نہ بخشیں گے۔

مگر زیادہ ناگزیر پریشانی تو وہ ہے جس کے ذمہ دار مہاتما جی ہیں۔ تم اس کے متعلق بہت خاموش رہے ہو۔ شوکت کے سوا میری اس پریشانی میں کسی نے حصہ نہیں لیا۔ اچھا تو اب مجھے بتاؤ تمھارا کیا خیال ہے۔ میں نہیں جانتا کہ باپو سے میری جو گفتگو ہوئی اس کا کوئی اثر بھی ہندو مسلم تنازع پر پڑا یا نہیں۔ اگر میں نے اس قضیہ کا مسلم پہلو جو میرے کانوں تک پہنچا تھا۔ اُن کی خدمت میں عرض نہ کر دیا ہوتا تو وہ اس کے متعلق تقریباً کچھ نہ جان پاتے اس لئے کہ میرا خیال ہے کہ کچھ زیادہ مسلمانوں نے اس کے متعلق ان سے خط و کتابت نہیں کی۔ چونکہ میں بھی اپنے ذاتی علم کی بنا پر اُن سے کچھ نہیں کہہ سکا اس لئے میری گفتگو کا صرف اتنا اثر ہوا کہ اُن کے علم میں یہ بات آگئی کہ اس قضیئے کا ایک مسلم پہلو بھی ہے۔ ایک اعتبار سے، بہ ہر صورت، مجھے اس امر کا یقین ہے کہ میں اُن کو مطلق متاثر نہیں کر سکا اور ایسا ہی مزاج اُن کے "تقدس مآب بھائی" پنڈت مدن موہن مالویہ کا ہے۔ وہ ایسے قضیوں سے ہم سب سے بہتر طریق پر پیچ

کر نکل آیا کرتے ہیں! باوجود اس کے میرا اور شوکت کا خیال تھا کہ باپو اس شریف الطبع پنڈت کی نسبت کچھ اور ہی خیال رکھتے ہیں۔ باپو جو کچھ ان کی نسبت فرمایا کرتے ہیں اگر یہی ان کا عقیدہ بھی ہے اور اس پر کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ تو مجھے بہرحال مستقبل قریب سے نا اُمید ہو جانا چاہیے۔ میں نے اس معاملے پر تمھارے والد سے دل کھول کر اور صاف صاف گفتگو کی تھی اور انھوں نے مجھ سے فرمایا تھا کہ وہ بڑی حد تک مجھ سے متفق ہیں کہ مالویہ جی نے گاندھی اِزم یا گاندھیائی مسلک کو شکست دینے کا تہیہ کر لیا ہے اور چوں کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے مشترک رہنما نہیں ہو سکتے، وہ تنہا ہندوؤں کے رہنما بننا چاہتے ہیں۔ ہندو مسلم اتحاد اُن کا نصب العین نہیں ہے۔ میرے پیارے جواہر، خدا شاہد ہے کہ مسلمانوں میں بھی مالویہ جیسے لوگ موجود ہیں، اور وہ مجھ سے اور میں اُن سے خوش نہیں ہوں۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ ایسے لوگ اپنی نااہلی کی وجہ سے نیز اس وجہ سے کہ قومی خدمت، ایثار اور قربانی کی بنا پر ان لوگوں کو کوئی اچھی اور بجا طور پر حاصل کی ہوئی شہرت میسر نہیں ہے مسلمانوں پر وہ اثر نہیں رکھتے جو پنڈت جی اپنے فرقے کے بہت سے لوگوں پر رکھتے ہیں۔ اگر پنڈت جی بالکل ویسے ہی ہیں جیسا کہ باپو ان کو بتایا کرتے ہیں تو پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تم کو اور تمھارے والدِ محترم کو کس زمرے میں رکھوں میں نے تو تم دونوں اور پنڈت جی کے درمیان قطبین کا بُعد پایا ہے۔ مگر ہندو مسلم تناؤ اس وقت میرے لیے کسی فوری فکر و تردّد کی چیز نہیں ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ کشاکش اتنی جلدی دور نہ ہو گی جتنی جلدی آ ـ کے دور ہو جانے کی میں نے ابتدا میں امّید کی تھی۔ اس وقت جو چیز مجھے سب سے زیادہ پریشان رکھتی ہے وہ سوراجیوں سے متعلق باپو کا "بجلی کا کڑکا" ہے جس کو میں آتا ہوا دیکھ رہا تھا مگر پھر بھی امّید لگائے ہوئے تھا کہ شاید نہ آئے۔ تمھارے والد اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارے جیسے لوگوں نے سوراجیوں کے لیے حالات کو آسان تر بنا دینے میں کچھ نہ کچھ مدد ضرور کی ہے اگرچہ ہماری کوششوں کا جو اندازہ انھوں نے لگایا ہے وہ کسی قدر بے دلانہ اور کمزور د ناتمام ہے، اور یہ اس لیے کہ

وہ ہماری ان کوششوں کا اندازہ نتائج کو سامنے رکھ کر لگاتے ہیں۔ خود ان کوششوں کی نوعیت کو سامنے رکھ کر نہیں لگاتے، اور اُن کی پوزیشن کے آدمی ایسا ہی کرنے پر طبعاً مائل بھی ہوا کرتے ہیں۔ مگر اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ ہم "تیر" کا رخ پھیر دینے میں قطعاً ناکام رہے کہ یہ "تیر" کسی حد تک "ناگہانی" تھا۔ میں جُوہُو کئی بار گیا۔ جب میں آخری بار گیا تب بالکل اخیر میں باپو نے مجھے اور شوکت کو اپنا ارادہ بتایا اور میں نے واپس آکر باپو کے اس ارادے سے تم کو مطلع کر دیا۔ جب باپو نے مجھ سے اپنے اس ارادے کا ذکر کیا تب میں ایک موہوم سی امّید رکھتا تھا کہ باپو کے دل میں اِک خیال آ گیا ہے جس کا وہ ذکر کرتے ہیں، ممکن ہے وہ اب بھی اپنے اس ارادے کو ترک کر دیں ہم نے اُسی وقت باپو کو یہ بات سمجھائی تھی کہ برطانوی کابینہ کی تمثیل صحیح نہیں ہے بلکہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی؛ برطانوی کابینہ کی نسبت برطانوی دارالعوام سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔ اور واقعہ تو یہ ہے کہ یہ تمثیلات تمام غلط ہیں اس لئے کہ ہماری آل انڈیا کانگریس کمیٹی ایک وفاقی جماعت یا ادارہ ہے اور نو چینجرز (مخالفین تبدیلی)، اگرچہ کانگریس اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں اکثریت رکھتے ہیں مگر یہ اکثریت ان کو تمام صوبائی کمیٹیوں میں حاصل نہیں ہے اور یہ ایک عجیب سی اور بالکل انوکھی سی بات معلوم ہوتی ہے کہ صوبوں کی اکثریتوں کو حکم دیا جائے کہ وہ اقلیتوں کے حق میں مستعفی ہو جائیں۔

کیا میرا یہ خیال درست نہیں ہے کہ اس معاملے میں تم بھی باپو سے اتفاق نہیں رکھتے؟ اگر بتا سکتے ہو تو مجھے بتاؤ۔

مگر باپو کی تجویز کے ذاتی حُسن و قبح سے علیحدہ اُس کے "قانونی یا غیر قانونی" ہونے کا بھی ایک سوال ہے۔ کیا کوئی ایسا قانون ہے جو سوراجیوں کو باہر آ جانے پر مجبور کر دے؟ کیا آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی کوئی قرارداد اُس کے کسی رُکن کے سوت نہ کاتنے یا نہ دھنلنے کو اُس کے مستعفی ہو جانے کے برابر قرار دے سکتی ہے؟ مجھے ایسا دکھائی دے رہا ہے کہ باپو کی تجویز کے ذاتی حُسن و قبح کے بارے میں میری رائے کچھ بھی ہو، کانگریس کے صدر ہونے کی حیثیت سے میرا

پہلا فرض اُس کے قانونی پہلو پر غور کرنا ہے۔ تم کیا کہتے ہو؟ اور تمھارے خیال میں قانون کیا ہے؟

مجھ کو یقیناً باپو سے اتفاق ہے کہ بناوٹ اور تصنع کو اب ختم ہو جانا چاہیے ہم نے تعمیری پروگرام کا یہ محض "زبانی احترام" بہت دنوں تک برداشت کیا اور میرا ضرور یہ خیال ہے کہ بہت سے کانگریسی ایسے ہیں جو اس پروگرام کا تقریباً کوئی احترام نہیں کرتے، مگر یہ لوگ اپنی اس گستاخی و بدعقیدگی کا اظہار صرف نجی صحبتوں اور دوستوں اور یاروں کے مجمعوں میں کیا کرتے ہیں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب تک ہم خود یہ تعمیری کام تقریباً مذہبی جوش و عقیدت کے ساتھ نہ کرنے لگیں گے تب تک ہم پورے ملک کو اپنے تعمیری پروگرام کے ماتحت کام کرنے پر کیوں کر آمادہ کر سکیں گے (لفظ تقریباً تمھاری اُس جھنجھلاہٹ کی رعایت میں بڑھا دیا گیا ہے جو تمھیں میری مذہبیت کے خلاف رہا کرتی ہے)، تاہم میں سمجھتا ہوں کہ باپو کی منطق میں کہیں نہ کہیں کوئی جھول ضرور ہے۔ بہر نوع، مجھے کچھ مخالفین تبدیلی (نوچینجرز) کے چہروں پر، جو سوراجیوں کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے، ایک نامبارک سی خوشی دکھائی دیتی معلوم ہو رہی ہے۔ باپو نے سوراجیوں کو جو سرزنش فرمائی تھی اُس کا لب و لہجہ نرم کرا دینے میں جو تھوڑی بہت ہم سے بن آئی تھی وہ باپو کے سب سے اخیر اعلان کی رو سے اُن کے کوُ ذات قرار دے دیئے جانے میں غائب ہو کر رہ گئی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ سوراجیوں کے ساتھ یک گونہ تعاون کرنے کا جو رجحان پایا جاتا ہے اُس کو اسی اعلان سے شہ ملی ہے۔ تمھارے والد نے اپنی خوش طبعی کو میری توقع سے زیادہ سنبھالے رکھا ہے۔ مگر شاید یہ زیادہ تر پبلک اور خصوصاً گورنمنٹ کے لئے ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ تمھاری پیشین گوئی صحیح ثابت ہو گی اور یہ لوگ ہم سے اور بھی دور ہو جائیں گے۔ اور اُن کا طرزِ عمل بڑی معاندانہ روح کا حامل ہو گا۔ جیسا کہ میں نے اپنی ایک حال کی (بادلِ ناخواستہ) ملاقات میں کہا ہے مجھ کو اس وقت زیادہ فکر اُس کام کا ہے جو ہمارے مخالفین تبدیلی (نوچینجرز) تعمیری پروگرام کے ماتحت کرنے

ہیں، اُس کام کا فکر مجھے کم ہے جو سوراجی نہیں کرپاتے۔ میں جانتا ہوں کہ سوراجیوں نے اس قسم کے تعمیری کاموں کے لیے فضا بہت ہی خراب کردی ہے۔ اس لئے کہ تعلیم یافتہ لوگ بہت زیادہ یہ دیکھتے ہوئے پائے جاتے ہیں کہ یہ سوراجی پارٹی کاؤنسلوں میں کیا کررہی ہے اور جو کچھ وہ کررہی ہے اُس کا ردِعمل انگلستان اور یہاں اور وہاں کی حکومتوں پر کیا ہو رہا ہے اور تعلیم یافتہ لوگوں کا یہی طبقہ آخر کار عوام کی رہبری کرسکتا ہے۔ مگر کیا اس سے کوئی فائدہ ہوسکتا ہے کہ ہم میں سے وہ لوگ بھی جو اس بات کو جانتے ہیں کہ سوراجیوں کے اعمال وافعال کو دیکھتے رہنا کس قدر نامعقول سی بات ہے، موجودہ صورتِ حالات سے پریشان پراگندہ خاطر رہیں اور وقت ضائع کرتے رہیں۔ کم از کم ہم لوگوں کو اپنے کام سے لگے رہنا چاہیے اور سوراجیوں کو بُرا بھلا کہتے رہنا ترک کردینا چاہیے۔

یہ ہیں اس وقت کی میری پریشانیاں، میرا ایک مسلمان اور صاف دل مسلمان ہونا میری پوزیشن کو بہتر نہیں بناتا۔ میں کانگریس کے صدر کی حیثیت سے بڑے اور اہم مسائل پر خاموش ووٹ نہیں دے سکتا اور نہ ووٹ دینے سے یکسر انکار ہی کرسکتا ہوں۔ اگرچہ دوسرے حالات میں میں اسی صورت کو ترجیح دیتا۔ ہاں چھوٹے موٹے غیر اہم مسائل پر کانگریس کا صدر اکثر ووٹ نہیں دیا کرتا اور مسلمان ہونے کی وجہ سے میں استعفا کی پناہ نہیں لے سکتا جیسا تم نے الہ آباد میں کیا، اس لیے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ میرا ایسا کرنا ہندو مسلم اتحاد پر یقیناً نہایت گہرا اثر ڈالے گا۔ خواہ اُس ٹائپ کے لوگوں کے ہاتھوں جنھوں نے مجھ سے استعفا طلب کرلیے جانے کی ایک تحریک بھیجی ہے، میری تحقیر واہانت ہوجائے: خواہ کچھ لوگوں کی مردہ دبے جان سی تعریفوں کا بارِ احسان اٹھا کر ممدوح کی بجائے ملعون قرار پاجانا پڑے اور خواہ سرے سے کوئی تعریف ہی میری نہ ہو، میں کسی حال میں بھی اپنے وقار کی نگہداشت پر اصرار کرنے کی تعیش سے ایک انسان کی حیثیت سے بھی بہرہ اندوز نہیں ہوسکتا! اب تک میں نے اپنے احساسات کسی پر ظاہر نہیں کیے تھے، اور میں جو اپنے ان

احساسات کا اظہار کسی دوسرے پر نہیں کرنا چاہتا تھا، سو میری اسی روش نے اس خط کو اتنے دنوں تک روکے رکھا، اور اب کہ میں نے ان احساسات کا اک بھونڈے طریقے پر بے سوچے سمجھے اظہار کر دیا ہے۔ بہ قول جناح میں "تقریباً مائل ہوں" اس بات پر کہ اس خط کو چاک کر کے ردّی کی ٹوکری کے حوالے کر دوں، مگر میں اس میلانِ طبع کو دبا رہا ہوں اور لو یہ رہا میرا یہ خط!

برسبیل تذکرہ، تم احمد آباد کیسے جا رہے ہو؟ کیوں نہ تم ۲۴ر کی شب کو یا ۲۵ر کی صبح کو براہ دہلی میرے ساتھ چلو؟

اندو کو پیار اور مسز جواہر لال اور تمہاری ہمشیرہ کے لیے سلام مہر و محبت۔

تمہارا محبت کیش
محمد علی

تکملہ! گویا میری پریشانیاں، وہ کانگریس سے متعلق ہوں یا خلافت سے (جس کے سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزاد نے میرا نام لیے بغیر مجھ پر پریس میں حملے کیے ہیں[1]) ابھی کافی نہیں تھیں کہ بیچاری بوڑھی اماں پھر بیمار پڑ گئیں!

محمد علی

---

[1] مارچ ۱۹۲۴ء میں ہندوستان میں خبر پہنچی کہ مصطفیٰ کمال نے منصب خلافت کو موقوف اور خلیفہ عبدالمجید کو معزول کر دیا۔ مولانا محمد علی پر یہ خبر بجلی بن کر گری۔ مولانا محمد علی اس وقت علی گڑھ میں تھے۔ پروفیسر محمد سرور جامعی لکھتے ہیں کہ مولانا محمد علی کے لیے یہ صدمہ بڑا جانکاہ تھا۔ جمعہ کا دن تھا، جامع مسجد میں ان کی تقریر تھی اور "تقریر کیا تھی، دل کے ٹکڑے تھے جو وہ الفاظ کے ذریعہ مسلمان حاضرین کے سامنے رکھ رہے تھے۔ مولانا کی آواز میں رقّت تھی، دل دکھ تھا اور ان کے آنسو رواں تھے جو بے اختیار آنکھوں سے نکل رہے تھے اور مجمع تھا کہ آہ و بکا کی تصویر بن گیا تھا مولانا نے مصطفیٰ کمال کے بارے میں بھی کافی سخت باتیں کہیں"۔ لیکن مولانا کے پاس اس مسئلے کا کوئی حل نہ تھا اور مسلمانوں کے لیے اس بزم نالہ و شیون اور محفل آہ و بکا میں کوئی رہنمائی نہ تھی۔ وہ اپنے کمال جوشِ جذبات سے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال سکتے تھے لیکن اگر مصطفیٰ کمال پاشا نے

منصبِ خلافت کو موقوف کر دیا ہے۔ تو پھر ہندوستان کے مسلمان کیا کریں۔ اس سوال کا جواب ان کے پاس نہ تھا۔ یہ خبر مولانا آزاد نے بھی پڑھی۔ لیکن انھوں نے واقعہ کی پوری صداقت کے ظہور تک انتظار کیا اور جب تمام حقائق سامنے آگئے تو نہ صرف حقائق کی اشاعت اور مسلمانوں کی آگاہی کے لیے بلکہ نئے حالات میں ان کی رہنمائی کے لیے نہایت شرح و بسط کے ساتھ اور ما لہ و ما علیہ کے اظہار و انکشاف پر مبنی ایک معرکہ آرا مضمون لکھا جو روزنامہ زمیندار لاہور میں ۱۱ مئی سے ۱۱ جون ۱۹۲۴ء تک سات قسطوں میں چھپا۔ یہ مضمون تمام تر اصولی مباحث اور نئی صورت حال کے تجزیے پر مبنی تھا۔ مولانا محمد علی یا کسی اور شخص کے افکار کے ابطال سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن مولانا محمد علی کا اشارہ اسی سلسلۂ مضمون کی طرف ہے۔ ہمیں اس مضمون میں کوئی ایسا جملہ نہیں ملا جس کے بارے میں یہ سمجھا جائے کہ ہدف کوئی خاص شخص ہے۔

غلام بھیک نیرنگ

(۱)

(۳۲)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مکرمی نیرنگ صاحب[۱]!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ پرسوں کنور عبدالوہاب خاں صاحب تشریف لائے تھے اور ان سے اس دعوت کا حال معلوم ہوا تھا جو چند حضرات ایک مسلم کانفرنس کو امرتسر میں دینا چاہتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ تمھارے نام بھی دعوتی خط آئے گا تاکہ داعیوں میں شریک ہو۔ جو کچھ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا تھا وہی آپ کی خدمت میں بھی عرض کرتا ہوں۔ میں مسلمانوں کی مختلف عناصر کی کانفرنس کو ہندو مسلمانوں کی اتحادی کانفرنس سے بھی زیادہ ضروری سمجھتا تھا اور خود مسلمانوں کی ایک یونٹی کانفرنس کو مختلف اقوام کی یونٹی کانفرنس سے پہلے منعقد ہونا چاہیئے تھا۔ اگر مہاتما جی نے ایک نہایت خطرناک برت نہ رکھ لیا ہوتا تو گزشتہ ستمبر[۲] کی یونٹی کانفرنس کا انعقاد بعد میں ہوا ہوتا اور مسلمانوں کی یونٹی کانفرنس کا انعقاد پہلے، اس کے بعد بھی جب کنور عبدالوہاب خاں صاحب نے اس کی طرف مجھے متوجہ کیا تو میں نے ان کی رائے سے اتفاق کیا اور حکیم صاحب اور بھائی سے اس کا ذکر کیا، چنانچہ سب نے اتفاق کیا مگر کانگریس کے اجلاس سے پیشتر کوئی اجتماع ہونا مشکل نظر آیا۔ کانگریس سے واپسی پر بھائی نے اس کی تحریک مسلم لیگ کے جلسے میں کی اور بڑی مشکلوں سے کثرت رائے حاصل کر کے اپنی تحریک کو منظور کرایا۔ تاہم جیسا کہ تمام جماعتوں کا قاعدہ ہے اگر کوئی چیز ان خداوندوں کی مرضی کے خلاف کثرت رائے سے منظور بھی ہو گئی تو یہ لوگ عمل میں تساہل کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ چیز کھٹائی میں پڑ جاتی ہے اور

---

[۱] مولانا محمد علی کا یہ خط وسط ۱۹۲۹ء کا ہے۔

[۲] گزشتہ ستمبر سے مراد ستمبر ۱۹۲۸ء ہے۔

تعمیل کا نام بھی نہیں آتا۔ مسلم لیگ نے آل پارٹیز کے اجتماع کے لیے ایک جلسہ ۲۳ جنوری کو طلب[1] کیا مگر باوجود میرے کئی روپے کے تار کے شوکت صاحب کی اس تحریک کے مطابق مسلمانوں کے تمام فریقوں کا آج تک اجتماع نہ ہو سکا آپ کو یاد ہوگا کہ گذشتہ جون میں خلافت کمیٹی کا جلسہ دہلی میں ہوا تھا۔ اس موقع پر بھی مسلمانوں کے تمام فریقوں کو دعوت عام دی گئی تھی کہ قومی تنظیم کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے دہلی میں مجتمع ہوں۔ اس کے جواب میں بھی مسلم لیگ کے لوگ شریک نہ ہوئے۔ اس لئے شوکت صاحب نے خیال کیا کہ بہتر ہوگا اگر بجائے خلافت کے یہ دعوت خود لیگ کی طرف سے دی جائے۔ لیکن نتیجہ وہی ہوا کہ کوئی اجتماع آج تک نہ ہو سکا۔ مسلم لیگ کی کونسل اور مسلمانوں کا جو اجتماع جنوری[2] گذشتہ میں یہاں ہوا تھا وہ صرف اسی غرض سے تھا کہ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلم لیگ کے خداوند ہماری تائید حاصل کریں اور چونکہ ہم ان کے تمام خیالات سے متفق نہ تھے اس لئے یہ تو نہ ہوا۔ لیکن پھر بھی ہمیں کو جھکنا پڑا اور مروت کے خیال سے ہم نے کہہ دیا کہ بہت اچھا، آپ اپنے مطالبات کو مسلمانوں کی طرف سے پیش کریں ہم آپ کو پورا موقع دیں گے کہ آپ ہندوؤں کو ان کے پورا کرنے پر راضی کرلیں، تاکہ کل کو یہ نہ ہو کہ آپ شکایت کریں کہ ہندو تو ہمارے مطالبات پورا کرنے پر راضی تھے مگر تمھاری مخالفت نے ان کو روک دیا۔ جناح صاحب اور ان کے ساتھیوں کو پورا موقع دیا گیا کہ وہ اپنے مطالبات پیش کرکے ہنود کو راضی کرلیں[3]۔ لیکن اس میں انھیں مطلق کامیابی نہ ہوئی۔ اور اجتماع کا کوئی نتیجہ نہ نکلا اس کے بعد نہ لیگ کے سکریٹری صاحب نے، نہ صدر صاحب اس ریزولیوشن

---

[1] یہ اجلاس مسلم آل پارٹیز کانفرنس کے عنوان سے دہلی میں ہوا تھا۔ اس میں قائداعظم کا وہ طویل ریزولیوشن منظور کیا گیا تھا جو جناح کے چودہ نکات کے نام سے مشہور رہا۔

[2] اشارہ اسی مسلم آل پارٹیز کانفرنس کی طرف ہے۔

[3] اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا محمد علی مجوزہ چودہ نکات سے پورے پورے متفق نہ تھے۔ اور صرف مروت کے خیال سے "اچھا" کہہ دیا۔ گول میز کانفرنس میں قائداعظم کی تجاویز کے خلاف مولانا محمد علی کے شدید رویے کا پس منظر یہاں تلاش کرنا چاہیے۔

پر توجہ کی جسے شوکت صاحب نے لیگ میں پیش کرکے منظور کرایا تھا اور مسلمانوں کی آل پارٹیز کانفرنس آج تک جمع نہ ہو سکی۔ الحمدللہ کہ آپ نے اس طرف توجہ فرمائی ہے مگر میں نہیں دیکھتا کہ داعیوں میں مختلف الخیال اور متفرق عناصر شامل ہیں۔ میں نے چھوٹتے ہی کنور صاحب سے پرسوں کہہ دیا تھا کہ اگر اس کانفرنس کا مقصود یہ ہے کہ مختلف الخیال لوگ ایک جگہ جمع ہوں اور فیصلہ کریں کہ مسلمانوں کا کاروبار کس طرح چلے اور کیا کیا عنصر کس کس طریقے پر کس کس کام کو کرنے کے لیے تیار ہے اور اس پر اصرار کرنا مقصود نہیں ہے کہ ہم بھی ترک موالات چھوڑ کر موالاتیوں کے طریقوں پر چلنے لگیں، تو میں کانفرنس میں بھی شریک ہو سکتا ہوں اور اس کے داعیوں میں بھی۔ لیکن اگر مقصود وہی ہے جو بعض ہمارے پنجابی اور دیگر بھائیوں کا گزشتہ اجلاس خلافت کمیٹی منعقدہ ۴ مارچ بمقام دہلی میں تھا، یعنی ترک موالات کو ہم سے ترک کرانا، تو میں اس دعوت الی الشر میں شریک نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے داعیوں میں۔ ترک موالات کی مشکلات سے میں ناواقف نہیں۔ لیکن دین اور اسلام کی راہ میں ان سے کہیں تکلیف دہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ہم کو بھی کرنا پڑے گا۔ جو صاحب ۲۱-۱۹۲۰ء میں ہمارے ساتھ نہ تھے وہ آج بھی ہمارے ساتھ نہ ہوں تو کچھ تعجب کی بات نہیں۔ لیکن جو صاحب اس وقت تارک موالات تھے وہ آج مشکلات سے گھبرا کر موالات کی طرف بڑھیں تو یہ ان کو مبارک ہو مگر میں تو اس طرف قدم نہیں اٹھا سکتا۔ تبلیغ میرا دین و ایمان ہے۔ خلافت تنظیم مسلمانان کا نام ہے اور قیام امن کے لیے اس تنظیم کی ضرورت ہے۔ اسلام گوشہ نشینوں اور تسبیح بجانے والوں کا مذہب نہیں ہے۔ سیاست بھی تنظیم مسلمانان کا ایک لازمی جز ہے اور ہم کو ایک اسلامی سیاست کو ہر وقت پیش نظر رکھنا ہے۔ جس میں غیر مسلموں کے ہر گروہ کے ساتھ ہمارا سیاسی تعلق صاف اور غیر مشتبہ نظر آسکے۔ موجودہ "کمزوری بلکہ بے حسی اور ناکارگی"، جس کا آپ نے ذکر فرمایا ہے اور جسے آپ دور کرنا چاہتے ہیں محض "بدنظمی" کے باعث نہیں ہے، بلکہ اس باعث ہے کہ ایک جماعت جس میں انگریزی پڑھے لکھے مسلمان اور علماء بھی زیادہ تعداد میں

شامل ہیں ایسے "نظم" کو قائم کرانا چاہتے ہیں کہ جس میں ان کے نزدیک وہ مصیبتیں سہنا نہیں پڑیں گی جو ترک موالات میں ہم کو سہنا پڑتی ہیں۔" متفرق اور متضاد عناصر کا تصادم" دور کرنا بہت اچھا ہے۔ مگر یہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ جو لوگ تارکِ موالات نہیں ہیں وہ بھی تارک موالات ہو جائیں۔ پھر تو نہ کوئی تفریق وتضاد باقی رہے گا اور نہ کوئی تصادم ہوگا یا کم از کم اس طرح ہو سکتا ہے کہ جو حضرات تارکِ موالات نہیں وہ صاف کہہ دیں کہ بھائی ہم ان تکالیف کے لیے تیار نہیں ہیں جو ترک موالات میں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ ہم اپنی حد میں رہ کر فلاں فلاں خدمت قوم کی کر لیں گے جو تارک موالات ہیں وہ مصیبتیں جھیلیں اور اس دشوار گذار راہ سے گذریں ہماری دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔ لیکن اگر "رخصت" چاہنے والے نہ "عزیمت" والے بنیں، نہ اپنے آپ کو "رخصت" چاہنے والا سمجھیں، بلکہ منہ بند کرکے اپنے آپ کو "نفس مطمئنہ" والا کہنے لگیں، حالانکہ ہوں "نفس امّارہ" کے پنجے میں، اور اپنے آپ کو صاحبِ "عزیمت" سمجھ کر حقیقی صاحبانِ "عزیمت" کو "رخصت" بھی نہ دیں تو ایسی جماعت کی شرکت خطرہ سے خالی نہیں اور اس کی دعوت، دعوت الی الخیر نہیں بلکہ دعوت الی الشر ہے۔

بھائی نیرنگ! مجھ سے زیادہ میری کمزوریوں کو صرف خدا ہی جانتا ہے میں نیکی کا دم نہیں بھرتا، پاکی کا دعویٰ نہیں کرتا۔ لیکن یہ جانتا ہوں کہ ایمان کی حفاظت میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ جب کھڑا ہونے والا چلنے والے سے اچھا ہوتا ہے اور بیٹھنے والا کھڑے ہونے والے سے۔ میں اگر اپنے بس اتنی قوت نہیں دیکھتا کہ نیکی کی طرف لپکوں تو کم سے کم برائی کی طرف سرکنا بھی نہیں چاہتا اور بہتر یہی ہے کہ جہاں ہوں وہیں کی زمین پکڑ کر بیٹھ جاؤں۔ جن صاحبوں کی فہرست بطور داعیوں کے آپ نے ارسال کی ہے ان کو دعوت، مولانا ظفر علی خاں صاحب کی صدارت، اور (معاف کرنا) پنجاب کا اس کانفرنس کی جائے وقوع قرار پانا یہ سب چیزیں مل کر ایک ایسا اجتماع پیدا کر دیتی ہیں جیسے پنجاب کے پانچوں دریا مل جائیں اور جہاں پایاب بھی ہوں وہاں بھی دھارا اس زور سے بہے کہ عبور کرنے والے کے پاؤں اکھڑ جائیں اور دریا کی رو کے ساتھ بہنے کے

سوا کوئی چارہ نظر نہ آئے۔ اس دھار کی تیزی میں آج بہنا کل کے ڈوبنے کا پیش خیمہ ہے۔ میں آپ کو جانتا ہوں۔ آپ صحیح معنوں میں شاعر ہیں۔ آپ کے دل میں مذہب اور قوم کا عشق ہے، آپ کیوں ان "سوداگروں" کے ساتھ اس سیاسی مول تول میں شریک ہوتے ہیں، اگر آپ کو میں انہی جیسا سمجھتا تو ہرگز یہ کچھ نہ لکھتا جو لکھ رہا ہوں۔

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان است

آپ دیکھتے ہیں کہ ایک طرف میں علماء سے دست و گریباں ہونے کے لیے تیار ہوں لیکن دوسری طرف مصطفےٰ کمال پاشا اور عصمت پاشا کی الغائے خلافت اور SECULAR STATE کا قائل نہیں۔ افراط و تفریط دونوں سے بچنا چاہتا ہوں۔ کنور عبدالوہاب خاں صاحب مجھ سے بھی زیادہ تیکھے جوان ہیں۔ میں شیخ ہوں گو "رام پور افغاناں" میں پیدائش اور عرصہ تک سکونت کے باعث کبھی کبھی "پٹھن دلی" پر اتر آتا ہوں۔ لیکن پھر بھی شیخ ہوں۔ جب ذرا جوش کم ہوتا ہے اور عقل پھر ہدایت کرنے لگتی ہے تو مونچھیں نیچی کر لیتا ہوں۔ کنور صاحب اب تک راجپوت ہیں۔ وہ زود خشم ہیں اور الد الخصام کو چھوڑ کر جھٹ بھیّوں پر غصہ اتارنے لگتے ہیں مگر ماشاء اللہ آپ جوشِ اسلامی کے ساتھ عقل کا بھی وافر حصہ رکھتے ہیں اور خود شاعر ہیں۔ ایک قرآن کریم کی اس آیت کریمہ پر غور فرمایئے کہ "ولتسمعن من الذین اوتوا الکتٰب من قبلکم ومن الذین اشرکوا اذیً کثیرا وان تصبروا وتتقوا فان ذالک من عزم الامور[1]" جس صبر کو وہ

---

[1] آل عمران کی آیت ۱۸۶۔ ابتدائی الفاظ یہ ہیں "ولتبلون فی اموالکم وانفسکم" پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے یاد رکھو۔ ایسا ہونا ضروری ہے کہ تم جان و مال کی آزمائشوں میں ڈالے جاؤ۔ یہ بھی ضرور ہونا ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین عرب سے تمہیں دکھ پہنچانے والی باتیں بہت کچھ سننی پڑیں لیکن اگر تم نے صبر کیا (یعنی مصیبتوں میں ثابت قدم رہے) اور تقویٰ کا شیوہ اختیار کیا (یعنی احکام حق کی نافرمانی سے بچے رہے) تو بلاشبہ بڑے کاموں کی راہ میں یہ بڑے ہی عزم و ہمت کی بات ہوگی۔

میری کمزوری سمجھتے ہیں وہ میرے نزدیک عزم امور ہے ۔ پھر غالب کے اس شعر پر غور کیجئے ؎

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ

کنور عبدالوہاب خاں صاحب سمجھتے ہیں کہ مجھے پیاس نہیں لگی گر میرے مذہب میں شراب نہ بھی ملے تب بھی پانی پینا حرام ہے ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میں ہنود سے مرعوب ہوں اور ان کی خوشامد کرتا ہوں حالانکہ مجھ ہی بدبخت کے یہ شعر ہیں ؎

فرشتوں نے کیا ہے ان کو سجدہ
نہیں ملے بت یہ بندے تیرے بس کے
جو تہرا در صاحبداراں کی خوشامد کیا خوب
عرش و کرسی پہ گذر ہے ترے درباری کا

اب کی بار آئے تھے تو فرماتے تھے کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اسلام کی محبت کی وجہ سے نہیں بلکہ انگریزوں کے بغض کی وجہ سے ۔ خیر یہی سہی لیکن ؏

مرے بت خانے ہیں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

میری استواری کی ذرا بھی داد نہ دی اور معتقد بھی ہوئے تو انہی شہیدان امتحانی کے جن میں سے ایک یعنی فرہاد کے متعلق غالب کہہ گذرے ہیں ؎

دلم بر رنج نابرداری فرہاد می لرزد
خداوندا بیامرزان شہید امتحانی را

کنور صاحب بھول گئے کہ اب بھی دفعہ ۱۲۴ الف کا وار دفعہ ۳۰۲ ۔ ۱۲۱ الف کے وار سے زیادہ سخت ہوتا ہے اور زیادہ کثرت سے اور بالخصوص آج کل تو دفعہ ۱۲۴ الف کی سزا حکومت کا مقرب بارگاہ بناتی ہے نہ کہ زندانی ۔ خیر اب یہ دکھڑا کہاں تک روؤں ۔ میں تو آج بھی اپنے کو اسی جگہ پاتا ہوں جہاں ۱۹۲۱ء میں تھا ۔ ہنود میں غلامی ہم سے زیادہ سرایت کر گئی ہے ۔ اسی باعث وہ مالوی اور لاجپت رائے کے ساتھیوں میں پھر ہو گئے ہیں ۔ اگر میں نے رائے بدلی ہے تو صرف اسی قدر جتنے کہ واقعات بدلے ہیں یعنی ۱۹۲۱ء میں ہنود کو مہاتما گاندھی کی طرف مائل دیکھ کر

یقین ہوا تھا کہ اس قوم کے بھی دن پھرے ہیں۔ آج انھیں پھر شاید بدبختی میں مبتلا پاتا ہوں، لیکن انہی کے قدم بہ قدم چل کر مولوی مالوی اور منشی لاجپت رلئے یعنی انہی دو ہندوؤں کی طرح کے مسلمان سرداروں کا اتباع کرنا نہیں چاہتا ؎

نہ پیروئ قیس نہ فرہاد کریں گے
ہم طرزِ جنوں اور ہی ایجاد کریں گے

آپ کو یاد ہوگا کہ آپ ہی نے مجھے یہ راستہ بھوالی میں بتایا تھا اور فرمایا تھا کہ "لڑائی ہندو مسلمان کی نہیں، بلکہ مالویت اور گاندھیت کی ہے۔ میں گاندھیت کا ساتھ دے کر ہندوستان اور اسلام کی خدمت کرنا چاہتا ہوں"۔ ایک مسلمان کے لیے محض مالویت کی مخالفت کرنا اس کو ہنود میں تقویت پہنچانا ہے اور اس میں نہ اسلام کی بہتری ہے نہ ہندوستان کی اور نہ خود ہندوؤں کی۔ ممکن ہے کہ آپ کا خیال ہو کہ مہاتما گاندھی سے خود بہت سی غلطیاں ہوئی ہیں۔ ایک حد تک میں اس خیال کی تائید کرسکتا ہوں۔ لیکن گاندھی انسان ہیں فرشتے نہیں نہ خدا ہیں۔ ان پر ہنود کا اور بالخصوص ہنودِ پنجاب کا ایک عرصہ سے نرغہ رہا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے خود آپ سے سال گزشتہ میں مسلمانوں کی BRIEF مانگی تھی، مگر جس جس سے اس چیز کے لیے کہا گیا اس نے سوائے ہندو اخباروں کے پلندوں کے جو میرے سر پر کھینچ کر مارے گئے، مجھے مشکل ہی سے کوئی چیز بھیجی جس کو میں پڑھ کر مہاتما جی کے سامنے مسلمانوں کا CASE پیش کرسکتا یا جس کو مہاتما جی کو دے سکتا۔ ہم میں جوش زیادہ ہے مگر کام کا طریقہ ہم نہیں جانتے۔ نہ پتہ مارنا ہم کو آتا ہے۔ بہر حال جو کچھ بھی مہاتما جی نے مسلمانوں کے CASE کے متعلق سنا ہے وہ زیادہ تر مجھی سے یا میری ہی معرفت سنا ہے۔ اگر مسلمانوں کی بے صبری، اشتعال پذیری اور پھر صحیح طریقۂ کار سے ناواقفیت کے باعث مہاتما گاندھی کے دل پر، جو ہندو ہیں اور ہندو رسم و رواج اور طریق بود و ماند کا پیدائش سے لے کر اس وقت تک بہت کچھ اثر پڑا ہے، اثر ہوا اور انہوں نے مسلمانوں کے متعلق ایک حد تک غلط فیصلہ کیا تو زیادہ تعجب کی بات نہیں۔ ان

کے خیالات کی اصلاح کرنا اب بھی ہمارا فرض ہے۔ لیکن اس کے لیے وہ سوقیانہ طریقہ ہرگز مفید نہیں ہو سکتا جس کو حضرت مولانا ظفر الملت والدین ظفر علی خاں صاحب نے اختیار کیا ہے۔ بھائی نیرنگ صاحب! افسوس ہے کہ مسلمان پھر اسی طریقہ پر چلنے لگے ہیں جو ابتداءً انھوں نے اختیار کیا تھا ؎

جاتا ہوں تھوڑی دور ہراک تیز رو کے ساتھ[1]
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

مجھے معاف کیجیے یہ خط بہت طویل ہو گیا اور جیساکہ دنیا کا کتا میں ہوں اسی طرح کا یہ میرا خط ہو گیا۔ اس میں رشک ہے، حسد ہے، غیبت ہے، اپنی لفاظی ہے ـــــ خود ستائی ہے۔ لیکن کیا کروں جیسا میں ہوں ویسا ہی اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہوں۔ ایک فاسق و فاجر ہوں۔ اس سے زیادہ کیا کر سکتا ہوں کہ جو کچھ میرے دل میں ہے اس کو ظاہر کر دوں کم سے کم ایک جرم کا ارتکاب تو اب تک نہیں کیا ہے یعنی تقدس کا دعویٰ نہیں کرتا اور سجدۂ ریائی سے زمین کو بھی گندہ اور ناپاک نہیں کرتا۔

جو کچھ میرے دل میں تھا وہ سب کہہ گذرا۔ اب اس سے زیادہ کیا لکھوں اگر ایسا شخص آپ کے کسی کام کا ہو تو حاضر ہوں ورنہ معذور ہوں۔

محمد علی

(۲)

(۴۳)

[۱۹۲۷ء میں پنجاب کے راج پال نامی ایک شخص نے نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام کی شان میں ایک کتاب لکھی جو نہ صرف اپنے مضمون کے لحاظ سے نہایت گستاخانہ تھی بلکہ اس کا عنوان ہی بہت اشتعال انگیز تھا۔ اس پر ایک پرجوش مسلمان نے مصنف کا کام تمام کر دیا۔ دلیپ سنگھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے۔ انھوں نے مروجہ قانون کے مطابق اس مسلمان کو

---

[1] محمد علی نے پہلے مصرع میں تھوڑا سا تصرف کر کے اسے اپنے خیال کے مطابق بنا لیا ہے۔ اصل مصرع یہ ہے ؎ چلتا ہوں تھوڑی دور ہر ایک راہرو کے ساتھ

پھانسی کا حکم سنا دیا۔ اب مسلمانوں کا غصہ دلیپ سنگھ پر اترنے لگا اور مستعفی ہونے کی صدائے بازگشت سے ہندوستان کے کوہ و صحرا گونج اٹھے۔ ان حالات میں صرف دو[2] شخصوں نے مسلمانوں کے جوش و جذبات کی صحیح سمت میں رہنمائی کی اور بتایا کہ قصور جیف جسٹس کا نہیں، نقص قانون کا ہے۔ اس لیے ایک نیا قانون بننا چاہیے جس کے ذریعہ بانیانِ مذاہب کی توہین کے مرتکبین کو آئندہ قرار واقعی سزا دلائی جا سکے۔ یہ دو شخص ابوالکلام آزاد اور محمد علی تھے۔ غلام بھیک نیرنگ نے محمد علی کی روش کے خلاف انھیں ایک پرجوش خط میں لکھا کہ

"خدا کے واسطے اب مقدمہ راج پال کی بحث کو اور ایسے مضمون کو جو اس بحث سے لفظاً یا معناً، ظاہراً یا باطناً، صراحتہً یا اشارۃً یا کنایتہً بالواسطہ یا بلا واسطہ کوئی تعلق قریب یا بعید، حقیقی یا فرضی، واقعی یا وہمی اصل یا مصنوعی رکھتا ہو بند کر دیجیے، آپ کے تمام راسخ العقیدت نیازمند پڑھتے پڑھتے اور سنتے سنتے تھک گئے کہ مسٹر دلیپ سنگھ نے بددیانتی نہیں کی"

مولانا محمد علی نے اس خط کا جو جواب لاجواب دیا۔ وہ اسی قدر دستیاب ہوا]

آپ سر محمد شفیع کا واسطہ دیتے ..... کا واسطہ دیتے" رواہ البخاری" کا واسطہ دیتے، ڈاکٹر سر علامہ اقبال کا واسطہ دیتے، تو میں ہر ایسے مضمون کو جو توہین رسول اکرمؐ کے انسداد کی تدبیر سے لفظاً یا معناً، ظاہراً یا باطناً، صراحتہً یا اشارۃً یا کنایتہً، بلا واسطہ یا بالواسطہ، قریبی یا بعیدی، حقیقی یا فرضی، واقعی یا وہمی، اصل یا مصنوعی، پنجابی یا دیسی، تعاونی یا عدم تعاونی، ہندو مہاسبھائی یا مسلم لیگی، شدھوی یا تبلیغی، سنگھٹنی یا تنظیمی، سوراجی یا جوابی تعاونی، منفیانہ یا مثبتانہ، ایشیائی یا یورپی، مشرقی یا مغربی، حامی یا سامی غرض کسی قسم، نوع، بھانت، وضع، طریقہ، انداز کا تعلق رکھتا اس کو" بند اور قطعاً بند" کر دیتا۔

پنجاب کے لیڈر غریب پنجابی مسلمانوں کو گمراہ کر رہے ہیں اور آپ خدا کا واسطہ دیتے ہیں کہ ان کو گمراہ کرنے دو....."

نواب وقار الملک

(۱)

(۳۴)

بڑودہ	پرائیویٹ

۲۵ مئی ۱۹۰۹ء

جناب عالی۔ السلام علیکم

۵ مئی کے عنایت نامے کا مشکور ہوں[۱]۔ ممتاز علی کی تعلیم کے متعلق ایک صاحب نے اصرار کیا تھا اس لیے تحریر کیا گیا تھا، گو میں جانتا تھا کہ اس کا علی گڑھ بھیجا جانا ممکن اور مفید نہ ہوگا۔

جولائی تک کا انتظار کالج کے معاملات میں سخت ہے۔ اگر مناسب خیال فرمایا جاوے تو جو کاغذات ٹرسٹیوں کے پاس مرسل ہوں ان کی ایک نقل مجھے بھی پرائیویٹ بھیج دی جائے۔ ٹرسٹی نہ ہونے کا اب تک کبھی افسوس نہ ہوا تھا مگر جب سے تمام کارروائی صیغہ راز میں شامل ہوئی اور میں علی گڑھ سے اتنی دور آ پڑا ہوں کہ جو راز علی گڑھ کے کوچہ و بازار میں زیر بحث ہیں، ان کی بھنک تک یہاں نہیں پہنچتی اس وقت سے متاسف ہوں کہ کیوں ٹرسٹی نہ ہوا۔ اب طوعاً و کرہاً ارادہ کیا ہے کہ اس جماعت میں شریک ہوں مگر پھر بھی اپنے ہم عصر اولڈ بوائز کے ووٹ سے شرکت گوارا ہے اور ممکن ہے کہ

---

[۱] جلیل قدوائی صاحب نے لکھا ہے کہ محمد علی کا یہ خط معلوم ہوتا ہے اس اختلاف سے تعلق رکھتا ہے جو علی گڑھ کالج میں طلبا کے داخلہ کے اصول و قواعد کے بارے میں ایک طرف نواب وقار الملک اور ٹرسٹیوں اور دوسری طرف پرنسپل اور انگریزی اسٹاف کے مابین پیدا ہو گیا تھا اور جس کے نتیجے میں فریق ثانی نے استعفیٰ دے دیا تھا۔ دراصل یہ مسئلہ آخر میں کالج کے جملہ معاملات میں انگریزوں کی عام بالادستی کا ہو گیا۔ اور گورنر صوبہ تک پہنچا۔ مگر نواب صاحب اور بعض سربرآوردہ ٹرسٹیوں کی استقامت اور بردباری سے مسلمانوں کے حق میں طے پایا۔ نواب صاحب کے نام ابتدائی دونوں خطوط بعض جگہ سے کرم خوردہ تھے۔ ایسی جگہوں پر نقطے لگا دیے ہیں اور جہاں یہ شبہ ہوا کہ کوئی لفظ چھوٹ گیا ہے وہاں پر قیاساً چھوٹا ہوا لفظ توسین ( ) میں لکھ دیا ہے۔

سال آئندہ اپریل میں میں بھی کا غذات کا نفڈنشل دیکھنے کا حق دار بن سکوں اس وقت رعایتاً درخواست پیش کرتا ہوں۔

ٹائمز آف انڈیا میں[1] ۔۔۔ ضروری معلوم ہوا ۔۔۔۔ اس کی ایک نقل خدمتِ عالی میں روانہ کی تھی[2] اور ایڈیٹر کا نوٹ بھی ارسال کیا تھا۔ امید ہے حضور نے پسند فرمایا ہو، گو معاملات کی صورت ایسی ہے کہ بہ مجبوری چند باتیں ۔۔۔۔ قیاس وظن سے عام طور پر زبان تک نہ لائی جائیں مگر پرنسپل کی شکایات ۔۔۔ ہزآنر کا[3] مشورہ اور آں جناب کی رائے یہ امور ایسے نہیں کہ قومی مصالح کا خیال کرکے انھیں زیادہ دیر تک صیغۂ راز میں رکھا جائے۔ پیسہ[4] اخبار میں کسی شخص نے چھ سات مضامین نہایت سختی سے لکھ کر طبع کرائے ہیں۔ ان میں یہ تمام معاملات (خواہ ان میں قیاسات کو کتنا ہی دخل کیوں نہ ہو) آچکے ہیں۔ البشیر[5] میں علیحدہ سلسلہ جاری ہے۔ اور آپ کو ہر بار رنز دید وغیرہ کی ضرورت پڑتی ہے اور پڑے گی۔ ایسی حالت میں تمام خط وکتابت کو چھپوا دینا نہایت مناسب ہوگا۔ جو بے چینی مسلمانوں میں عام طور پر پھیل رہی ہے۔ وہ قدرتی ہے اور اگر آپ جولائی کے فیصلہ کے منتظر رہیں گے اور غالباً اس وقت بھی ہزآنر کے جواب کے منتظر ہوں گے تو جو افواہیں اس وقت پریشان کن ہیں وہ اس وقت تک سخت مضر ثابت ہو جائیں گی۔

آں جناب نے ٹرسٹیوں کو پبلک کا قائم مقام مانا ہے مگر افسوس اسی کا ہے کہ ٹرسٹی سوائے اصل ٹرسٹیوں کے باقیات الصالحات یا نامزد احباب

---

[1] بمبئی کا مشہور انگریزی روزنامہ

[2] ٹائمز آف انڈیا میں یونی ورسٹی کے مسائل و معاملات پر کوئی مضمون محمد علی نے چھپوایا تھا۔ اسی کی نقل نواب صاحب کی خدمت میں بھیجی تھی۔

[3] ہزآنر کے الفاظ لفٹننٹ گورنر کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ اشارہ یوپی کے گورنر کی طرف ہے۔

[4] لاہور کا مشہور اردو اخبار پہلے ہفتہ وار تھا پھر روزنامہ ہوگیا تھا۔ منشی محبوب عالم اس کے مالک و ایڈیٹر تھے۔

[5] اٹاوہ (یوپی) کا مشہور اردو اخبار

ہونے کے کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ قوم کو اپنے وقار الملک پر بھروسہ ہے نہ کہ ٹرسٹیوں کے نامزد کردہ سکرٹیری پر[1]۔ قوم کو علی امام صاحب یا چند اور ٹرسٹیوں پر جو بھروسہ ہے وہ صرف ان کی ذاتی قابلیت اور ایمان داری کی وجہ سے ہے نہ کہ اس وجہ سے کہ قوم نے خود ٹرسٹیوں کو منتخب کیا ہو اور وہ ٹرسٹی منتخب ہوئے ہوں۔ کیا آپ فرما سکتے ہیں کہ قوم کو مثلاً عبدالصمد خاں صاحب[2] یا قاضی عزیزالدین احمد پر بھروسہ ہے۔ اور وہ اس وجہ سے ہے کہ یہ حضرات قوم کے قائم مقام ہیں۔ ہرگز نہیں۔ ٹرسٹیوں کی جماعت میں اچھے بھی ہیں، اور برے بھی۔ مگر قوم کا قائم مقام وہی ہو سکتا ہے جسے قوم نے منتخب کیا ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر مسلم لیگ نامزدگی یا مشترکہ انتخاب کی اس قدر کیوں مخالفت کر رہی ہے اور ہزاروں مسلمان کیوں شور مچا رہے ہیں۔ اور جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ٹرسٹی (گو بعض ان میں سے بہت عمدہ اشخاص ہیں)، قوم کے قائم مقام نہیں اور جب کہ یہ معلوم نہیں کہ کتنے حضرات اس معاملے میں آزادانہ رائے دیں گے اور کتنے دہنیت کی پالیسی برتیں گے اور جب کہ گزشتہ تجربہ سے معلوم ہوا کہ زیادہ حصہ اب تک خوشامد کا عادی رہا ہے تو قوم کا تردد بے جا نہیں اور ایسی حالت میں اگر آپ کے دفتر سے اخبار نویسوں کو باضابطہ خبریں نہ دی جائیں گی ان کا فرض ہو گا کہ وہ سنی سنائی باتیں کریں۔

امریکہ میں اخبار نویسوں کی عجیب عجیب حرکتیں سنی گئی ہیں مگر انگلستان کا سب سے عمدہ اخبار ٹائمز بھی نازک سے نازک معاملات کو چھاپنے میں تامل نہ کرے گا۔ اگر اسے اس وقت کی گورنمنٹ کی کارروائی پر پورا بھروسہ نہ ہو اور پارلیمنٹ میں بار بار سوال کیے جائیں گے اور اگر ملک کو گورنمنٹ پر بھروسہ نہیں ہے اور مجارٹی دراصل ملک کی قائم مقام نہیں رہی ہے تو دول خارجہ کے تعلقات کو بھی وزرا چھپا نہ سکیں گے۔ بلکہ پبلک کو مطلع کرنا پڑے گا۔ میں خود

---

[1] اشارہ خود نواب صاحب کی طرف ہے کہ قوم کو ان پر ان کی شخصی حیثیت میں اعتماد ہے ٹرسٹیوں کے نامزد کردہ سکرٹری کی حیثیت میں۔

[2] نواب سر عبدالصمد خاں جو بعد میں ریاست رام پور کے وزیراعظم ہوئے۔

کبھی صلاح نہ دوں گا کہ جو خیالات آپ کے، پرنسپل یا ہز آنر کے متعلق ہیں ان کا اظہار کیا جا ے یا جو رائے اس وقت تک ٹرسٹیوں کے افراد نے دی ہے اسے شائع کیا جائے مگر واقعات کا شائع کرنا ضروری ہے۔ انسٹی ٹیوٹ میں جو مسرت خیز تحریر بعد ملاقات ہز آنر کے تصفیہ کے متعلق شائع ہوئی وہ میری ناچیز رائے میں قوم کو مغالطہ میں ڈالنے والی تھی اور بہت قبل از وقت تھی۔ گو مصلحت آمیز مشہور ہوئی ہو اور اس طرح راستی فتنہ انگیز سے بہتر سمجھی گئی ہو، مگر وہ مصلحت آمیز نہیں تسلیم کی گئی۔ بلکہ فتنہ انگیز ثابت ہوئی۔ البشیر اور پیسہ اخبار اور اصل واقعات کا مقابلہ اس سے کیا جائے تو البشیر اور پیسہ اخبار کے مضامین اس قدر خلاف واقعہ نہیں تصور کیے جائیں گے۔

ایک امر کی اطلاع دینا ضروری سمجھتا ہوں میں نے کرنل ڈنلاپ اسمتھ پرائیویٹ سکریٹری وائسرائے کو اشارتاً صلاح دی تھی کہ لارڈ منٹو اگر اس موقع پر ہز آنر کو صلاح دیں کہ مسلمانوں کو اس وقت برافروختہ نہ کیا جائے اور کالج کے معاملات عام رائے کے مطابق فیصل کردیے جائیں تو مناسب ہوگا۔ کرنل صاحب کو یہ رائے اس قدر اچھی معلوم ہوئی کہ انھوں نے ہز آنر کو اسی دن ایک تحریر بھیجی ہے۔ میرا ذکر نہیں کیا گیا ہے کیونکہ میں اس کے متعلق لکھ چکا تھا جواب کا منتظر ہوں ... کہ ایسے وقت میں باہمی اختلافات تعلیم اور پولیٹکل معاملات دونوں کے لیے سخت مضر ثابت ہوں گے۔ اس معاملہ کے متعلق جناب علی گڑھ میں کسی کو اطلاع نہ دیں۔ میں بارگاہ لفٹنٹی[1] میں معتوبین میں ہوں مگر بارگاہ گورنری[2] میں غیر المغضوب علیہم میں میرا بھی شمار ہے۔ جو مدد کالج اور قوم کی مجھ سے ہو سکے گی وہ کرتا رہوں گا مگر میں پھر عرض کروں گا کہ یہ لڑائی ٹرسٹیوں کے بوتے کی نہیں ہے۔ جب تک ساری قوم اس میں آپ کا ساتھ نہ دے گی اور متفقہ کوشش نہ کی جائے گی، کامیابی ممکن نہیں ہے۔ ٹرسٹیوں سے مجھے زیادہ توقع نہیں ہے۔ زائد حصہ گورنمنٹ

۱؎ لفٹنٹ گورنر کا مستقل سرکاری دفتر یعنی صوبائی سکریٹریٹ جو الہ آباد میں تھا۔

۲؎ گورنر اور پرسنل اسٹاف لکھنؤ میں رہتا تھا۔

. . . . . رؤسا کا ہے جو ان سے بھی زیادہ مجبور ہیں آپ کا جس وقت انتخاب ہوا تھا۔ آخر وقت تک مخالفت جاری رہی تھی اور جو رائیں آپ کے لیے آئی تھیں، وہ زیادہ تر قومی تحریک کا نتیجہ تھیں مگر اس وقت مقابلہ میں صرف اسمٰعیل[۱] خاں صاحب تھے جو قوم میں بالکل مقبول نہیں ہیں۔ گورنمنٹ اور اسٹاف بظاہر اس جھگڑے سے علیحدہ تھے مگر اس وقت مقابلہ . . . . . اسٹاف سے ہے اور گورنمنٹ کا عندیہ معلوم ہے۔ کامیابی اسی وقت حاصل ہو گی جب کہ قوم متفق اللفظ ہو کر آپ کا ساتھ دے گی۔ اس لیے اسے واقعات سے مطلع نہ کرنا اور ٹرسٹیوں کے فیصلہ پر تمام معاملہ کو چھوڑنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ میں نے نہایت جرأت کر کے یہ عریضہ لکھا ہے مگر جنبش قلم خارج از آہنگ خط ہے۔ اگر نواب محسن الملک بہادر کا زمانہ ہوتا تو (لکھنا) فضول تھا۔ اخباروں میں تحریک کی جاتی مگر جناب کے عہد میں (اس کی) ضرورت نہیں ہے۔ امید ہے کہ آئندہ بھی ضرورت نہ ہو گی اور آں جناب کو اپنا ہم خیال بنا سکوں گا یا جناب کا ہم خیال ہو سکوں گا۔ اپنی رائے معہ دلائل کے لکھی ہے۔ آں جناب کی طرف سے کم از کم واقعات کا تو اظہار ہو۔

آپ کا عزیز نیازمند
محمد علی

(۲)

(۳۵)

بڑودہ
۲۵ مئی ۱۹۰۹ء

بہ خدمت سکرٹیری صاحب ایجوکیشنل کانفرنس[۲]

---

[۱] یہ نواب اسمٰعیل خاں ابن نواب اسحٰق خاں نہیں ہیں بلکہ جیسا کہ جلیل قدوائی صاحب نے خیال کیا غالباً حاجی اسمٰعیل خاں رئیس علی گڑھ ہیں جن کی کوٹھی پر سر سید اپنے آخری زمانے میں چلے گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوا تھا۔

[۲] اس زمانے میں ایجوکیشنل کانفرنس کے سکرٹیری بھی نواب وقار الملک ہی تھے۔ چونکہ یہ کالج کے خط کی بجائے دفتر کے معاملہ سے متعلق خط ہے اس لیے سکرٹیری کی حیثیت میں نواب صاحب کو مخاطب کیا ہے۔

جناب عالی ۔ السلام علیکم ۔ یہ عریضہ دو ضرورتوں سے لکھتا ہوں ۔
پہلی ضرورت یہ ہے کہ باوجود جناب کے ارشاد کے جو ۱۲ دسمبر ۱۹۰۸ء
کے اجلاس سنٹرل کمیٹی کی روئداد میں مطبوع ہے میری تحریر مورخہ ۱ دسمبر ۱۹۰۸ء
کے استفسارات میں سے ہنوز ایک کا بھی جواب نہیں دیا گیا ہے اور نہ جوائنٹ
سکرٹری صاحب کی اس لمبی چوڑی رپورٹ میں جو شائع ہوئی ہے ۶، صفحوں
میں سے ایک صفحہ بھی ان استفسارات سے متعلق ہے ۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ممبران
سنٹرل کمیٹی سے کس طرح امید کی جا سکتی ہے کہ وہ کانفرنس کے کام میں کچھ بھی
دلچسپی لیں گے ۔ درآں حالیکہ ممبران کے خطوط کا جواب چھ چھ مہینہ تک نہیں ملتا ۔
چونکہ استفسارات اس قسم کے تھے کہ اصل کارروائی کا ان سے پتہ چلتا ہے اور
ان کے جوابات سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ کانفرنس کی سنٹرل کمیٹی کس غرض سے ہے
اور اس کی سیکشنیں کیا کام کرتی ہیں ۔ اس لیے جواب نہ ملنے سے یہ شبہ پیدا
پیدا ہو سکتا ہے کہ افرادِ قوم تو درکنار ممبران سنٹرل کمیٹی کو بھی حالات واقعی
سے اطلاع نہیں دی جاتی ۔ چونکہ آں جناب کانفرنس کے بھی سکرٹری ہیں اور
آں جناب اس کارروائی کے لیے ذمہ دار ہیں اس لیے تکلیف دہ ہوں کہ پروپیگنڈ
سکرٹری سے پوچھا جائے کہ اب تک جوابات کیوں نہیں دیے گئے ۔ اور آیندہ کے
لیے وہ کس طرح اطمینان دلانا چاہتے ہیں ۔ اگر کانفرنس کے دفتر کی باوجود
روز افزوں خرچ کے، یہی کیفیت رہی تو آپ بھی الزام سے نہ بچ سکیں گے، اور
ہر فرد قوم کا فرض ہے کہ آں جناب کو ایسے الزامات سے محفوظ رکھے ۔
دوسری ضرورت یہ ہے کہ امسال رنگون سے دعوت آئی ہے اور جوائنٹ
سکرٹری صاحب کی کیفیت سے معلوم ہوتا ہے کہ پشاور سے دعوت نہ آنے پر
رنگون کو اطلاع دی گئی تھی مگر یہ سال پولیٹیکل ضروریات کا خیال کر کے مسلمانوں
کے لیے نہایت نازک ہے ۔ ایسے موقع پر مسلم لیگ کا جلسہ کسی ایسی جگہ پر
کیا جائے جہاں مسلمانان ہند بہ آسانی جمع ہو سکیں ۔ دسمبر تک غالباً گورنمنٹ
ہند کے ریگولیشنز تیار ہو جائیں گے اور لیگ کو ان پر غور کرنا چاہیے ۔ میں نہیں
سمجھ سکتا کہ ممبران لیگ کس طرح رنگون جا کر تعطیل میں واپس آ سکیں گے تاکہ

اس کے بعد لیگ کا سالانہ جلسہ منعقد ہو سکے اور رنگون جانے والے اصحاب بہت کم ہوں گے اور وہاں اگر زائد حضرات گئے بھی تو چھ سات دن کی مسافت کے بعد کانفرنس کے تین اجلاس اور لیگ کے دو اجلاس کس طرح ہوں گے اور واپسی کے لیے لوگوں کو کتنا وقت مل سکے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ لیگ کی سنٹرل کمیٹی سے مشورہ لیے بغیر کانفرنس کی کمیٹی میں رنگون کے اجلاس کا مسئلہ پیش کر دیا گیا۔ اور ۳۰/مئی تک اس کا فیصلہ ہو جائے گا پولٹیکل ضرورتیں ہمیں مجبور کر رہی ہیں کہ پولٹیکل مسائل پر غور کریں اور اپنی مشکلات کو حل کریں۔ اگر اس سال کانفرنس کا (اجلاس) نہ بھی ہو گا تو مسلمانوں کی تعلیم کو اتنا نقصان نہ پہنچے گا جتنا لیگ کو اجلاس نہ کرنے سے ان کو پولٹیکل نقصان پہنچے گا۔ ایسی حالت میں رنگون جیسے دور افتادہ مقام میں کانفرنس کا اجلاس ہونا میری ناچیز رائے میں سخت غلطی پر مبنی ہے۔

علاوہ ازیں کالج کے متعلق بہت سے امور تصفیہ طلب ہیں، جن کا کانفرنس میں آنا ضروری ہے۔ اگر امسال کانفرنس رنگون میں ہوئی تو بڑا خطرہ ہے کہ یا تو ان امور کا پیش کرنا درست نہ ہو گا یا اگر وہ پیش ہوئے تو رنگون کے لوگوں پر کالج کا وہ اثر . . . . ان امور کو زیادہ دیر تک مسلمانوں کی عالمگیر تعلیمی کانفرنس میں پیش کرنے سے باز رہنا قومی مصالح کے خلاف ہے۔ اور رنگون میں ان پر پہلی مرتبہ بحث کرنا خالی از خطر (نہ ہو گا) میں آں جناب سے درخواست کرتا ہوں کہ ان امور پر غور فرمایا جائے اور بعدہ سنٹرل کمیٹی میں ان پر بحث ہو۔ جواب کا منتظر رہوں گا۔

نیازمند

محمد علی

(۳)

(۳۶)

رام پور

۱۵/مارچ

جناب والا، تمام عنایت نامے اور تار ملے۔ بے حد ممنون بندہ پروری

ہوں۔ معظم کے قلب پر آپ کی محبت بھری تحریر کا بہت اثر ہوا۔ اور خود علی گڑھ آکر آپ کا شکریہ ادا کرے گا۔

میں آج ہی چلا آیا ہوتا مگر سرکار نامدار کا ارشاد ہے کہ آج لفٹنٹ گورنر صاحب کو جو بینکویٹ جا رہا ہے۔ اس میں شریک ہوں۔ کل گارڈن پارٹی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ علی گڑھ کے واقعات پر حکام سے گفتگو ہو۔ اسی لیے مناسب یہی جانا کہ اتوار تک آنے میں التوا کیا جائے۔ اس دن چوتھا اجلاس کمیشن کا ہوگا اور میں شہادت دے سکوں گا۔ اس عرصے میں اور شہادتیں بھی دی جا چکی ہوں گی۔ جن سے معلوم ہوگا کہ کن کن امور پر زیادہ زور دینا چاہیے۔

لیکن اگر حکم ہو تو میں کل ہی علی گڑھ پہنچ جاؤں۔ کل ہی تار دیا تھا اس کا جواب اب تک نہیں ملا ہے۔ اگر ضرورت معلوم ہوئی اور آپ نے یا جو کوئی بھی پریسیڈنٹ کمیشن ہو، اس نے تار دے دیا کہ ہفتہ ہی کو شہادت دو تو فوراً چلا آؤں گا۔ شہادت کو قلمبند آج شام کو کروں گا۔ مگر مصالحہ سب تیار ہے۔ اس عرصہ میں یہاں بھی ایک جلسہ ہوا تھا۔ جس کی روئیداد خدمتِ عالی میں ارسال ہو چکی ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس قدر عجلت اس کمیشن کے بیٹھنے میں کیوں ہوئی۔ اس فیصلہ پر تو طلبا کا آنا منحصر ہے نہیں کیونکہ سکریٹری صاحب اور پرنسپل صاحب کے خطوط سے ایسا معلوم نہیں ہوتا۔ اتنی جلدی میں غور بھی نہ ہو سکے گا اور بر سر کار لوگ اس وقت بھی نہ آسکیں گے۔ جو رائے رام پور کے جلسے نے دی ہے وہ ناقابل غور ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ کمیشن دسہرے میں ضرور اجلاس کرے۔ خواہ کمیشن نیا ہی کیوں نہ بنانا پڑے۔

مصرع اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

اس علی گڑھ نے اب تک اس قدر پریشان رکھا ہے کہ لیگ کا کام بہت کم ہو سکا۔ آخری پروف درست کرکے چھپنے کو دے دیئے گئے۔ امید کہ ایک ہفتہ میں انگریزی کاپیاں دو ہزار تیار ہو جائیں گی۔ اردو کے مترجم صاحب نے اب تک ترجمہ کرکے نہیں دیا۔ انگریزی کاپیوں کی قیمت ٹیلیگراف پریس

نے ۳۰ ہزار روپیہ رکھی ہے اور یہاں حافظ صاحب کے مطبع میں ۵۰۰ کاپیاں غالباً ۲۰ تک تیار ہو جائیں اور شاید کانسٹی ٹیوشن کو بھی مرتب کرسکوں۔ سرکلر خط آج ہی چھاپنے کو بیٹھا ہوں۔ اس میں صرف روئیداد میں دیر کا باعث اور کانسٹی ٹیوشن کے متعلق رائے مانگنا بھی ہو گا۔ مسودہ کانسٹی ٹیوشن یکم تک بھیجنے کا وعدہ کیا جائے۔ اور ممبران کمیٹی کو جلسہ سے تین دن قبل بلانا مناسب ہے تاکہ خود وہ سوچ کر آخری فیصلہ اپنا دے دیں ؎

یک من و خیل آرزو دل یکہ مدعا ہم
تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

صرف آپ کی توقع پر یہ سب کام ہو رہا ہے۔ خدا آپ کی عمر، عمرِ خضر سے کم نہ کرے۔ آمین ثم آمین

آپ کا عزیز نیازمند
محمد علی

مدیرانِ اخبارات

(۳۷)

[خواجہ حسن نظامی نے شیخ ضیار الحق (برادرِ بزرگ بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم) کو ایک خط میں برٹش حکومت کے لیے اپنی خدمات کے سلسلے میں لکھا کہ "میں نے چیف کمشنر صاحب دہلی سے مفصل حالات بیان کر دیے تھے' اور نظام کو پان اسلامزم کے جو سبق دیے جاتے تھے ان کی باضابطہ اطلاع دے دی تھی اور مجھے معلوم ہے کہ انھوں نے پنجاب گورنمنٹ کو اس خطرے سے آگاہ بھی کیا تھا۔ یہ خط بالکل خانگی ہے' اس کو چاک کر دیجیے۔ یعنی میرے اس کام کی خبر سوائے آپ کے کسی کو نہ ہو۔" یہ ۱۲ اگست ۱۹۱۶ء کا خط تھا۔ اس وقت خواجہ صاحب کے شیخ صاحب سے تعلقات اچھے تھے لیکن ۱۹۲۶ء میں تعلقات ویسے نہ رہے تو انھوں نے خواجہ صاحب کے خطوط محمد علی کو دے دیے۔ محمد علی ان سے بہت متاثر ہوئے اور نومبر ۱۹۲۶ء سے جنوری ۱۹۲۷ء تک تقریباً دو درجن اداریے مقالات اور شذرات ہمدرد میں لکھے۔ مراسلات' منظومات' منقولات اس کے علاوہ تھے۔ خواجہ صاحب کا موقف بہت کمزور تھا لیکن وہ خود اتنے کمزور نہ تھے۔ حکومت بھی ان کی پشت پر تھی۔ محمد علی کا جواب دینے کے لیے "غریبوں کا اخبار" نکلا۔ منادی میں بھی لکھا جانے لگا۔ منادی کے جواب میں ادھر سے "سنادی" جاری ہوا۔ اور اس کے توڑ کے لیے "آزادی" نکل آیا۔ خواجہ صاحب کی خوب بھد اڑی۔ لیکن محمد علی کے مقام سے بھی اس طوالت اور سطحیت کو فروتر سمجھا گیا محمد علی نے اس جنگ میں اپنے معاصر کو شریک کرنا چاہا اور ان کے نام ایک کھلا خط "مسلمان ایڈیٹروں سے خطاب! ایک نئے اسمار الرجال کی فہرست" کے عنوان سے ۲ دسمبر ۱۹۲۶ء کو ہمدرد میں اداریے صفحے پر چھاپا۔ ذیل میں وہی خط درج کیا گیا ہے۔ محمد علی کے اس سلسلۂ مضامین اور اس تحریک سے دلچسپی لی گئی لیکن اس کی پذیرائی نہیں ہوئی' بعد میں محمد علی کا جوش بھی ٹھنڈا پڑ گیا لیکن خواجہ صاحب ملک

وہ امریکہ کی جو خدمت انجام دے رہے تھے وہ ۱۹۴۷ء تک دیتے رہے۔ ملک کی آزادی کے بعد اس خدمت کا کوئی موقع نہ رہا اور برطانیہ کی بجائے امریکہ مطلع ہند پر ایک مؤثر قوت کی حیثیت سے نمودار ہوا تو انھیں اس کے لیے کام کرنے کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ پاکستان کے ایک سفر میں انہوں نے پاکستان میں امریکی سفیر سے ملاقات کی اور ہندوستان میں امریکہ کے لیے کام کرنے کی پیش کش کی اور اپنے سابقہ تجربے کا حوالہ بھی دیا۔ یہ بات ان ہی کے ایک مرید اور سلسلہ عالیہ نظامیہ کے ایک منتسب مشتاق احمد وجدی سابق کمپٹرولر اینڈ آڈیٹر جنرل پاکستان نے اپنی خودنوشت "ہنگاموں میں زندگی" میں لکھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"خواجہ صاحب پاکستان کئی مرتبہ آئے، پہلی مرتبہ تشریف لائے تو فرمایا کہ مجھے امریکن سفیر سے ملنا ہے اور مترجم کی ضرورت ہے تم ساتھ چلو۔ میں دفتر سے رخصت لے کر حاضر ہوا۔ اس دن کی گفتگو سے مجھے تعجب بھی ہوا اور بہت سے خیالات بھی بدل گئے۔ مختصراً انھوں نے کہا کہ میں انگریزی سرکار کے لیے ہندوستان میں ہمیشہ پروپیگنڈہ کرتا رہا اور سرکار برطانیہ کے لیے بہت سے اہم کام کیے ہیں۔ آپ چاہیں تو میں امریکن گورنمنٹ کے لیے پاکستان یا ہندوستان میں پروپیگنڈے کے لیے موجود ہوں۔ سفیر صاحب سنتے رہے اور یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس قسم کا کام میرے سپرد نہیں ہے"]

برادرم۔ السلام علیکم

حضور نظام کے خلاف خواجہ حسن نظامی کی غداری اور مخبری کے جو انکشافات ہمدرد میں شائع ہو رہے ہیں، امید ہے کہ آپ نے ان کو پورے غور و خوض کے ساتھ پڑھا ہو گا اور اپنے معزز اخبار میں اس مسئلے کے متعلق اظہار خیال کیا ہو گا۔ اگر کثرت مشاغل یا کسی اور سبب سے آپ نے مضامین کے اس سلسلے کو اب تک نہیں پڑھا جس میں خواجہ حسن نظامی کی دستی تحریروں سے ان کی مخبری اور جاسوسی کا ثبوت پیش کیا گیا ہے تو براہ کرم اب پڑھیے اور جلد از جلد اپنی رائے کا اظہار فرمائیے۔

ہمدرد کے اس سلسلۂ مضامین کے جواب میں خواجہ حسن نظامی نے ایک لمبی چوڑی تحریر شائع کی ہے جس کی ایک کاپی آپ کے ملاحظے کے لیے ارسال کی جاتی ہے۔ جب

آپ اس تحریر کو پڑھیں گے تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ اصل مسئلہ زیر بحث کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں دیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس معاملے کے متعلق خود ان کے ہاتھ کی اس قدر صریح اور صاف تحریریں موجود ہوں اس کا جواب ہی کیا ہو سکتا ہے لیکن محض سلسلۂ کلام کو طول دینے اور اس طرح اصل بحث کو غیر متعلق اور فضول مباحث میں مخلوط کرنے کے لیے خواجہ صاحب نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے، جس سے غالباً ضمنی طور پر ان کی یہ مراد ہے کہ عوام پر ان کا اثر بدستور قائم رہے اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ خواجہ حسن نظامی کے پاس ان الزامات کا کوئی جواب نہ تھا۔

مفاد قومی کے ایک امین کی حیثیت سے آپ کا فرض ہے کہ آپ "ہمدرد" کے متذکرہ بالا مضامین اور خواجہ صاحب کے نام نہاد جواب کو نہایت غور سے پڑھیں اور اس کے بعد آپ جو رائے قائم کریں اس کا اعلان اس وقت تک برابر کرتے رہیں جب تک کہ معاملہ یک سو نہ ہو جائے۔ ایک دو مضامین لکھ دینے سے کام نہیں چلے گا۔ مسلمانوں کی خود فراموشی اور غفلت سے آپ بے خبر نہیں۔ ضرورت ہے کہ یہ مسئلہ برابر ان کے پیش نظر رہے یہاں تک کہ ان کو اس کی اہمیت کا پورا پورا احساس ہو جائے اور وہ ملک کے ہر گوشے میں جلسے کر کے اپنی آوازیں بلند کریں اور ملک کا بچہ بچہ اس غدار کی غداری سے آگاہ ہو جائے اور آئندہ کوئی اس کا شکار نہ ہو سکے۔ ایک نازک شیشے پر ہلکی سی ضرب بھی کافی ہے۔ پتھر توڑنے کے لیے زور کی اور پیہم ضربیں لگانا پڑتی ہیں۔ ایک دو ہلکی ضربیں لگانا فضول اپنے ہاتھ دکھانا ہیں۔

اگر اس صریح اور شرمناک غداری کے بعد بھی خواجہ حسن نظامی مسلمانوں کی نظر میں اس قابل ہوں کہ تبلیغ جیسا اہم اور نازک کام بدستور ان کے ہاتھ میں رہے اور وہ اس کے نام سے مسلمانوں کو بے دریغ لوٹتے رہیں اور لوگوں کی کنسوئیاں لے لے کر حکومت کے حجروں میں جا کر سرگوشیاں اور جاسوسیاں کرتے رہیں، تو ان کو اختیار ہے۔ لیکن اگر یہ ضروری ہے کہ ایسے خطرناک مار آستین کا سر ہمیشہ کے لیے کچل دیا جائے تو اسلامی اخبارات کا فرض ہے کہ وہ اس پر مسلسل مضامین لکھیں اور اس وقت تک خاموش نہ ہوں جب تک کہ وہ بلا مسلمانوں کے سر پر خواجہ حسن نظامی کی شکل میں مسلط ہے، قطعی طور پر دور نہ ہو جائے۔

میں نے یہ سلسلہ مضامین چند دن تک اخبار کے کالم بھرنے یا کسی ذاتی دشمن کو بے آبرو کرنے کے لیے نہیں شروع کیا ہے۔ میرے سامنے اس کے اخبار کا ضروری کام ہے جس کی طرف اب بھی توجہ نہ کرنا ہماری ہلاکت کا باعث ہو جائے گا۔ ذاتیات یا زیادہ سے زیادہ ادبی بحثوں اور صحافتی چشمک کے لیے میرے پاس ایک منٹ بھی نہیں ہے۔ مگر اب ناممکن ہو گیا ہے کہ ایسے غداران ملت کی رہنمائی میں مسلمانوں کو گم کردہ راہ قافلہ کی طرح ابھی اور بھٹکنے دیا جائے، منزل دور ہے اور کٹھن ہے اور ع

جرسِ فریاد می دارد کہ بر بندید محملہا

خدارا مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کیجیے یا کم از کم انھیں خود راستہ ڈھونڈنے دیجیے رہزنوں کو رہبر نہ بننے دیجیے ؎

یارانِ تیز گام نے منزل کو پا لیا
ہم محوِ نالہ جرسِ کارواں رہے!

ہماری حالت تو اس سے بھی بدتر ہے اس لیے کہ ہم "محوِ نالہ جرسِ کارواں" نہیں بلکہ راستہ بھول کر ان رہبروں کی پیروی کرتے کرتے ہی ہمارے پاؤں شل ہو گئے ہیں اور آبلہ پائی اب حنا بندی کا تقاضا کر رہی ہے۔ اب تک نہ باہر سے آئے ہوئے دشمن کی دشمنی سے بچنے کا راستہ نکالا گیا ہے نہ برادرانِ وطن ہی کی "دوستی" سے بچنے کا، نہ تبلیغ ہی ہوئی نہ تنظیم ہی۔ ادھر سوراج ملنے کی جگہ غلامی کی اور بھی بھاری زنجیریں گھڑی اور ڈھالی جا رہی ہیں اور شدھی اور سنگٹھن پہلے سے بھی زیادہ زور پر ہیں۔ غداروں اور مکاروں پر اعتماد کرنے سے اس کے سوا اور کیا ملے گا؟ اقبالؔ نے کیا خوب کہا ہے ؎

می شود ہر مو درازے خرقہ پوش — آہ ازیں سوداگرانِ دین فروش
با مریداں روز و شب اندر سر — از ضرورت ہائے ملت بے خبر
[illegible] عناں ہم صوفیاں [illegible] — اعتبارِ ملتِ بیضا شکست
واعظِ ما چشم بر بت خانہ دوخت — مفتیِ دینِ مبیں فتویٰ فروش

چیست یاراں بعد ازیں تدبیرِ ما؟
رخ سوئے میخانہ دارد پیرِ ما

آج ایک نئے اسمار الرجال کی ضرورت ہے جو راویوں کی نہیں بلکہ رہبروں کی تعدیل کرے اور اس نئے اسمار الرجال کی ترتیب کے لیے وہی کیا جائے جو پہلے کیا جا چکا ہے اور جس کی حالی مرحوم نے یوں تصویر کھینچی تھی کہ ؎

گروہ ایک جویا تھا علم نبی کا — لگایا پتا جس نے ہر مفتری کا
نہ چھوڑا کوئی رخنہ کذب خفی کا — کیا قافیہ تنگ ہر مدعی کا
کیے جرح و تعدیل کے وضع قانوں
نہ چلنے دیا کوئی باطل کا افسوں
اسی دھن میں آساں کیا ہر سفر کو — اسی شوق میں طے کیا بحر و بر کو
سنا خازن علم دیں جس بشر کو — لیا اس سے جا کر خبر اور اثر کو
پھر آپ اس کو پرکھا کسوٹی پہ رکھ کر
دیا اور کو خود مزا اس کا چکھ کر
کیا فاش راوی میں جو عیب پایا — مناقب کو چھانا مثالب کو تایا
مشائخ میں جو قبح نکلا جتایا — ائمہ میں جو داغ دیکھا بتایا
طلسم ورع ہر مقدس کا توڑا
نہ ملا کو چھوڑا نہ صوفی کو چھوڑا

میں خود اس احتساب سے بچنا نہیں چاہتا۔ گو اپنی خطا کاری کا اعتراف بھی ہے، آیئے اس طلسم ورع کو توڑ دیں اور اگر جھوٹا ورع اور جھوٹا تقدس ہو تو چاہیے، وہ عام میں ہو یا صوفی میں، لیڈر میں ہو یا واعظ میں۔ نہ ملا کو چھوڑیں نہ صوفی کو، نہ لیڈر کو چھوڑیں نہ رہبر کو۔ ملّت مرحومہ کی حالت ایک مریض کی سی ہے لیکن یہ مریض طبیب حاذق کا علاج بھی کرتا ہے اور عطائیوں کا بھی، اور اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ نسخہ تو طبیب حاذق سے لکھوایا جاتا ہے مگر اس کے بندھوانے کی ہمت نوبت نہیں آتی۔ پینے تو نوبت کب آتی ہے پرہیز سے گریز ہے اور عطائیوں کی دوائیں استعمال ہو رہی ہیں اور بس غذا کو مریض کا دل چاہتا ہے یہ ملک الموت کے ایجنٹ فوراً اس کے استعمال کی اجازت دے دیتے ہیں۔ چاہے وہ کتنی ہی

مفر کیوں نہ ہو۔ ایسی حالت میں اگر طبیب حاذق کا نسخہ پیا بھی جائے تو کیا فائدہ؟ اگر اس مزمن مرض کا علاج مطلوب ہے تو ایک ہی طبیب کا علاج کرلیجئے جب اس کے علاج سے نفع نہ ہو، دوسرے سے رجوع کیجیے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ طبیب ہماری پسند کا ہو۔ آپ خود پسند فرمائیے، لیکن دو طبیبوں کی دوا نہ کیجیے۔ یہاں تو یہ ہو رہا ہے کہ طب اور ویدک، ڈاکٹری اور ہومیوپیتھک ہی نہیں بلکہ گنڈا تعویذ، جھاڑ پھونک اور ٹوٹکے سبھی کچھ ایک ہی وقت میں جاری ہیں۔ جس نے جو بتایا اس پر ایمان لے آئے اور لگے عمل کرنے اور کسی کا کہنا نہ مانا تو بس ایک طبیب حاذق کا۔ جس کا نسخہ گراں ہے اور جو سخت پرہیز کراتا ہے۔ اس طرح تو مریض کل کا مرتا آج مرجائے گا۔ خدارا اس پر رحم کیجیے اور اس کی جان بچائیے ؎

من نہ گویم کہ ایں مکن آں کن
مصلحت بیں و کار آساں کن

میں جانتا ہوں کہ اس استدعا پر کہا جائے گا کہ یہ خود واحد لیڈر رہنا چاہتے ہیں اور بلا شرکت غیرے ملک و ملت کے مالک بننے کے خواہش مند ہیں۔ بہت سے غیرت مند ایسی فضا میں ایسی استدعا ہرگز نہ کرتے اور گوشۂ عافیت تلاش کرکے بیٹھ رہتے اور خاموش ہو جاتے۔ مگر اس کا الزام سننا مجھے قبول ہے اور امت مرحومہ کو مرتے دیکھنا اور خاموش رہنا قبول نہیں ہے۔ میں بے غیرت ہوں خودغرض نہیں ؎

گرچہ بدنامیست نزد عاقلاں
مانمی خواہیم ننگ و نام را

ملک و ملت کی حالت پر نوحہ کن
آپ کا بھائی
محمد علی

مکتوب الیہ نامعلوم

(۲۶)

لینسڈاؤن

(..... 1915ء)

۱۔ میں[1] نے اوا خر فروری میں طے کر لیا تھا کہ لاہور کے چیف کورٹ میں کامریڈ کا جو مقدمہ دائر تھا، اس کی سماعت اور دہلی کے لیجسلیٹو کونسل کے سیشن کے بعد کچھ عرصے کے لیے اپنی صحت کی اصلاح اور دماغی کام سے فرصت حاصل کرنے کے لیے دہلی سے باہر چلا جاؤں گا، کامریڈ بند ہونے سے جو فرصت مل گئی اُس کے وجہ ذیابیطس کے مرض میں مبتلا ہو چکا تھا اور اس کے علاوہ بھی اپنی صحت خراب کر چکا تھا، مجھے ضروری معلوم ہوا، اُس فرصت کو غنیمت جان کر کچھ عرصے کے لیے آرام کروں۔

۲۔ اس تعطیل کے زمانہ کو کہاں گزاروں اس کے متعلق مختلف مقامات کا خیال آیا، پہلے میرا ارادہ ہوا کشمیر چلا جاؤں، لیکن اوّل تو بُعد، دوسرے کشمیر میں مسٹر کوپ سابق رزیڈنٹ بڑودہ کا رزیڈنٹ ہونا جو غالباً مجھ سے ان مضامین کے باعث برافروختہ ہیں جو مہاراجہ صاحب بڑودہ کے واقعۂ دربار کے متعلق کامریڈ میں شائع ہوئے، ان دونوں وجوہ سے میرے احباب نے مجھے کشمیر جانے سے روکا، بعض نے صلاح دی کہ میں بکھڑی چلا جاؤں مگر وہاں جاتے میں بھی کچھ بعد مانع ہوا، اور کچھ یہ خیال کہ بکھڑی میں، مَیں بالکل اجنبی ہوں گا، اور کسی قسم کی صحبت میسّر نہ آئے گی، خود میرا خیال شملہ کے متصل کسی پہاڑی پر ایک مکان لینے کا تھا، لیکن بعض احباب نے اس کے برخلاف رائے دی، اس لیے کہ انھیں خوف تھا کہ مبادا پنجاب

---

[1] لینسڈاؤن میں نظربندی کے زمانے کا ہے مکتوب الیہ کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ اس کا شروع کا حصہ القاب و آداب پر مشتمل ۔ جو نہیں ہے البتہ مباحث پورے موجود ہیں۔

گورنمنٹ جو مسٹر ظفر علی خاں پر ناروا تشدد کر چکی تھی، اپنے دستِ تشدد کو مجھ تک پہنچائے، بعض احباب کا خیال تھا کہ مجھے منصوری جانا چاہیے، اور اس میں ایک فائدہ یہ تھا کہ ڈاکٹر انصاری بھی منصوری میں مکان لے رہے تھے۔ مگر ممالک متحدہ کے حکام سے جو میرے تعلقات تھے، وہ ظاہر ہیں، اور منصوری کی حالت شملہ سے بھی بدتر تھی۔ ایسی حالت میں چارہ نہ تھا کہ یا تو دارجلنگ یا مہابلیشور وغیرہ کا دور دراز سفر اختیار کیا جائے، یا دہلی ہی میں اقامت رہے مؤخر الذکر حالت میں دراصل فرحت ملنا ناممکن ہے، اس لیے کہ میرا دہلی میں ہونا اور ہمدرد کے متعلق کچھ کام نہ کرنا اور متعدد احباب سے نہ ملنا اور کسی معاملات کے متعلق استفسارات کا جواب نہ دینا ناممکن تھا، آخرش یہ رائے قرار پائی کہ کم سے کم کچھ عرصے کے لیے رام پور رہوں اور اس کے بعد اگر میری صحت کے لیے ضروری ہو تو، ڈاکٹر انصاری کے ہمراہ منصوری جا کر رہوں میرے بہت سے احباب اس فیصلہ کے بالکل خلاف تھے اور اُن کی رائے تھی، کہ ممالک متحدہ کے حکام جس کام کو خود کرتے ہوئے ڈریں گے، اُس کو ریاست کے ذریعہ سے کراتے میں انھیں کچھ تامل نہ ہوگا، اس لیے کہ ان کی خواہش انتقام تو پوری ہو جائے گی، مگر ساری بدنامی ریاست کے سر رہے گی، میں نہیں سکتا کہ یہ شبہات بے جا تھے، خصوصاً اس حالت میں جب کہ واقعات نے اس کی تصدیق کر دی ہے، مگر مجھے خارجاً معلوم ہوا تھا کہ اس سے قبل ایک بار میرے اور شوکت علی کے رامپور آنے کے متعلق لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ نے نواب صاحب کو کچھ طنزاً لکھا تھا، جس کے جواب حضور ممدوح نے صاف لکھ دیا تھا کہ رام پور ان کا وطن ہے، اور میں اُن کی رام پور کے آمد و رفت کو نہیں روک سکتا، اس لیے مجھے قوی امید تھی کہ ریاست میں میرے ساتھ کوئی کارروائی نہ کی جائے گی۔ جس کے کرنے میں خود گورنمنٹ کو تامل ہو۔ جب کہ ریاست کو میرے طرز عمل سے شکایت پیدا ہونے کا شبہ بھی نہیں ہو سکتا۔

۳۔ رام پور آنے کے متعلق میں آخری فیصلہ غالباً بیس مارچ تک کر چکا، اور بمبئی میں کچھ قانونی مشورہ کرنے اور علی گڑھ میں اولڈ بوائز کے سالانہ جلسہ

مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن کے اجلاس کے بعد میں اپنے تمام مشاغل سے فارغ ہو کر پندرہ۱۵ اپریل کو عازم رامپور ہوا، میرا قصد ۱۳ر اپریل ہی کو جانے کا تھا مگر رامپور میں طاعون کا زور ہونے کے باعث ڈاکٹر انصاری نے اصرار فرمایا کہ میں مع اپنے متعلقین طاعون کا ٹیکہ لگوانے کے بعد رامپور جاؤں، چنانچہ ۱۳ر تاریخ کو ہم سب کے ٹیکہ لگایا گیا، اور دو دن حرارت کے باعث دہلی میں رہ کر پندرہ اپریل کو شب کے پونے دس بجے کی گاڑی سے رام پور روانہ ہوئے اور سولہ۱۶ تاریخ کے سوا چھ بجے رام پور پہونچ گئے۔

۴۔ شب ماقبل میں میرے سالے مسٹر معظم علی ڈھاکہ سے رام پور پہونچ چکے تھے، اور ان کے ایک دوست تشریف لائے ہوئے تھے، رام پور پہونچنے کے بعد ہم سب کا ارادہ ہوا کہ چند دن کے لیے سوار کی تحصیل میں شکار کے لیے چلے جائیں، چنانچہ سترہ۱۷ کی صبح کو میں اپنے بھائی کے گاؤں موضع رامپور کو مع چند احباب کے اور چند عزیزوں کے روانہ ہو گیا، مگر جیسا کہ میرا دستور رہا ہے۔ میں جس دن رامپور پہونچا، اسی دن حضور نواب صاحب کے سلام کے واسطے کوٹھی خاص باغ کو جہاں حضور والا تشریف رکھتے تھے، گیا۔

مگر جب سے کانپور کا واقعہ پیش آیا ہے، حضور ممدوح کی باریابی کا شرف حاصل نہیں ہوا ہے، گو میں اپنی حاضری کی اطلاع ہمیشہ دیا کرتا ہوں، چنانچہ اس بار بھی یہی ہوا، چند گھنٹہ کوٹھی خاص باغ میں سکریٹری کے پاس بیٹھنے کے بعد میں شب کو مکان واپس آیا اور دوسرے دن صبح کو شکار کے لیے روانہ ہوا

۵۔ ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰ تاریخوں کو ہم نے تحصیل سوار میں شکار کھیلا، اور مؤخر الذکر تاریخ کو عازم رامپور ہو کر شب کے آٹھ بجے مکان پر پہونچا، اس عرصہ میں میری طبیعت کچھ نادرست تھی اور شکار و سفر کے کسل کے باعث مجھے شب کو مکان آتے ہی بخار آ گیا، البتہ صبح کو بخار میں کمی تھی، ۲۱ر کی صبح کو مجھے معلوم ہوا کہ بنیش کو ممالک متحدہ کے انسپکٹر جنرل پولیس مسٹر ڈگلس اسٹریٹ رام پور آئے ہوئے ہیں، اور قلعہ معلیٰ انگریزی مہمان خانہ میں مقیم ہیں، اس کے کچھ دیر بعد میرے چچا زاد بھائی کپتان حشمت علی صاحب جو قلعۂ معلی کے

کپتان اور مجسٹریٹ ہیں، میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ نواب صاحب صبح کو تشریف لائے تھے، اور میرے متعلق دریافت فرماتے تھے کہ شکار سے واپس آگیا یا نہیں، اور مسجد کانپور میں خونباری کے متعلق بیس[۲] اپریل کے ہمدرد میں جو حالات شائع ہوئے تھے، اس کے متعلق فرماتے تھے کہ یہ کیا واقعہ ہے، مشہد مقدس میں تو خونباری ہوئی نہیں، کانپور کی مسجد میں کیسے ہوئی، میں نے عرض کیا کہ اگر جناب سے پھر دریافت فرمائیں تو کہہ دیجیے گا کہ میں تو پندرہ[۱۵] اپریل کو دہلی سے رخصت ہو چکا ہوں، اور اخبار کا تمام کام اُس دن سے دوسروں کے سپرد کر چکا ہوں، مجھے مسجد کی خونباری کا کیا علم ہو سکتا ہے، محض اتفاقاً بیس[۲] کی شب کو شکار سے واپس آنے پر اُنھیں کے یہاں اُس دن کا ہمدرد نظر سے گذرا اور اس واقعہ کی اطلاع ہوئی، ورنہ میں نے تو پندرہ اپریل کے بعد سے ہمدرد بھی نہیں دیکھا۔

۶۔ یہ غالباً صبح نو ساڑھے نو بجے کا واقعہ ہے، اس کے چند ہی منٹ کے بعد قلعہ سے ایک ہرکارہ میرے پاس آیا اور مجھے اطلاع دی کہ چیف سکریٹری صاحب نے کوٹھی خاص باغ سے ٹیلیفون دیا ہے کہ مسٹر محمد علی کو کوٹھی خاص باغ بھیجا جائے ایک سرکاری کام کے لیے ضرورت ہے، کچھ عرصہ گاڑی کا انتظار کرنے کے بعد میں کوٹھی خاص باغ گیا اور غالباً گیارہ بجے تک وہاں پہونچ گیا چیف سکریٹری کو اپنے پہونچنے کی اطلاع دلوائی، اور اُن کے دفتر کے ڈیرہ میں بیٹھا رہا تھوڑی دیر بعد وہ تشریف لائے، اور مجھ سے مسجد کانپور کی خونباری کے متعلق دریافت فرمایا، میں نے ان کو بھی وہی جواب دیا جو اپنے بھائی کپتان حشمت علی صاحب کو اس سے قبل دے چکا تھا، اس کے بعد وہ سرکار میں تشریف لے گئے، چند منٹ کے بعد ایک صاحب سرکار میں سے تشریف لائے، اور مجھ سے فرمایا کہ سرکار کا حکم ہے کہ آپ کوٹھی میں دفتر کے کمرہ میں آجائیں، جب میں دفتر کے کمرہ میں پہونچا تو چیف سکریٹری صاحب نے فرمایا کہ سرکار نے آپ کو اپنے استراحت کے کمرہ میں طلب فرمایا ہے؛ چنانچہ جوتا اتار کر میں اُن کے ہمراہ سرکار کی خوابگاہ میں حاضر ہوا حسب معمول دو تین حکام اور دو تین مصاحبین اس کمرہ میں موجود تھے اور سرکار

پلنگڑی پر تشریف فرما تھے، چونکہ مجھے پونے دو برس سے شرف باریابی حاصل نہیں ہوا تھا، اس لیے میں نے اپنے آباؤ اجداد کے طریقہ پر قدم بوسی کی، اور سلام کرنے کے بعد حسب الحکم سرکار پلنگڑی کے پاس بیٹھ گیا، اس کے بعد سرکار نے فرمایا کہ میں پالیسی کی باتیں نہیں جانتا ہوں بس میں کہتا ہوں۔ آپ دوران جنگ میں رام پور ہی میں رہیں، قلعہ میں آپ کو ایک کمرہ مہمان خانہ میں دے دیا جائے گا وہیں آپ قیام رکھیں، اور اخبار کو کریں بند، جب لڑائی ختم ہو جائے تو سو گالیاں آپ گورنمنٹ کو دیں اور چار سو مجھے، جب تک لڑائی رہے گی آپ کو قلم دوات نہیں دی جائے گی، میں بغیر سوچے سمجھے ہاتھ نہیں ڈالتا ہوں، میرے ہاتھ کو کرا نہ ہونے دینا، اس پر میں نے عرض کیا کہ میں اخباروں کے لیے کوئی مضمون لکھنا چاہتا، میری صحت خراب ہو چکی ہے، اور آرام کرنے کی غرض سے گھر آیا ہوں، اس پر سرکار نے قلعہ میں رہنے کے متعلق فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ انگریز مجھ سے کہا کرتے ہیں کہ تم ہی نے تعلیم دلا کر دونوں بھائیوں کو ہمارے پیچھے لگایا ہے، اس لیے یہ مناسب ہے کہ تم دوران جنگ میں قلعہ میں رہو، اور اخبار کو بند کر دو، میرا ناک میں دم ہو گیا، ہر انگریز تمھاری شکایت کرتا ہے، سارے جہان کو شیطان کی طرح گمراہ کر رکھا، یہ مشہور کر دیا ہے کہ میں بھی تمھارا ہم خیال ہوں، میں نے اس کی تردید کی مگر نواب صاحب سب و شتم فرماتے رہے، جس کی وجہ سے میں نے خاموش رہنا مناسب سمجھا، مگر اسی سلسلہ میں سرکار نے فرمایا تو نمک حرام ہے، اس پر میں نے کہا کہ یہ درست نہیں، اس پر اور بگڑ کر سرکار نے فرمایا کہ تو نمک حرام اور تیرا باپ نمک حرام، میں نے عرض کیا کہ جو کچھ میرے باپ نے کیا وہ ان کا فعل تھا، اور اس کا عذاب ثواب اُس کی گردن پر، میں ذمہ دار نہیں، لیکن اپنے متعلق پھر عرض کروں گا کہ میں نے کبھی نمک حرامی نہیں کی ہے، اس پر سرکار اور برافروختہ ہوئے اور کہا کہ میرے سامنے جواب دیتا ہے، میں نے عرض کیا سرکار نے اس سے قبل بھی بہت کچھ برا بھلا کہا، مگر میں نے گردن نہیں اٹھائی البتہ نمک حرامی کے الزام کا جواب دینا میرا فرض ہے، میں سرکار کے سامنے پھر

عرض کروں گا کہ یہ الزام بالکل غلط ہے، اور جس کسی نے سرکار سے یہ کہا ہے، وہ جھوٹ بکتا ہے، رہا قلعہ میں مقید ہونا یہ تو کوئی چیز نہیں ہے، اگر سرکار جیل بھی بھیج دیں تو ایک مرتبہ اپنی اطاعت شعاری ثابت کرنے کے لیے، اور سرکار کا کہنا نیچے نہ ڈلنے کے خیال سے میں خود بیڑیاں پہن کر جیل خانہ چلا جاؤں گا، میرے خاندان میں جو کچھ دولت و ثروت، جاہ و عزت ہے وہ سرکار اور سرکار کے آباؤ اجداد کی دی ہوئی ہے، اور ان کی خدمت میں حاصل ہوئی ہے اگر سرکار یہ سب کچھ لے لیں گے تب بھی اپنی ہی دی ہوئی چیز لے لیں گے، ہم یہ چیزیں کہیں اور سے نہیں لائے تھے، اور میری تو تعلیم بھی سرکار ہی کے قرض دیئے ہوئے روپیہ سے ہوئی تھی، اس کی بدولت جو کچھ تھوڑی بہت قابلیت یا عزت حاصل ہے، وہ سرکار ہی کا طفیل ہے، اس گفتگو کے بعد بھی سرکار مجھے قلعہ بھیجنے پر مصر رہے، اور فرمایا کہ ہندوستانی مہمان خانہ کے نیچے کے درجے میں ان کو ایک کمرہ دے دیا جائے، وہاں آج کل مقابلتاً گرمی کم ہوگی، بجلی کا پنکھا موجود ہے، کھانے کے لیے ہندوستانی اور انگریزی باورچی خانہ کو حکم دے دیا جائے، کہ یہ جو کچھ طلب کریں، ان کو دیا جائے، اور ہندوستانی اور انگریزی دواخانوں کو بھی حکم دیا جائے کہ حکیم یا ڈاکٹر جو ان کے لیے دوا تجویز کریں وہ ملتی رہے، اس کے بعد چیف سکریٹری سے فرمایا کہ اس کی اطلاع علی امام صاحب کو ضرور کر دینا، اس پر انہوں نے کہا کہ پہلے سرکار یہ مناسب نہیں ہے تو فرمایا کہ نہیں ان کو ضرور لکھ دینا، وہ ہی مجھے لکھ سکتے ہیں، اور کوئی نہ لکھے گا پھر اخبار کے متعلق بھی فرمایا کہ ہاں ہمدرد میں ضرور چھاپ دینا کہ میں نے یہ حکم دیا ہے، اس کے اخبار بند کرنا، میں نے اس کے جواب میں عرض کیا کہ تو یہ تو قلعہ میں رہنا ہے، اگر سرکار مجھے جیل میں رہنے کا حکم دیں بلکہ سزائے موت بھی دیں تو میری زبان پر حرف شکایت نہ آئے گا، سرکار اور سرکار کے آباؤ اجداد نے ہماری پرورش قاعدہ اور قانون کی پابندی میں نہیں کی اس لیے آج اگر سرکار سزا دیتے ہیں، تو ہم بھی قاعدہ و قانون کی تلاش نہیں کریں گے، اگر گورنمنٹ ہمیں مقید کرتی تو جہاں تک قاعدہ اور قانون اجازت دیتا ہے اپنے حقوق کے لیے لڑتا

اس لیے کہ گورنمنٹ دیتی بھی ہے، تو قاعدہ و قانون کے اندر مانگ بھی سکتی ہے تو قاعدہ اور قانون کے اندر، افسوس ہے کہ سرکار ایسا خیال فرمائیں کہ ہم سرکار کے احکام کی شکایت اخباروں میں کرنے جائیں گے، اگر سرکار کے حکم سے میری جان بھی جاتی رہے، تو اس کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا، مگر اپنے اعزا کے متعلق کہہ سکتا ہوں کہ وہ تو اس کا خیال نہ کریں گے کہ ہمارے خاندان میں محمدؐعلی نام کا بھی کوئی شخص کبھی پیدا ہوا تھا، البتہ اخبار کے متعلق مجھے کچھ عرض کرنا ہے، اور مجھے امید ہے کہ اس کو توجہ سے سُنا جائے گا، اس لیے کہ اس سے قبل بھی سرکار کو جو شکایت واقعہ کانپور کے متعلق مجھ سے ہے، اس کے متعلق میری طرف سے میری مجبوریوں کا اظہار ہو جائے گا، میں عرض کر چکا ہوں کہ جو کچھ میرا ہے، خواہ وہ دولت ہو یا عزت، سرکار پر سے نثار ہے، مگر میں اپنے حقوق کو سرکار پر سے تصدق کر سکتا ہوں، حق العباد کی قربانی خدا کے لیے بھی نہیں کی جا سکتی اور خداوند کریم بھی حق اللہ معاف کر سکتا ہے، حق العباد کا معاف کرنا بندوں کی مرضی کے بغیر وہ بھی گوارا نہیں فرماتا، سرکار میرے تمام حقوق سلب کر لیتے، مگر جو خدمت میں کامریڈ و ہمدرد کے ذریعہ سے قوم و ملک کی کرتا رہا ہوں، وہ کسی حالت میں ترک نہیں کی جا سکتی، اس عرصہ میں حکیم اجمل خاں صاحب بھی وہیں تشریف لے آئے۔ اور انہوں نے بھی ہمدرد کے متعلق فرمایا کہ اُس کی روش قابلِ اعتراض نہیں معلوم ہوتی بلکہ نہایت معتدل ہے، اس پر سرکار نے فرمایا کہ خیر اخبار جاری رہے مگر تم قلعہ میں رہو، اس کے بعد متفرق امور پر گفتگو ہوتی رہی، اور پھر جب سرکار، حکیم صاحب سے کچھ گفتگو فرمانے لگے تو ہم سب اُٹھ کر باہر چلے آئے اور میں صاحب چیف سکریٹری کے ہمراہ اُن کے دفتر کے ڈیرہ میں چلا گیا۔

۷۔ میں نے مناسب سمجھا کہ کم از کم اپنے بریت کے لیے ایک امر کے متعلق اُن کے توسط سے سرکار کی خدمت میں عرض حال کی جائے، اور وہ یہ تھا کہ اگر سرکار کے احکام معلوم ہونے کے بعد پبلک میں کچھ شورش ہو تو میں ذمہ دار نہ ہوں گا، چنانچہ میں نے چیف سکریٹری صاحب سے کہا کہ میں اس وقت آپ سے بحیثیت

ایک دوست کے گفتگو نہیں کر رہا ہوں، بلکہ محض بحیثیت ایک عہدہ دار ریاست کے، ریاست میں اس وقت کوئی وزیر یا مدار المہام نہیں ہے، بلکہ چند سیکرٹریز ہیں، اور آپ کا لقب چیف سیکرٹری ہے، اس لیے آپ کا فرض ہے، کہ آپ میرے متعلق احکامات کے بارے میں سرکار کو ان کے تمام نتائج سے مطلع کریں، سرکار کی عمر کا زیادہ حصہ رام پور میں گذرا ہے اور بالعموم ان کے تعلقات لوگوں سے والئی ملک اور رعایا کے رہے ہیں، شخصی حکومت الگ چیز ہے، اور جمہوریت دوسری چیز ہے مجھے خوف ہے کہ نواب صاحب کافی طور پر نہیں جانتے کہ اُن کے ان احکام کا پبلک پر کیا اثر ہو گا، اگر اُن کا یہ فرمانا تسلیم کر لیا جائے کہ میں نے پبلک کو گمراہ کر رکھا ہے، تب بھی چونکہ پبلک میرے بتائے ہوئے راستہ پر چل رہی ہے، اس لیے جب تک غلط رہبر نہ سمجھے پبلک میری تکلیف سے ضرور پریشان ہو گی، اور میرے مقید ہونے پر غالباً ایک شورش ہو اور گو پبلک ایک منٹ کے لیے بھی یہ تسلیم کر لے کہ تمام کارروائی صوبہ متحدہ کی گورنمنٹ کے ایما و اشارہ سے یا کم از کم اُن کے خوش کرنے کے لیے کی گئی ہے، تاہم پبلک میں سرکار کے خلاف بھی بد دلی ضرور پھیلے گی، میرا خیال ہے کہ تمام نشیب و فراز سے سرکار کو مطلع کرنا آپ جیسے حکام کا فرض ہے، لیکن شاید آپ اسے گستاخی سمجھیں کہ میں آپ کو آپ کے فرائض کے متعلق کچھ بطور پند و نصیحت کے کہوں، اس لیے یہی سمجھ لیجیے کہ ایک اہل غرض آپ سے محض اپنے بچاؤ کی خاطر کچھ عرض کر رہا ہے، اگر آپ سرکار کو ان امور کے نشیب و فراز سے مطلع نہیں کر سکتے تو کم سے کم میری جانب سے یہ عرض سرکار کی خدمت میں پہونچا دیجیے کہ میں نے خود تو سرکار کے احکام کو سمعنا و اطعنا کہہ کر آنکھوں پر رکھ لیا، لیکن اگر میرے سلب آزادی اور پبلک سے قطع تعلق کے بعد پبلک سرکار یا سر جیمس مسٹن کے خلاف شورش کرے تو میں اس کا ذمہ دار نہ ہوں گا چنانچہ چیف سکرٹری صاحب سرکار کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور میری طرف سے میری معروضات کو سرکار میں دہرایا، اُس کے بعد چیف سکرٹری صاحب باہر تشریف لائے اور مجھ سے فرمایا کہ سرکار نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس وقت میں سوتا ہوں شب کو آٹھ

بجے بیدار ہوں گا، اُس وقت محمد علی کو پھر بلاؤں گا، اور احکام جاری کروں گا
چیف سکریٹری صاحب کو خوف تھا کہ چونکہ مسٹر ڈگلس اسٹریٹ انسپکٹر جنرل
پولیس ممالک متحدہ قلعہ میں بطور مہمان کے مقیم ہیں اُن کی موجودگی میں
میرے قلعہ کے رہنے میں مبادا کوئی ناگوار واقعہ پیش آئے، اس لیے سرکار نے
حکم دیا کہ شام تک مجھے کوٹھی خاص باغ میں دفتر کے قریب ایک کمرہ میں رکھا جائے

۸۔ میں اس کمرہ میں عصر کے وقت تک رہا اور اسی عرصہ میں مجھے حرارت
بھی ہوگئی، عصر کے وقت میں چیف سکریٹری صاحب کے ہمراہ اُن کے دفتر کے
ڈیرہ میں رہا اور شب کو انھیں کے ساتھ کھانے کے ڈیرہ میں کھانا کھایا۔
سرکار کے بیدار ہونے پر میں پھر کوٹھی خاص باغ کے کمرہ میں چلا گیا، اور حرارت
کی وجہ سے وہیں پلنگ پر لیٹا رہا، اس عرصہ میں معلوم ہوا کہ مسٹر ڈگلس اسٹریٹ
سرکار کی ملاقات کو آئے ہیں، سرکار اُن سے ڈرائنگ روم میں ملے اور
چند منٹ کے بعد چیف سکریٹری صاحب نے مجھے اطلاع دی کہ سرکار مجھے
ڈرائنگ روم میں یاد فرماتے ہیں، چنانچہ میں ڈرائنگ روم میں حاضر ہوا،
اور سرکار کو آداب بجالایا اس پر مسٹر ڈگلس اسٹریٹ نے بھی اُٹھ کر مجھ سے رسم
مزاج پرسی کی اور مصافحہ کیا، سرکار نے کرسی کی طرف اشارہ کرکے بیٹھنے کا حکم
دیا، اس گفتگو کے صرف وہی حصے درج کیے جاتے ہیں، جو میری نظر بندی سے
متعلق معلوم ہوتے ہیں، انسپکٹر جنرل نے دوران گفتگو میں مجھ سے کہا کہ آپ
ہم سب کو دشمن سمجھتے ہیں، جس سے ممکن ہے کہ ان کا مفہوم خاص اپنا دشمن یا
تمام مسلمانوں کا دشمن ہو، میں نے جواب دیا کہ کیا آپ کا یہ خیال نہیں ہے، کہ
غلط فہمی کی دونوں جانب گنجائش ہے، نواب صاحب نے دوران گفتگو میں فرمایا
کہ کچھ عرصہ سرجان ہیویٹ سابق لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ نے مجھے کہا تھا کہ
دونوں بھائیوں کو رامپور سے نکال دو، میں نے پوچھا کہ کیوں، کیا وجہ ہے
میں تو اُن کو ہرگز نہ نکالوں گا، اس پر سرجان ہیویٹ نے کہا کہ اچھا آپ ان کو
سمجھا سکتے ہیں، میں نے کہا، ہاں یہ ہوسکتا ہے، چنانچہ میں نے تو ان دونوں
بھائیوں کو سمجھا دیا اور سرجان ہیویٹ کو آئندہ شکایت کا موقع نہیں ملا، مگر

جب سر جیمس مسٹن لفٹنٹ گورنر ہوئے، تو میں نے محمد علی سے کہہ دیا، کہ دیکھو یہ میرے دوست ہیں، اُن کے خلاف کبھی کچھ نہ لکھنا، کامریڈ میں سر جیمس مسٹن کی کئی بار تعریف بھی چھپی، لیکن کانپور کا واقعہ ہوا، اور محمد علی نے کامریڈ میں سر جیمس مسٹن کے خلاف لکھنا شروع کر دیا، اُس دن سے میں نے اسے اپنے پاس نہیں آنے دیا، اور آج بھی جب میں نے اسے اپنے پاس بلایا تو اور لوگ اٹھ کر جانے لگے، مگر میں نے روک لیا اور کہا کہ میں اس سے دس بارہ آدمیوں کی موجودگی میں ملنا چاہتا ہوں، سر جیمس مسٹن آخر جون ۱۹۱۳ء میں بجلی کے کارخانے کی بنیاد رکھنے رامپور تشریف لائے تھے، اس وقت کانپور کے تمام فائل ان کے پاس موجود تھے، انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کی کیا رائے ہے، میں نے کہا کہ اس عمارت کو منہدم نہ کرائیے، چنانچہ انہوں نے مان لیا مگر چند ہی روز بعد ٹائیلر و کلکٹر کانپور نے عمارت کو ڈھوا دیا، اس میں سر جیمس مسٹن کا کیا قصور ہے، اس پر میں نے عرض کیا، کہ مجھے حضور کی خدمت میں واقعہ کانپور کے متعلق کچھ عرض کرنے کا یہ پہلا موقع ہے، اگر حضور کامریڈ کے مضامین منگوا کر دیکھیں گے تو واضح ہو جائے گا کہ میں نے سر جیمس مسٹن پر انہدام مسجد کانپور کا الزام کہیں نہیں لگایا، میں نے صرف یہ لکھا کہ اُن کے ایک ماتحت نے اُن کے خلاف منشار اور شاید خلاف حکم ایک غلط کارروائی کر دی، اگر یہ واقعی ایک مضبوط حاکم ہوتے تو اس تمرد و سرکشی کی سزا اُس کو دیتے مگر وہ سخت کمزور نکلے اور ایک سویلین کے تمرد کو بھی انھوں نے گوارا کیا اور اس کی سزا دہی کو گوارا نہ کیا، اس پر نواب صاحب نے فرمایا کہ نہیں یہ تو ان کی کریم النفسی ہے، کہ انھوں نے دوسروں کی غلطی کو اوڑھ لیا، کوئی دوسرا شخص لفٹنٹ گورنر ہوتا تو سارا الزام ٹائیلر پر دھر دیتا، اس کے بعد سرکار نے خود اپنی ریاست کا ایک واقعہ دہرایا جس میں انہوں نے اپنی غلطی کے عام اعتراف سے باز رکھا، تاکہ داب حکام قائم رہے، سرکار نے یہ بھی فرمایا کہ ٹائیلر سے زیادہ قصوروار انسپکٹر منیر الدین تھا، اور مسٹر ڈگلس اسٹریٹ اُس کو سزا بھی دینا چاہتے تھے، مگر سر جیمس مسٹن نے اسی بنا پر روک دیا، مسٹر ڈگلس اسٹریٹ نے اعتراف کیا کہ واقعی منیر الدین

کا قصور تھا، پھر سرکار نے فرمایا کہ اس نے دوسری غلطی یہ کی کہ محمود آباد سے روپیہ لے کر یہ اور وزیر حسن[۱] چلے گئے۔ میں اس تمام تقریر کے دوران میں صرف ایک بار لب کشا ہوا تھا، اور چند امور میں سرکار کو غلط فہمی ہوئی تھی، یا حافظہ نے سرکار کے صحیح طور پر یاد آوری نہیں کی تھی تاہم میں نے تردید کرنا سوءِ ادب خیال کیا تھا، البتہ جب سرکار نے یہ فرمایا کہ ہم راجہ صاحب محمود آباد کے روپیہ سے ولایت گئے تھے، تو میں نے اس غلط فہمی کو دور کرنا مناسب سمجھا، اس کے بعد سرکار نے فرمایا کہ لارڈ کریو ان سے ضرور ملتے، مگر چونکہ دہلی میں ہماری میٹنگ ہو چکی تھی اس لیے وزیر ہند نے ملنے سے انکار کیا اور کہہ دیا کہ تم تمام مسلمانوں کے نائب نہیں ہو، ایک پارٹی اور بھی ہے غرض کہ ایک طرف میں نے کھینچا اور ایک طرف اس نے کھینچا اس کے متعلق میں نے اتنا عرض کیا کہ میں صرف کانپور کے متعلق ولایت نہیں گیا تھا بلکہ میرے مقدمہ کا فیصلہ کلکتہ ہائی کورٹ سے ہو گیا تھا، اُس کے متعلق مجھے پریس ایکٹ کی منسوخی کی بھی کوشش کرنا تھی، دوسرے ایڈریانوپل کا مسئلہ پیش تھا، اور میرا اور غالباً تمام مسلمانوں کا یہ خیال تھا کہ مسٹر اسکوتھ اس معاملہ میں ترکوں کے ساتھ ناانصافی کر رہے ہیں، اور جنگ بلقان کے دوران میں ان کی متضاد تقریریں اس کا ثبوت دے چکی ہیں، اس لیے میں نے ولایت کو بھی متعدد تار بھیجے تھے، اور حضور وائسرائے کو بھی ایک طویل تار دیا تھا، اس پر سرکار نے فرمایا کہ تم سے زیادہ سخت تاریں نے دیے تھے، اور اس کے بعد روس اور مشہد مقدس پر گولہ باری کے متعلق سرکار اپنے خیالات کا اظہار فرماتے رہے، پھر موجودہ جنگ کا ذکر چھڑ گیا، مسٹر ڈگلس اسٹریٹ کو سرکار اور میری رائے سے کہیں کہیں اختلاف تھا، ہندوستانی اخباروں کے خلاف مسٹر ڈگلس اسٹریٹ بہت کچھ کہتے رہے، اس پر میں نے اُن کے بعض الزامات کی تردید کی اور ہمدرد کے متعلق جو شروع

---

[۱] اکتوبر ۱۹۱۳ء میں وزیر حسن کے ساتھ انگلستان کے سفر کی اشارہ ہے۔

سے میرا اصول رہا ہے، یعنی ایسے مضامین جو کامریڈ میں شائع ہوتے تھے، اُن کے ہمدرد میں شائع کرنے سے عمداً احتراز کیا جاتا تھا، مسجد کانپور میں خونباری کے متعلق جو خبر درج ہمدرد ہوئی تھی، اس کا مسٹر ڈگلس اسٹریٹ نے ذکر کیا، میں نے کہا کہ یہ واقعہ میرے دہلی سے چلے آنے کے بعد کا ہے، مگر مجھے اس وقت اطلاع ملی کہ یہ واقعہ صحیح ہے، گو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ خون کی بوندیں کتنی خلاف قدرت طور پر مسجد میں گریں، ہمارے کانپور کے نامہ نگار نہایت معتبر اشخاص ہیں، اس لیے ان کی مرسلہ خبروں کی زیادہ چھان بین بھی غیر ضروری ہے، اگر یہ خبر میرے ساتھی لائے ہوتے تو ممکن ہے کہ میں اسے نہ چھاپتا، اس لیے کہ اس سے بجائے پبلک کی تعلیم کے وہم پرستی کو بھی تقویت ہو سکتی ہے، اس گفتگو کے بعد کوئی ساڑھے گیارہ بجے شب کے مسٹر ڈگلس اسٹریٹ رخصت ہوئے اور سُنا ہے کہ موٹر کے چلتے وقت مجھ سے مخاطب ہو کر کہا، کہ امید ہے کہ اب آپ ممالک متحدہ کی پولیس کو کچھ زیادہ نہیں سمجھتے۔

مسٹر ڈگلس اسٹریٹ کے رخصت ہونے کے بعد سرکار سے چیف سیکرٹری صاحب نے دریافت کیا کہ محمد علی کے متعلق کیا ارشاد ہے فرمایا کہ انھیں تو قلعہ میں رہنے دو، چنانچہ میں چیف سیکرٹری صاحب اور پرائیوٹ سیکرٹری صاحب کے ہمراہ موٹر میں اپنے مکان آیا اور بستر اور چند ضروری چیزیں نوکر کے ساتھ قلعہ بھیج دیں، اور خود موٹر میں اُن دونوں صاحبان کی معیت میں قلعہ پہونچا۔

میرے بھائی کپتان حشمت علی خاں صاحب کپتان اور مجسٹریٹ قلعہ، قلعہ میں سو رہے تھے، ان کو جگوایا گیا، اور میری نظر بندی کے متعلق اطلاع دی گئی، چونکہ سرکار نے فرمایا تھا، کہ میں ملنے سے منع نہیں کرتا، چیف سیکرٹری ہیں، احمد علی خاں ہیں، حشمت علی خاں ہیں، اُن سے ملو، بات چیت کرو، اس لیے چیف سیکرٹری صاحب نے کپتان صاحب قلعہ سے کہا کہ فی الحال مناسب ہے کہ یہی حضرات ملیں، کل سرکار سے زیادہ مفصل احکام اس بارے میں حاصل کر لوں گا، چنانچہ صبح کو جب میرا بھانجہ اور اُس کے بعد میرا ایک بھائی مجھ سے

ملنے قلعہ میں آئے تو کپتان حشمت علی خاں نے معذرت کی، اور فرمایا کہ سرکار کا حکم ابھی حاصل نہیں ہوا ہے، میں یہاں اس امر کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں، کہ پرائیویٹ سیکرٹری صاحب، چیف سیکرٹری صاحب نے میرے آرام و آسائش کے لیے جو کچھ ممکن تھا کر دیا، اور جب تک میں قلعہ میں رہا، مجھے کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ ملا بلکہ میں ہر اس شخص کا شکرگذار ہوں جس کے متعلق میری خورد و نوش یا قیام وغیرہ کا انتظام تھا، میں نے ہندوستانی مہمان خانہ کے اوپر کی منزل میں ایک کمرہ پسند کیا، اور جب تک قلعہ میں رہا وہیں قیام کیا، میں پہلے بھی اس کا اظہار کر چکا ہوں کہ مجھے ۲۰ر کی شب کو بخار آگیا تھا اور ۲۱ر کی سہ پہر سے پھر حرارت ہو گئی تھی، شب کو بخار بڑھ گیا اور باوجود کسل و ماندگی اور نیند پوری نہ ہونے کے میں ساری رات نہ سویا، صبح کو اس خیال سے کہ سرکار شاید قلعہ تشریف لائیں میں نے شب خوابی کے کپڑے اتار کر دن کے پہننے کے کپڑے پہن لیے، سرکار قلعہ تشریف لائے، مگر مہمان خانہ کی طرف تشریف فرما نہ ہوئے، غالباً دس گیارہ بجے مسٹر ڈگلس اسٹریٹ انگریزی مہمان خانہ سے اسٹیشن چلے گئے، مجھے اس وقت حرارت کی شدت ہو گئی تھی، اس لیے شب خوابی کے کپڑے پہن کر لیٹ گیا، حکیم اجمل خاں صاحب کے نسخہ کے مطابق دفع حرارت کے لیے گھر سے دوا منگا کر پی، مگر حرارت کم نہیں ہوئی، برابر بڑھتی رہی، اور میری بے چینی میں اضافہ ہوتا رہا، اس عرصہ میں سُنا کہ ڈاکٹر انصاری صاحب بیگم صاحبہ کے معالجہ کے لیے حسب الطلب سرکار تشریف لائے ہیں، میں نے انھیں بلوایا مگر ۲ بجے تک وہ تشریف نہ لا سکے تو ریاست کے ایک ڈاکٹر کو بلوا بھیجا، اتنے میں ڈاکٹر انصاری صاحب اور اُن کے ہمراہ چیف سیکرٹری صاحب میرے کمرہ میں تشریف لائے، ڈاکٹر صاحب سے معلوم ہوا کہ سرکار سے انھوں نے میرے متعلق گفتگو کی تھی، اور سرکار کو نظربندی کے آئندہ خراب نتائج سے بھی مطلع کیا تھا، ڈاکٹر انصاری صاحب مجھے دیکھ رہے تھے کہ سرکار نے انھیں یاد فرمایا اور وہ تشریف لے گئے۔ اس عرصہ میں چیف سیکرٹری صاحب نے مجھے فرمایا کہ تم بھی سرکار کی خدمت میں حاضر ہو تو مناسب ہے۔

سرکار کا حکم ہے کہ تم اپنے مکان جا سکتے ہو، مگر تا اختتام جنگ رام پور سے باہر نہ جاؤ، نہ کسی سے خط وکتابت کرو، نہ یہاں کسی خاص و عام جلسہ میں پالیٹکس پر گفتگو کرو، میں نے کہا کہ مجھے رات سے سخت حرارت ہے، اس وقت کچھ پسینہ آرہا ہے، اگر میں اس وقت باہر نکلا تو ہوا لگ جانے اور مرض بڑھ جانے کا اندیشہ ہے۔ اس پر انھوں نے فرمایا کہ خیر تم لکھ دو کہ تم ان شرائط کی پابندی کروگے، واضح ہو کہ نہ قلعہ میں اپنی خوشی آیا نہ یہ شرائط مجھے پسند ہیں، دونوں کو حکم سرکار سمجھا، اور جس طرح پہلے حکم پر عامل ہونا اپنا اخلاقی فرض سمجھا، اسی طرح اس نئے حکم پر بھی سمعنا واطعنا کہا، چنانچہ تینوں امور جن کا چیف سیکرٹری صاحب نے ذکر کیا تھا، ایک عرضی کے چھپے ہوئے فارم پر ایک سرکاری محرر نے لکھ دیے اور میں نے دستخط کر دیے، البتہ دو امور کے متعلق میں نے عذر پیش کیا، ایک یہ کہ تا اختتام جنگ میں شہر رام پور سے باہر نہ جاؤں میں نے کہا کہ مجھے اختتام جنگ سے کیا واسطہ، چاہے جنگ کل ختم ہو، چاہے ہزار برس رہے، مجھے سرکار کے حکم سے واسطہ، اس لیے بلا اجازت سرکار باہر نہ جاؤنگا دوسرے یہ کہ خط وکتابت میں ویسے بھی کم کرتا تھا، اور اب تو اور بھی کم خط وکتابت کرنے کی ضرورت پیش آئے گی، لیکن ضرورت ہوگی تو لکھنا پڑے گا البتہ مجھے کچھ عذر نہ ہوگا اگر سرکار ڈاک میں پڑنے سے پیشتر میرے خطوط ملاحظہ فرمالیا کریں، چنانچہ چیف سیکرٹری صاحب نے فرمایا کہ اسی طرح لکھ دو، اور میں نے ان دو امور کے متعلق عرضی میں اسی طرح لکھ دیا، عرضی کی عبارت حسب ذیل ہے۔

غریب پرور سلامت!

جان نثار کو رات سے بخار شدت سے چڑھا ہوا ہے، اور پسینہ آرہا ہے، اس وجہ سے اس وقت حاضری سے معذور ہوں ورنہ خود حاضر ہو کر امور ذیل کے متعلق عرض کرتا۔

۱۔ میں اقرار صالح کرتا ہوں کہ بغیر اجازت سرکار کے شہر رام پور سے باہر نہ جاؤں گا۔

۲۔ میں اس کا بھی اقرار کرتا ہوں کہ کسی سے ریاست کے باہر خط وکتابت نہ کروں گا، اگر کسی کو مجبوری سے کوئی تحریر بھیجنا ہوئی تو اوّل تو وہ تحریر سرکار میں پیش ہو جائے گی، اور اگر سرکار اس کو ناپسند نہ فرمائیں گے تو ارسال کی جائے گی۔

۳۔ میں یہاں پولٹیکل امور کے متعلق خاص یا عام جلسہ میں گفتگو نہ کروں گا، واجب تھا عرض کیا آفتاب دولت واقبال تاباں و درخشاں باد۔

عریفہ جان نثار

محمد علی

مورخہ ۲۲ر اپریل ۱۹۱۵ء

دس بارہ منٹ کے بعد چیف سیکرٹری صاحب واپس آئے اور فرمایا کہ سرکار نے اجازت دی ہے تم گھر جا سکتے ہو، چنانچہ میری علالت کے باعث پالکی منگوائی گئی، اور میں اس میں سوار ہو کر مغرب کے وقت مکان واپس آیا قلعہ میں میں کل آٹھ گھنٹہ رہا، میرے مکان آجانے کے کچھ عرصہ بعد مسٹر شوکت علی نے حسب ذیل تحریر نواب صاحب کی خدمت میں ارسال کی۔

"حضور پر نور دام اقبالہم:

ڈاکٹر انصاری صاحب دہلی تشریف لائے اور مجھے حضور کا محبت آمیز حکم سنایا، حضور کو میں خوب جانتا ہوں، اور حضور مجھ کو بخوبی جانتے ہیں، خدا کا شکر ہے کہ میرے ایمان اور حمیت میں اب پہلے سے اور اضافہ ہو گیا ہے کوئی کمی اور تبدیلی واقع نہیں ہوئی اور جہاں تک میرا گمان ہے، حضور بھی نہیں بدل سکتے ہیں، ہاں

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند

حضور کو ضرور علم ہوگا کہ ہم نے اپنے طرز عمل میں اب تک کوئی فرق نہیں ہونے دیا، ہم دل سے نمک حلال اور وفادار ہیں، جیسے کہ پیشتر تھے، رام پور ہمارا پیارا وطن ہے، اور وہ ہم سے کبھی چھوٹ نہیں سکتا، حضور ہمارے آقا ہیں، اور

کوئی طاقت ہمارے اور حضور کے درمیان تفرقہ نہ ڈالے گی، ہم نے آج تک کوئی کام قانون یا اپنے آقا کے خلاف نہیں کیا، اس کو خدا، خود حضور اور تمام حکام ورعایا، شہر اور باقی دنیا جانتی ہے، اسی وجہ سے ہم کو کبھی رام پور آنے جانے میں نہ ڈر ہوا ہے نہ ہوگا، جس وقت محمد علی کی صحت کا سوال آیا تو سب کے خلاف میری رائے یہ ہوئی کہ وہ آرام سے جاکر دو مہینہ رام پور بیٹھیں اور وہاں اطمینان سے علاج کریں اور اگر بعد کو ضرورت ہو تو شملہ یا منصوری جائیں، اس میں ہر طرح کا فائدہ تھا، ایک تو تمام خاندان اور دوست احباب تیمارداری کریں گے اور دوسرے مصارف کم ہوں گے، مجھ کو اس بات کا ضرور خیال تھا کہ ممکن ہے کہ حکام صوبہ متحدہ جو محمد علی کے درپئے آزار ہیں کوئی ایسی کارروائی کریں، جس سے محمد علی کو حضور کے ذریعہ سے نقصان پہونچے اور ان کا مطلب نکلے، اُن کا کام ہوجائے اور دنیا بھر میں حضور کی بدنامی رہے، میں خوب جانتا ہوں کہ مطعون کرنے میں خود ان افسروں کا بڑا حصہ ہوگا، وہ کہتے کہ باوجود اس کے کہ ہم محمد علی سے سخت ناراض ہیں، ہم کوئی کام خلاف قاعدہ نہیں کرتے دیکھو وہ جن کی محمد علی اور تم لوگ تعریف کرتے ہو، اس طرح کی زبردست اور خلاف قانون کارروائیاں کرتے ہیں، اگر ہم ہندوستان سے چلے گئے تو بجائے انصاف کے اس طرح کے بلکہ اس سے زائد مظالم کیے جائیں گے، مگر مجھ کو یقین کامل تھا، کہ حضور وہی کریں گے، جو حضور نے کیا۔

اگر محمد علی کے خلاف گورنمنٹ کوئی کارروائی کرنا چاہتی ہے تو محمد علی کا مکان اور کارخانہ دارالحکومت دہلی میں موجود ہے، ذرا سی اطلاع پر وہ آج ہی رام پور سے واپس دہلی آجائے گا اور حکام کے ساتھ ہی حاضر ہوکر اپنے مقدمہ کی پیروی کرے گا۔

ہم نے اپنی خدمات، اپنی قابلیتیں، اپنی صحت، اپنی دولت، اور اپنے دوست، اپنی اور اپنی ہر چیز اللہ اور اس کے رسولؐ کے کام کے لیے وقف کردی ہے، اور ہم ایک منٹ کے لیے بھی اپنے بار سے سبکدوش ہونا نہیں

چاہئے، خدا سے بھی دعا ہے کہ وہ ہماری ناچیز خدمات کو قبول کرے اور ہم کو صراطِ مستقیم پر قائم رکھے، ہم گورنمنٹ کے ہرگز ہرگز خلاف نہیں ہیں مگر ہاں ہم اپنے دین کے سچے حامی ہونا چاہتے ہیں، اور اس کے خلاف کسی اور کو جائز نہیں سمجھتے ہیں چاہے ہمارا کیسا ہی نقصان کیوں نہ ہو، ہم روپیہ شہرت آرام کے بھوکے نہیں ہیں، یہ ممکن ہے کہ ہم بہت سی غلطیاں کرتے ہوں، مگر ہماری نیت بخیر ہے، اور ان غلطیوں کی سزا کے لیے ہم ہر وقت تیار رہیں وہ سزائیں، ہمارے تزکیہ اور نجات کا باعث ہوں گی۔

حضور والا کو منصوری اور شملہ کا واقعہ خوب یاد ہوگا، غیر ہمیں اگر سنگسار بھی کرے تو اُس کی چوٹ نہیں لگتی، ہاں اپنے کا پھول مارنا گولی سے زیادہ تکلیف پہونچاتا ہے۔

حضور والا گورنمنٹ کے افسروں کو اس قدر اختیارات اور طاقت ہے اور طاقت ہے کہ محمد علی غریب تو کیا اگر وہ چاہیں تو حضور نظام والئ دکن کو بھی ایک چوکیدار کی معرفت پکڑوا بلوائیں، بعد کا نتیجہ چاہے کچھ ہو۔

حضور والا، رام پور ہمارا وطن ہے، رام پور ہی میں ہم اور ہمارے باپ دادا پیدا ہوئے اور وہیں باپ دادا مرے اور دفن ہوئے رامپور ہی میں مرنے اور دفن ہونے کی ہم کو خواہش ہے، اور رہے گی، جب تک کہ ہم حضور کے مجرم ثابت نہ ہوں، رام پور اور حضور ہمارے ہیں، اور ہم اپنے وطن میں آئیں گے اور جائیں گے، جس دن حضور کا حکم ہوگا۔ مت آؤ ہم بدرجہ مجبوری تعمیل کریں گے، مگر دل وہیں پڑا رہے گا۔

رہی میری اپنی ذات، تو سرکار میرا دل تو وہیں رام پور میں پڑا رہے گا، اگر زندوں سے ملاقات نصیب نہ ہو تو بریلی دروازہ کی ایک سفید قبر سے ملاقات کرنے کے لیے دل تڑپے گا، میں ہر وقت حضور کے حکم کی تعمیل کے لیے حاضر ہوں، مجھے یہاں کی اور چیزوں سے کام نہیں، ہر خدام کعبہ کا کام عقبہ عمر کرنا ہے، میں حلف بھی لے چکا ہوں وہ میں دہلی نہ سہی رام پور بیٹھ کر کر سکتا ہوں، مگر اس وقت محمد علی کے کارخانہ کو

سنبھالنا ضروری ہے[1]۔ کیونکہ ہم سب کا اسی پر گذر ہے، بفضلہ تعالیٰ آمدنی معقول ہے، مگر مصارف اس قدر بڑھا رکھے تھے، الامان! اس پر بدنامی اور لے تو بھی، اس وقت مجھ کو پندرہ ہزار روپیہ کا انتظام کرنا ہے، تاکہ تمام قرضہ کے بل ادا کرسکوں، خدا مددگار ہے، حضور کی اور میری بنے، آقا اور نوکر کے درمیان کبھی کوئی پردہ نہ تھا، ورنہ ہوگا، اپنے دل کا سب حال عرض کردیا، یعنی سوائے حضور کے کسی دوسرے شخص کو دنیوی معاملات میں مربی نہیں بنایا اور اب آخر وقت میں کیا بناؤں گا۔

حضور خفا ہوں یا خوش، سزا دیں یا انعام، ہم حضور ہی کے ہیں اس لیے بس یہی التجا ہے کہ اگر ہماری قسمت میں اسلام کی خدمت کرنے کے صلہ میں پھانسی ہو تو وہ پھانسی غیر کے ہاتھ سے ہماری گردن میں ڈالی جائے کسی عزیز کا مبارک ہاتھ ہمارے خون سے گندہ نہ ہو۔

میں جب رام پور آتا ہوں تو حسب معمول قدیم سلام کو حاضر ہو جاتا ہوں حضور کو اطلاع مل جاتی ہوگی، انشاءاللہ تعالیٰ ۲ مئی ۱۵ء کو ایک دن کے لیے حاضر ہوں گا، میں خوش ہوں اور حضور کے لیے دعا کرتا ہوں، خدا اسلام کا دنیا میں بول بالا کرے، پہلے دیوانہ تھا اب مجنوں ہو گیا ہوں، اقبال پڑھتا ہوں اور مست رہتا ہوں۔"

اس کے بعد ۳ر مئی ۱۹۱۵ء کو مسٹر شوکت علی رام پور تشریف لائے اور سرکار کی خدمت میں تقریباً روز حاضر ہوتے رہے، میرے متعلق بھی چند بار گفتگو ہوئی اور میری علالت کا خیال فرماکر سرکار نے مسٹر شوکت علی کی استدعا کو منظور فرمالیا کہ میں منصوری چلا جاؤں، مسٹر شوکت علی نے یہ بھی استدعا کی تھی کہ چونکہ دس بارہ دن میں مجھے کئی بار بخار آچکا تھا، اس لیے مجھے دہلی جاکر ڈاکٹر انصاری سے مل آنے کی اجازت دی جائے، انہوں نے عرض کیا کہ اس سے ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہوگا کہ سینکڑوں آدمی جو میری نظر بندی کے متعلق ان سے ہزار دل

---

[1] کارخانہ سے مراد کامریڈ، ہمدرد اور ہمدرد پریس ہے۔ نہ کہ کوئی اور کارخانہ

استفسارات کرتے رہتے ہیں وہ خاموش ہوجائیں گے، اور سرکار کی بدنامی نہ ہوگی، خیال سے جو طریقہ اب تک خود انہوں نے اور ہمدرد نے اختیار کر رکھا تھا اُس میں بھی میرا دہلی جانا اور لوگوں سے آزادانہ ملنا ممد و معاون ہوگا، مگر اس کی روانگی کے وقت سرکار نے اس درخواست کا کوئی جواب عطا نہیں فرمایا تھا، ۴ رمئی ۱۹۱۵ء کو میں نے خود ایک عریضہ سرکار کی خدمت میں بھیجا جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

۴ رمئی ۱۹۱۵ء

حضور والا!

مجھے سخت افسوس ہے، کہ میں خاص باغ میں ایک بار سے زاید جب کہ حضوری حاصل کرنے سے محروم رہا تھا، بغرض قدم بوسی حاضر ہوں گا، وجہ یہ ہوئی کہ میں بخار کے پہلے حملہ سے پوری نجات بھی نہ پاسکا تھا کہ دوسرا حملہ ہوا، نتیجہ یہ ہے کہ اب تک چلنے پھرنے میں معذور ہوں، میں شکرگذار ہوں کہ حضور والا نے میری صحت کا خیال فرما کر مجھے منصوری جانے کی اجازت مرحمت فرمائی، پہلے ارادہ یہ تھا کہ ۱۰ ریا ۱۲ رماہ حال تک پہاڑ پر چلا جاؤں، لیکن پندرہ دن کے اندر جو دو حملہ بخار کے ہوچکے ان سے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ شاید ایک سخت فصلی بخار کے جراثیم میرے جسم میں پیدا ہوچکے ہیں، لہذا میری خواہش یہ ہے کہ چند یوم کے لیے دہلی چلا جاؤں، وہاں ڈاکٹر انصاری صاحب سے معائنہ بھی کرالوں اور ضرورت ہو تو ان کا علاج بھی شروع کردوں، امید ہے کہ حضور والا کو اس میں اعتراض نہ ہوگا۔

میں ہوں حضور کا جان نثار و تابعدار خادم

محمد علی

یہ عریضہ چیف سیکرٹری صاحب کے نام کے خط میں ملفوف کرکے چیف سیکرٹری کے پاس ۴ رمئی کی شام کو بھیج دیا گیا تھا، مگر معلوم ہوا کہ ان کو ۵ کی صبح تک موصول نہیں ہوا، اس اثنا میں ۴ رمئی اور ۵ رمئی کے درمیان رات کے گیارہ بجے چیف سیکرٹری صاحب میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ بھائی

ایک عجیب آفت ہے آج ریجنٹ صاحب (کمشنر بریلی) کے پاس سے ایک اطلاع تحریری اس مضمون کی موصول ہوئی ہے کہ گورنمنٹ ہند نے پوچھا تھا کہ محمد علی کے متعلق کیا واقعہ ہے، جس کے جواب میں لوکل گورنمنٹ (سر جیمس مسٹن) نے لکھ دیا ہے کہ دربار رام پور نے انھیں مقید کر دیا ہے، واضح ہو کہ اب تک اس معاملہ میں گورنمنٹ کو ریاست کی طرف سے کوئی تحریر نہیں بھیجی گئی تھی اس لیے بہ ظاہر مسٹر ڈگلس اسٹریٹ ہی لوکل گورنمنٹ کا ذریعہ ہو سکتے ہیں۔ اب چونکہ سر جیمس مسٹن نے ریاست سے دریافت کیے بغیر گورنمنٹ ہند کو یہ لکھ دیا کہ مجھے منصوری نہ جانے دیا جائے اور چونکہ وہ واپس چلے گئے تھے اس لیے حکم ہوا کہ مجھ سے کہہ دیا جائے کہ منصوری نہ جاؤ، مجھے اس زمانہ میں خود بھی حرارت تھی، اور ایک لڑکے کی حرارت رفع ہونے پر دوسرے لڑکے کو شدت سے بخار آ گیا تھا، ۵ رمئی کو میرے لڑکے کا بخار ۱۰۵ ڈگری تک پہونچ گیا تھا۔ اور پھر بھی ڈاکٹر نصیب نہ ہو سکا، میں نے چیف سیکرٹری کو ایک نیل کی تحریر لکھی۔

اشد ضروری

مکرمی!

میں نے آج آپ سے ذکر کیا تھا کہ اپنے منجھلے لڑکے کو بخار میں چھوڑ کر خاص باغ میں آیا ہوں، اس کو کئی گھنٹے ہو چکے تھے، مسلسل ۱۰۳ کی حرارت ہے سہ پہر کو حرارت اور بڑھ کر ۱۰۵ تک جا پہونچی، اس وقت گھر کے آدمیوں نے گھبرا کر ذریعہ ٹیلیفون اس کی اطلاع مجھے کرنا چاہی جس کا علم مجھے اب واپسی پر ہوا ہے، ڈاکٹر عبدالحکیم غریب تو اب یہاں ہے نہیں، لہٰذا باقی ماندہ ڈاکٹروں پر کام کا بار زیادہ پڑ گیا ہے، مجھے اب تک کوئی ڈاکٹر نہیں ملا کہ لڑکے کو دکھا سکوں، بخار ظالم ہے اور حرارت تقریباً ۱۰۴ سے کم نہیں ہوتی، اس عرصہ میں جو بخار کے دو حملے مجھ پر ہوئے، ایک منجھلی لڑکی پر اور منجھلی لڑکی پر، اس نے مجھے سخت پریشان کر دیا ہے، ایسی حالت میں سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے، بچی سفر

کرنے کے قابل جیسے ہی ہو، تو میں رام پور سے چلا جاؤں، براہ کرم سرکار سے میرے اس عریضہ پر حکم حاصل فرمالیجیے جو میں نے کل آپ کے خط کے ساتھ ملفوف کیا ہے، ظاہر ہے کہ اس بار جیسے ہی میں رام پور پہونچا ہوں، نصیب سے رہنا نہیں ہے، اور مجھ سے یہ توقع کرنا نامناسب ہے کہ اس زمانہ سے کہ ناگزیر ہے، میں یہاں زیادہ رہ کر اپنی اور اپنے بچوں کی صحت کو خراب کروں، ازراہِ کرم میرے اس عریضہ کو ضروری سمجھیں۔

اس کے بعد میں نے ڈاکٹر انصاری کو دہلی سے بلایا، مسٹر شوکت علی علی گڑھ تھے، اُن کو اس تازہ واقعہ کی اطلاع دی گئی، چنانچہ ۷ مئی کو دونوں صاحب تشریف لے آئے، ہم لوگ سہ پہر کو سرکار میں حاضر ہوئے، تو معلوم ہوا کہ سرکار نے گورنمنٹ کو میرے متعلق کچھ تحریر فرمایا ہے، اور جواب کے منتظر ہیں، اگر گورنمنٹ کو عذر نہ ہوا تو سرکار کو میرے چلے جانے میں کوئی عذر نہ ہوگا، جہاں تک مجھے علم ہے اب تک کوئی جواب موصول نہیں ہوا ہے، یہ وہ واقعات ہیں، جو اب تک پیش آئے ہیں، اور میں نے ان کا قلمبند کرنا ضروری سمجھا ہے، تاکہ آئندہ میں موجود ہوں، یا نہ ہوں، اصل واقعات ہر شخص کو بآسانی دستیاب ہو سکیں۔

ہمدرد میں جو کچھ میرے متعلق میری غیر حاضری میں چھپا ہے وہ اور مضامین کی طرح نہ میرے ایما سے چھپا ہے، نہ میرے علم میں ہے، اس لیے میں اس کا ذمہ دار نہیں، جو، جو کچھ شائع ہوا ہے، یقیناً میرے کسی خیر طلب کی مصلحت اندیشی پر مبنی ہوگا، اور غالباً اس کی غایت اور غرض سوائے اس کے کچھ نہ ہوگی کہ ایک مسلمان والیٔ ملک جہاں تک ممکن ہو بدنامی سے بچایا جائے اور آج کل کی پریشانیوں میں، ایک ذاتی شورش کا اضافہ نہ ہو۔

حضور کا جان نثار اور تابعدار خادم
محمد علی

اہلِ قلم

(۳۹)

مکرّمی - السّلام علیکم

ہمدرد چار صفحہ کا نکلتا ہے اور یکم جون سے اِن شاء اللہ آٹھ صفحے کا نکلنا شروع ہوگا۔ اب ضرورت ہے کہ میں آپ سے قلمی امداد کے لیے عرض کروں۔ اس سے غالباً آپ کو بھی عذر نہ ہوگا کہ ہمدرد آپ کی امداد کا حاجت مند بھی ہے اور مستحق بھی۔ میں چاہتا ہوں کہ اصل ہمدرد کے ابتدائی پرچوں سے آپ کے مضامین نکلنے شروع ہوجائیں۔ اس لیے اگر بہ واپسی ڈاک مضامین عنایت کریں گے تو اور بھی زیادہ میری مشکوری کا باعث ہوگا۔ والسّلام

نیازمند
محمد علی[1]

---

[1] ۱۹۱۳ء میں ہمدرد نکلنا شروع ہوا تو مولانا محمد علی نے یہ گشتی خط بہت سے اصحابِ علم و اہلِ قلم کو بھیجا تھا اور ان سے قلمی تعاون کی درخواست کی تھی۔

تذکرہ

رجالِ مکتوباتِ رئیس الاحرار

تذکرۂ رجال

مکتوبات رئیس الاحرار

ابراہیم میر سیالکوٹی، مولانا مشہور اہل حدیث عالم دین اپریل ۱۸۷۴ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ حافظ عبدالمنان وزیرآبادی اور مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی کے نامور تلامذہ میں سے تھے۔ سیالکوٹ میں مدرسہ قائم کیا بے شمار طالبانِ علوم دین آپ سے فیض یاب ہوئے۔ خطابت اور مناظرہ کے فنون میں کمال حاصل تھا۔ جریدہ اہلِ حدیث کے اعزازی مدیر بھی رہے، متعدد تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں ذکر و سیرت کی خوبیوں سے نوازا تھا۔ ۱۲ جنوری ۱۹۵۶ء کو انتقال ہوا۔ سیالکوٹ میں دفن ہوئے۔ پاکستان کے مشہور اہل قلم پروفیسر ساجد میر آپ ہی کے خلف سعید ہیں۔

ابن سعود عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن جو ابن سعود کے نام سے مشہور ہوئے ۱۸۸۰ء میں ریاض (نجد) میں پیدا ہوئے۔ ان کے اسلاف ایک مدت سے نجد کے حکمراں چلے آتے تھے۔ لیکن خاندان رشید نے حملہ کرکے نجد پر قبضہ کرلیا۔ اور ان کے خاندان کو مجبوراً نجد سے نکلنا پڑا۔ وہ کویت چلے گئے۔ ۱۹۰۱ء میں صرف دو سو آدمیوں کی مدد سے پایۂ تخت ریاض پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔ وہ اطمینان و سکون کے ساتھ حکومت کرنا چاہتے تھے لیکن خاندان رشید اور دیگر امرا کی حریصانہ نگاہیں نجد پر لگی ہوئی تھیں۔ ۱۹۱۶ء میں شریف حسین کی ترکوں سے بغاوت اور اس کے شاہِ حجاز بننے کے بعد ان کے دشمنوں میں ایک اور حریف کا اضافہ ہوگیا۔ اب سلطان ابن سعود کا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا اپنی موت کو دعوت دینا تھا چنانچہ ۱۹۱۹ء میں انھوں نے شریف حسین کی فوجوں کو شکست فاش دی۔ ۱۹۲۴ء میں انھوں نے حجاز کا رخ کیا اور پہلے طائف پر قبضہ کرلیا۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۲۴ء کو ان کی افواج نے مکہ معظمہ کو اپنی حفاظت میں لے لیا اور ۱۹۲۵ء میں مدینہ منورہ بھی تسلیم ہوگیا ۱۹۲۶ء کے اواخر تک پورے حجاز کو شریف حسین اور امیر علی کے ناپاک وجود و اثرات سے پاک کردیا۔

ابن سعود نہایت جری، بہادر، آزمودہ کار سپاہی، بڑے منتظم، صاحب

بصیرت، علم و ادب کے شائق، حلیم الطبع اور عادل و منصف مزاج شخص تھے۔ مولانا محمد علی جوہر شریف حسین کے مقابلے پر ان کے اقدام کے بڑے مداح تھے لیکن جب انھوں نے حجاز کو شرک و بدعت سے پاک کرنے کی مہم شروع کی اور اہل حجاز نے ان کے ہاتھ پر بیعت اطاعت کی اور رسماً انھیں ملک اور سلطان کہا جانے لگا تو کمال درجے کی مخالفت بھی کی۔ عہد اقدام و زمانۂ ہجوم میں ان کی افواج کے کسی پرجوش کمانڈر اور سپاہیوں سے بے احتیاطیاں ہوئیں لیکن سلطان نے ان کی تلافی کی پوری کوشش کی انھوں نے حجاز اور اہلِ حجاز کو شریف حسین اور امیر علی کے دستِ تظلم سے نجات دلاکر اور اسلامی حکومت قائم کرکے اسلام کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ ابن سعود کا انتقال ۱۹۵۳ء میں ریاض میں ہوا۔

اجمل خاں، حکیم ہندوستان کی بلند پایہ ملّی شخصیت جو ہندوستان میں ہر علمی، تعلیمی، دینی، سیاسی تحریک کی روح رواں رہی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں میں، مسلم لیگ اور کانگریس میں، مجلس خلافت اور جمعیت علمائے ہند میں، دیوبند اور علی گڑھ میں اور ہر طبقے اور ہر مکتبۂ فکر میں یکساں مقبول تھی۔ ترکِ موالات کے زمانے میں سرکاری خطاب "حاذق الملک" ترک کردیا تو قوم نے "مسیح الملک" کے خطاب سے نوازا جو ان کے نام کا جزو بن گیا مولانا عبید اللہ سندھی کے ادارے نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی کے سرپرست تھے۔ طبیہ کانفرنس، ہندوستانی دواخانہ اور طبیہ کالج دہلی سب ان کے خوانِ منت کے ریزہ چیں تھے۔ جامعہ اسلامیہ دہلی کے بانیوں اور سرپرستوں میں سے تھے۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۲۷ء کو دہلی میں انتقال ہوا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ حکیم صاحب کی وفات قوم کا ماتم ہے، فضل و کمال کا ماتم ہے، اخلاق و شرافت کا ماتم ہے، سنجیدگی و متانت کا ماتم ہے، عقل و رزانت کا ماتم ہے، ہندوستان اور مسلمانانِ ہند کے طالع و بخت کا ماتم ہے۔ حکیم صاحب اردو اور فارسی کے بلند پایہ شاعر بھی تھے شیدا تخلص تھا۔ مکتبہ جامعہ دہلی سے "دیوان شیدا" ان کی زندگی ہی میں شائع ہوگیا تھا۔ حکیم اجمل خاں، حکیم محمود خاں کے چھوٹے بیٹے تھے حکیم محمود کا مرثیہ، حالی نے خونِ دل کی سرخی سے لکھا تھا اور ان کے ماتم کو اس عہد کے علم و شرافت اور تہذیب کا ماتم قرار دیا تھا۔

احسان، بھیا مراد احسان الحق بیرسٹرایٹ لارہیں۔ قانون کے ماہر علی گڑھ کے اولڈ بوائے، مولانا محمد علی کے بچپن کے ساتھی اور عزیز دوست تھے۔ کیمبل پور میں جج تھے۔

احسان مراد شیخ احسان الرحمٰن قدوائی، رئیس بڑا گاؤں (ضلع بارہ بنکی اودھ) ہیں۔ مؤلف احوال علمائے فرنگی محل شیخ مولوی الطاف الرحمٰن قدوائی کے بھتیجے تھے۔

احمد سعید خاں ریاست چھتاری کے نواب، جنوری ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے والد کا نام کنور عبدالعلی خاں تھا۔ ملت کی خدمت گزاری میں بھی پیش پیش رہے۔ ان کے مال و ثروت سے دیوبند اور علی گڑھ نے اور مختلف علمی، تعلیمی، تہذیبی اداروں اور اشخاص نے فائدہ اٹھایا۔ یوپی کے ہوم ممبر رہے، گورنر ہوئے۔ ریاست حیدرآباد دکن کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر رہے۔ تحریک پاکستان میں حصّہ لیا۔ "یاد ایام" ان کی خود نوشت شائع ہو چکی ہے۔ بحمد اللہ ابھی تک بقید حیات ہیں اور ہندوستان میں سکونت پذیر ہیں۔

اسماعیل خاں نواب محمد اسماعیل خاں مشہور شاعر نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے پوتے تھے اور نواب محمد اسحاق خاں (سکریٹری علی گڑھ کالج) کے بیٹے تھے ۱۸۸۶ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ محمڈن اسکول اور کالج میں تعلیم پائی۔ کیمبرج سے بی اے کیا اور بیرسٹری کی سند حاصل کی قومی کاموں میں شروع ہی سے حصّہ لیتے تھے۔ جامعہ ملّیہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا اور مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے طلبہ کی ایک کثیر تعداد نے مسلم یونی ورسٹی چھوڑی تو ان کے سر چھپانے کو جگہ نہ تھی نواب صاحب نے پچاس خیمے میرٹھ سے بھیجے جن میں طلبہ نے رہنا شروع کیا۔ دوبار مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر ہوئے۔ آخر میں مسلم لیگ کی تحریک میں شریک ہوئے اور اس میں بڑا نام پایا۔ صوبہ لیگ کے صدر بھی تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے کہ مولانا محمد علی کے خصوصی مخلصین میں تھے۔ گو ان کی سیاست سے مدتوں الگ رہے۔

نواب صاحب شرافت کا پیکر اور ہر دل عزیز شخصیت تھے ان کی مقبولیت کا دائرہ مسلمانوں سے لے کر تمام اہل ملک تک پھیلا ہوا تھا۔ ۲۸ جون ۱۹۵۸ء کو ۷۵ سال کی عمر میں میرٹھ (ہندوستان) میں انتقال فرمایا۔

جی اے مدنی ان کے صاحبزادے اور خاندان کے متعدد دوسرے افراد کراچی (پاکستان) میں مقیم ہیں۔

اسماعیل غزنوی مولانا سیّد محمد اسماعیل غزنوی، مولانا سیّد عبدالواحد غزنوی کے فرزند صالح، مولانا سیّد عبداللہ غزنوی کے پوتے اور مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی کے عم زاد بھائی تھے۔ عالم دین، محدث اور مدرس ہونے کے ساتھ ملی و سیاسی تحریکات میں بھی حصّہ لیا۔ اور اپنے خاندان کے دیگر تمام ناموروں کی طرح پوری زندگی خدمتِ دین و ملّت میں مصروف رہے۔ قید و بند کی آزمائش سے بھی گزرے ۱۹۲۶ء میں موتمر عالم اسلامی مکہ مکرمہ میں شرکت کے لیے جماعت اہل حدیث کا جو وفد حجاز گیا تھا اس میں مولانا اسماعیل اور آپ کے والد ماجد مولانا عبدالواحد غزنوی بھی شریک تھے۔ ایک مدت تک کانگریس میں شریک رہے پھر ۱۹۳۰ء میں اختلاف کی بنا پر اس سے الگ ہو گئے تھے۔

اقبال علامہ سر محمد اقبال فلسفی تھے، مفکّر تھے، مدبّر تھے، قانون دان تھے لیکن ان کی شاعرانہ حیثیت، ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی تھی۔ ان کے مذہبی، سیاسی، تہذیبی، علمی اور فلسفیانہ افکار کا سب سے زیادہ اظہار شاعری ہی میں ہوا ہے۔ بیسویں صدی میں وہ ہندوستان کے سب سے بڑے اردو اور فارسی کے شاعر تھے۔ حکومت پاکستان کی کمیٹی کے فیصلے کے مطابق ۹ نومبر ۱۸۷۷ء اور بعض اہل علم اور اہل خاندان کی رائے کے مطابق ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء ان کی تاریخ پیدائش ہے۔ مولد و منشار طفولیت اور معہد علمی سیالکوٹ تھا۔ انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد لاہور آگئے اور گورنمنٹ کالج سے ۱۸۹۹ء میں ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ چند سال اورینٹل کالج، اسلامیہ کالج، اور پھر گورنمنٹ کالج میں پڑھایا۔ ۱۹۰۵ء میں وہ مزید تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے اور ۱۹۰۸ء میں وطن لوٹے تو قانون میں بیرسٹرایٹ لار، اور فلسفہ میں ڈاکٹر تھے۔

بنیادی طور پر علامہ اقبال ایک علمی و تہذیبی شخصیت تھے۔ شاعری ان کا خاص میدان تھا۔ ان کے ذہنی و فکری کمالات کا سب سے شاندار اظہار شاعری میں ہوا ہے لیکن قانون، سیاست، تعلیم وغیرہ کے مختلف میدانوں میں بھی ان کے افکار سے فائدہ اٹھایا گیا۔ ۱۹۳۰ء کا ان کا الہ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ جلسے کا خطبۂ صدارت تاریخی اہمیت رکھتا ہے جو تحریک پاکستان کی بنیاد بنا اور اسی بنا پر انھیں مصوّر پاکستان

کے معزز لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ۲۱ ؍اپریل ۱۹۳۸ء کو لاہور میں آپ کا انتقال ہوا اور بادشاہی مسجد کے صدر دروازے کے پاس دفن ہوئے۔ محمد علی سے اقبال کے دوستانہ تعلقات تھے۔ محمد علی نے ہمدرد جاری کیا تو انھیں منظوم پیغام بھیجا۔ اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی شائع ہوئیں تو انھیں تحفہ پیش کیں۔ ۱۹۱۹ء میں رہا ہو کر کانگریس اور مسلم لیگ کے جلسوں میں شرکت کے لیے امرتسر پہنچے۔ تو اقبال نے ان کی خدمت میں ایک شاندار قطعہ پیش کیا اور جب محمد علی کا انتقال ہوا تو انھیں شاندار خراجِ عقیدت پیش کیا۔

یک نفس جانِ نزار را دتپید اندر فرنگ
تا مژہ برہم زنیم از ماہ و پرویں درگزشت
اے خوشا مشتِ غبار او کہ در جذبِ حرم
از کنارِ اندلس وا ز ساحلِ بربر گزشت
خاکِ قدس او را بآغوشِ تمنا در گرفت
سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت

مولانا محمد علی کے خیالات بھی حضرت علامہ کی شاعری کے بارے میں بہت بلند تھے۔ کامریڈ اور ہمدرد کے صفحات کو کلام اقبال سے مزین کیا۔ تقاریر و خطبات میں ان کے کلام کو جھوم جھوم کر پڑھتے۔ جامعہ ملیہ میں لیکچرز کے دوران میں ان کے اشعار کو کثرت سے پیش کرتے، ان کے افکار کی توضیح و تشریح کرتے یہاں تک کہ بعض اوقات بولتے بولتے ان کا گلا بیٹھ جاتا اور کبھی کبھی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں ہو جاتا۔ انھوں نے اقبال کے بارے میں لکھا کہ بہ حیثیت شاعر اقبال بیسویں صدی کے ہند میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کے علمبردار تھے اور اسلامی ہند اس پنجابی گوشہ نشین اور شرمیلے بیرسٹر سے زیادہ کسی اور کا ممنون نہیں ..... یہ فلسفی شاعر اپنے انوکھے انداز میں اسلام کے ان ہی بنیادی حقائق کو پیش کرتا ہے جن کا خود میں نے بہ تمام مشکل ادراک کیا ہے۔ محمد علی اقبال کو مولانا روم کی تعلیمات کا متمم سمجھتے تھے۔ علامہ کے کلام کی خوبیوں اور افکار اسلامی کی دلربائی نے ان کے قلب کو مسخر کر لیا تھا۔ اس کے باوجود کہ مولانا جانتے تھے کہ اقبال عملی آدمی نہیں ہیں۔ وہ ایک مفکر، فلسفی اور شاعر ہیں اور گوشہ نشین اور شرمیلے بیرسٹر لیکن وہ چاہتے تھے کہ علامہ اقبال عملی میدان میں بھی نکلیں اور تحریک آزادی میں ان

کے شانہ بہ شانہ ملک کی رہنمائی کریں لیکن علامہ اقبال نے خلافت اور ترک موالات کی تحریکات میں ان کا ساتھ نہیں دیا اس لیے محمد علی ان کو اقبال مرحوم کہنے لگے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ کاش ہمارا اقبال، اسلام کی صراط مستقیم دکھانے والا اقبال بھی ہماری طرح جیل میں ہوتا۔ ۱۹۲۷ء میں علامہ مرحوم نے پنجاب کونسل کی ایک تقریر میں کہا کہ "میں ہندو مسلم آفیسران کی بجائے انگریز افیسران کا خیر مقدم کروں گا"۔ یہ بیان محمد علی کے سمند جذبات کو ایک اور تازیانہ ہوا۔ انھوں نے اس رائے سے سخت اختلاف کیا اور ہمدرد میں متعدد مقالات لکھے اور جب سائمن کمیشن کے مقاطعہ میں بھی علامہ کا فیصلہ مولانا کے جوش و جذبات کے خلاف ہوا تو انھوں نے علامہ مرحوم کو پنجاب کے کسی مقام پر بھی مسلمانوں کے جلسۂ عام میں تقریر و مناظرہ کا چیلنج دیا۔ اس طرح ملت اسلامیہ کے دونوں عظیم فرزندوں کے تعلقات کئی نشیب و فراز سے گزرے تھے

اکبر الہ آبادی اکبر حسین نام، لسان العصر خطاب قوم نے اور خان بہادر کا خطاب انگریزی حکومت نے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں دیا۔ ۱۶ر نومبر ۱۸۴۶ء میں بارہ ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ کھاتے پیتے گھرانے کے ایک فرد تھے۔ ۱۸۶۶ء میں مختاری کا امتحان پاس کیا۔ کچھ دنوں بعد نائب تحصیل دار اور آخر میں سب جج ہو گئے تھے۔ اردو کے سب سے بڑے طنز گو اور مزاح نگار شاعر تھے۔ اسلامی تہذیب کے وہ بہت بڑے داعی اور اسلامی خیالات و افکار کے ترجمان تھے۔ وہ سرسید کی تحریک کے دور ردعمل کے شاعر نہ تھے بلکہ ایک مستقل فکر کے حامل اور اسلام کے دور نشئۃ ثانیہ کے شاعر تھے۔ ایک محمد علی کیا اس دور کے تمام اکابران سے عقیدت اور ارادت رکھتے تھے۔ ۹ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو الہ آباد میں انتقال ہوا

الطاف شیخ الطاف الرحمٰن قدوائی رئیس بڑا گاؤں (ضلع بارہ بنکی، اودھ) کی طرف اشارہ ہے۔ شیخ صاحب ۱۳۰۷ھ / ۱۸۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ درسیات کی تکمیل مدرسہ فرنگی محل میں مولانا محمد عبد الباقی اور مولانا عبد الباری کی خدمت میں کی۔ سلطان عبد العزیز ابن سعود کی تحریک اصلاح کے خلاف بہت سرگرم عمل رہے۔ اور متعدد مضامین و رسائل سے تحریک تطہیر حجاز کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ مولانا عبد الماجد دریا بادی نے لکھا ہے کہ "مولانا عبد الباری فرنگی محل کے رفیق خصوصی تھے۔ اس "حمایت باطل" میں پیش پیش تھے"۔ متعدد تصانیف ان کی یادگار ہیں۔ تاریخ علمائے فرنگی محل، احوال علمائے فرنگی محل اور ان کی تفسیر "الطاف الرحمٰن"

خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

امان اللہ خاں امیر حبیب اللہ خاں کے بیٹے تھے۔ یکم جون ۱۸۹۲ء کو پیدا ہوئے والد کے قتل کے بعد ان کے چچا سردار نصر اللہ خاں نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ لیکن چند دن کی کش مکش کے بعد امان اللہ خاں نے ان پر قابو پا لیا اور یکم مارچ ۱۹۱۹ء کو تخت نشین ہوتے ہی افغانستان کے استقلال کا اعلان کر دیا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ بعد برطانوی ہند کی شمالی مغربی سرحد پر حملہ کر دیا۔ اس حملے میں ہندوستان کے مسلمان انقلابیوں نے جو اس زمانے میں افغانستان میں موجود تھے، بڑی مدد کی۔ اس کش مکش میں پہلے روس نے اور پھر برطانوی حکومت نے بھی افغانستان کی آزادی کو تسلیم کر لیا۔ امان اللہ خاں افغانستان کی تعلیم، صنعت، تجارت میں جس ترقی کے خواہاں تھے۔ عوام تعلیم کی کمی اور قدامت پسندی کی بنا پر پسند نہیں کرتے تھے۔ اور ملک میں ایک بے چینی پیدا ہو رہی تھی۔ انگریزوں کے لیے امان اللہ خاں سے بدلہ لینے کا یہ اچھا موقع تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء میں ان کے خلاف انگریزوں کی ریشہ دوانیوں نے اپنا کام کر دیا اور ایک تاجیک ڈاکو حبیب اللہ (بچہ سقّا) کے ذریعہ شورش پیدا کر دی۔ پانچ چھ ماہ کی کش مکش کے بعد امان اللہ خاں حالات پر قابو پانے میں ناکام ہو گئے اور مجبور ہو کر انھیں تخت چھوڑ دینا پڑا۔ وہ چمن کے راستے ہندوستان آئے اور یہاں سے بلا تاخیر اٹلی چلے گئے۔ اور وہیں سوئٹزرلینڈ میں ۲۵ اپریل ۱۹۶۰ء کو انتقال کیا۔

امجدی مولانا محمد علی کی اہلیہ محترمہ مولانا محمد علی کے چچا زاد بھائی عظمت علی خاں کی صاحبزادی تھیں، پڑھی لکھی تھیں۔ حج کی سعادت بھی حاصل ہوئی تھی تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات کے زمانے میں عورتوں میں انھوں نے بڑا کام کیا۔ ان کے سلیقہ و کارکردگی کا اعتراف خود مولانا محمد علی نے کیا ہے۔ مولانا کے آخری سفر لندن میں ساتھ تھیں۔ انھوں نے اپنی بیٹی زہرہ کو جو خطوط لکھے تھے ان سے مولانا محمد علی کے سفر لندن خصوصاً آخری ایام اور مرض الموت کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔

اندرا پورا نام اندرا پریہ درشنی تھا گھر میں پیار کا نام اندو تھا مولانا محمد علی نے یہی پیار کا نام لکھا ہے۔ لیکن دنیا میں اندرا گاندھی کے نام سے شہرت حاصل۔ ۱۹۱۲ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئیں۔ یورپ میں تعلیم حاصل کی۔

بچپن ہی سے انھیں ایک ایسا ماحول ملا جس میں مرد تو مرد گھر کی خواتین بھی سیاسی کارکن تھیں او راحتجاجوں، جلسوں، جلوسوں میں حصّہ لیتی تھیں۔ ان خواتین میں ان کی دادی، ماں، پھوپھیاں وغیرہ شامل تھیں۔ اس لیے ملک کی سیاست کو نہ صرف بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا بلکہ اس میں حصّہ بھی لیا۔ آزاد ہندوستان میں ان کی اہمیت رفتہ رفتہ بہت بڑھ گئی یہاں تک کہ ۱۹۶۶ء میں لال بہادر شاستری وزیر اعظم کے انتقال کے بعد ہندوستان کی وزیر اعظم بنیں اور ۱۹۷۷ء کے انتخاب میں کانگریس کے شکست کھا جانے کے بعد انھیں یہ منصب چھوڑنا پڑا۔ لیکن سیاست سے اب بھی ان کا تعلق ہے اور ہندوستان کی ایک اہم سیاسی شخصیت ہیں۔

انصاری، ڈاکٹر

ان کا نام مختار احمد تھا لیکن ڈاکٹر انصاری کے عرف سے مشہور تھے۔ شمالی ہند (یو پی) کے مشہور ضلع غازی پور کے ایک ممتاز قصبہ یوسف پور کے ایک نہایت معزز خاندان کے رکن تھے۔ ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک ماہر سرجن، ممتاز فزیشن، بلند پایہ قومی رہنما اور مدبّر تھے قومی خدمت گزاریوں کا آغاز ۱۹۱۲ء میں طبی مشن ترکی لے جانے سے ہوا۔ پھر وہ قومی اور ملی تحریکات میں آگے بڑھتے اور ممتاز سے ممتاز تر ہوتے چلے گئے۔ ۱۹۲۱ء میں انھیں مسلم لیگ کے ناگپور سیشن کا، ۱۹۲۳ء میں خلافت کمیٹی کے گیا سیشن کا۔ اور ۱۹۲۷ء میں کانگریس کے سالانہ اجلاس مدراس کا صدر مقرر کیا گیا۔ تحریک سول نافرمانی میں وہ کانگریس کے ڈکٹیٹر مقرر ہوئے۔ متعدد بار گرفتاری اور قید و بند کا مرحلہ بھی پیش آیا۔ سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں "خلافت، کانگریس اور ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں میں انھوں نے وہ کچھ کیا جو ہندوستان کے کسی مسلمان نے نہیں کیا۔"

ڈاکٹر انصاری حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی سے بیعت تھے انھوں نے ملی تحریکات اور تحریک کے کارکنوں اور رہنماؤں کی امداد میں لاکھوں روپے صرف کیے۔ اور شاید ہی کوئی ایسا رہنما اور اس دور کا کوئی قومی خدمت گزار ہو جس نے ان کے ایثار سے فائدہ نہ اٹھایا ہو، اور کوئی قومی و ملی ادارہ ایسا نہیں ہو سکتا جس کی ترقی و استحکام میں ان کا روپیہ صرف نہ ہوا ہو۔ بقول سید سلیمان ندوی کے وہ فیاضی کا مجسمہ، لطف و محبّت کا پیکر، حسن و اخلاق کا فرشتہ، اور صداقت اور راست بازی کا پہاڑ تھے۔ ان کا گھر مہمانوں کے لیے، ان کی جان

دوستوں کے لیے اور ان کا مال ضرورت مندوں کے لیے وقف تھا“

مئی ۱۹۳۶ء میں کسی کے علاج کے لیے ڈیرہ دون تشریف لے گئے تھے۔ ۱۰ مئی کو وہاں سے لوٹتے ہوئے ریل کے ڈبے میں اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ نعش کو دہلی لایا گیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں دفن ہوئے۔

مولانا محمد علی سے ان کے رشتہ و تعلق کے اظہار کے لیے مولانا سید سلیمان ندوی کا یہ جملہ کفایت کرتا ہے: ”طرابلس اور بلقان کے ہنگاموں نے ہمارے چند جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو سوتے سے بیدار کر دیا تھا۔ محمد علی مرحوم اس قافلے کے رہبر اور ڈاکٹر انصاری اس قافلے کے سب سے پر جوش رہرو تھے۔“

ایٹلی، میجر پورا نام کلیمنٹ رچرڈ ایٹلی تھا۔ ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوئے۔ ہیلی بری نیز یونی ورسٹی کالج آکسفورڈ میں تعلیم پائی۔ ۱۹۰۵ء میں قانون کا پیشہ اختیار کیا۔ ۱۹۱۳ء میں وہ لندن اسکول آف اکنومکس میں لکچرار مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۴ء میں انھوں نے اپنی خدمات فوج کے سپرد کر دیں جہاں وہ ترقی کر کے میجر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد وہ لیبر پارٹی میں شامل ہو گئے، ۱۹۲۲ء میں اس کے ٹکٹ پر پہلی بار برٹش پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوئے۔ اور اس کے بعد ۱۹۵۰ء تک وہ متعدد بار پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوئے کبھی حزب اختلاف کے رہنما کی حیثیت سے کام کیا اور کبھی کابینہ کے رکن کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ۱۹۴۵ء اور ۱۹۵۰ء میں وہ دو بار انگلستان کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ اور انگلستان کی قدامت پسند حکومت کے دور میں وہ ہمیشہ ہندوستان کی حمایت کرتے رہے۔

ایّر، رنگا مولانا محمد علی اپنے مشہور مضمون ”چوائس آف دی ٹرکس“ کے سلسلے میں لکھتے ہیں: ”میں نے یہ مضمون چالیس گھنٹے کی لگاتار محنت شاقہ برداشت کر کے لکھا اور اس تمام عرصے میں ایک منٹ بھی نہ سویا اور جب خود لکھتے لکھتے تھک جاتا تھا تو اخبار کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کو خود بولتا جاتا تھا اور ان سے لکھواتا تھا۔“

سیّد محفوظ علی لکھتے ہیں: ”محمد علی کے مدراسی زود نویس (اسٹینوگرافر) مسٹر ایّر نے راجہ غلام حسین مرحوم سب ایڈیٹر کامریڈ سے چپکے سے کہہ دیا کہ محمد علی صاحب ایک نہایت سخت اور تلخ مضمون لکھا رہے ہیں۔“ رنگا ایّر کے نام خط کے ابتدائی جملوں سے محمد علی کی صحبت و معیت کا بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ ان تمام تحریروں سے ہمیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ رنگا ایّر مدراس کے رہنے والے تھے۔ محمد علی سے تعلق کی بنا اسٹینو گرافی

تھی لیکن وہ کامریڈ میں بھی کام کرتے تھے ۔ اسی لیے انھیں اسسٹنٹ ایڈیٹر لکھا ہے ۔ ۱۹۱۵ء تک محمد علی کی نظربندی تک ان کے ساتھ رہے ۔ پھر الہ آباد چلے گئے تھے

آزاد، مولانا ابوالکلام

مولانا غلام رسول مہر کے نام محمد علی کے خط میں "جناب صدر" "تمھارے صدر صاحب" وغیرہ جملے آئے ہیں ۔ ان سے اشارہ مولانا آزاد کی طرف ہے جو اس زمانے میں جمعیۃ خلافت کے صدر تھے ۔ مولانا آزاد ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ/اگست ۱۸۸۸ء میں مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم مکہ معظمہ کے اساتذہ سے حاصل کی ۔ تقریباً دس سال کی عمر میں اپنے والد مولوی خیر الدین کے ہمراہ ہندوستان آئے اور کلکتہ میں قیام کیا اور تعلیم کے اعلیٰ مراحل والد کی نگرانی میں گھر پر طے کیے ۔ کبھی کسی اسکول یا مدرسہ میں نہیں گئے ۔ دس بارہ برس کی عمر سے شعرگوئی اور نثر نویسی کا آغاز کیا ۱۹۰۳ء میں لسان الصدق (کلکتہ) کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا ۔ خدنگ نظر (لکھنؤ) کے حصہ نثر کے اور الندوہ (لکھنؤ) کے نائب مدیر رہے ۔ وکیل (امرتسر) کے ایڈیٹر مقرر ہوئے ۔ ۱۹۱۲ء میں اپنا ہفت روزہ الہلال کلکتہ سے جاری کیا ۔ تحریک اتحاد اسلامی، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، تحریک ہجرت، تحریک جہاد، تحریک نظم جماعت، تحریک تطہیر حجاز، تحریک سول نافرمانی، ہندوستان چھوڑدو تحریک کے رہنماؤں میں سے تھے ۔ تحریک ریشمی رومال میں شامل تھے ۔ ۱۹۲۱ء تک ان کا تعلق بنگال کے انقلاب (یا دہشت) پسندوں سے رہا ۔ ۱۹۲۳ء میں انھیں پہلی بار کانگریس کے خصوصی اجلاس دہلی کا صدر مقرر کیا گیا ۔ پھر ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۱ء میں وہ کانگریس کے صدر مقرر ہوئے ۔ ۱۹۴۵ء میں کیبنٹ مشن سے کانگریس کے صدر کی حیثیت سے انھی نے گفتگو کی تھی ۔ ۱۹۲۹ء میں مسلم نیشنلسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آیا تو اس کے صدر بھی مولانا آزاد ہی مقرر کیے گئے ۔ مولانا آزاد ایک عالم دین، مفسر قرآن، صاحب طرز انشا پرداز، شعلہ بیان خطیب، جنگ آزادی کے میر کارواں کی حیثیت سے تعارف کے محتاج نہیں ۔ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم تھے ۔ ۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء کو دہلی میں انتقال ہوا ۔ جامع مسجد دہلی کے سامنے اردو پارک میں سنگ مرمر کا چھوٹا سا خوبصورت مزار ہے ۔

ترجمان القرآن (چہار جلد سورۂ نور تک) تذکرہ (حصہ اول) غبار خاطر، انڈیا ونس فریڈم آپ کی مشہور تصانیف ہیں ۔ آپ کے مضامین، مقالات، خطبات و

تقاریر اور خطوط کے متعدد مجموعے ہندوستان، پاکستان سے چھپ کر شائع و مقبول ہو چکے ہیں۔

مولانا محمد علی اور مولانا آزاد میں تعلقات بھی تھے اور اعتراف بھی موجود ہے مولانا آزاد نے انہی کے نام ایک خط میں لکھا کہ "خدا نے آپ کے اندر ایک کامیاب اخبار نویس سے زیادہ طاقتیں رکھی ہیں۔ ظلم ہے اگر آپ اپنی قوتوں سے کام نہ لیں ..... مسلمانوں کی نئی سیاسی زندگی کی تشکیل کے لیے ..... آپ سے زیادہ کوئی شخص موزوں نہیں"۔

۱۹۲۱ء میں مولانا محمد علی گرفتار ہوئے تو مولانا آزاد نے پیام کلکتہ کے صفحہ اوّل پر ایک مضمون شائع کیا اس میں مولانا نے فرمایا۔

> "اٹھارہ مہینے ہوئے جب محمد علی شوکت علی نے نظر بندی سے رہا ہونے کے بعد راہ حق و حریت میں ایک دوسرا سفر شروع کیا تھا۔ آج اعلان کیا گیا ہے کہ یہ سفر ختم ہو گیا اور مسافر منزل مقصود پر پہنچ گئے۔

مولانا آزاد نے اور بھی کئی مضامین میں مولانا محمد علی کی بے پناہ شخصیت، ان کے جوش جذبات و قوت عمل اور ان کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ مولانا محمد علی کا لندن میں انتقال ہوا تو مولانا آزاد گونڈہ جیل میں قید تھے اس لیے کوئی تعزیتی بیان نہیں دے سکے۔

مولانا محمد علی نے مولانا ابوالکلام آزاد کو ایک موقع پر "ابوالسکوت" کا خطاب دیا تھا۔ اس ایک واقعہ میں دونوں کی سیرت کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ محمد علی کا ہر معاملے میں بے چین ہو جانا اور ان کا اپنی زبان اور اپنے قلم پر قابو نہ رہنا۔ اور ابوالکلام کا ہر معاملے میں صبر و ضبط اور فکر و تدبّر۔

آغا خاں

سر آغا خاں فرقہ اسماعیلیہ کے اڑتالیسویں امام جو آغا خاں سوم کے عرف سے مشہور ہیں ۲ نومبر ۱۸۷۷ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ ان کا شمار مسلم لیگ کے بانیوں میں ہوتا ہے ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۲ء تک اس کے صدر رہے —— ۱۹۳۷ء میں انھیں لیگ آف نیشنز کی جنرل اسمبلی کا صدر منتخب کیا گیا۔ حکومت برطانیہ، ایران، شام، انڈونیشیا وغیرہ نے انھیں معزز خطابات سے نوازا۔ انھوں نے اپنے انداز سے ہندوستان کے مسلمانوں کی بڑی خدمت کی۔ ۱۹۱۲ء میں انھوں نے ترکی

کے مسئلے کے تصفیے کے لیے تجویز پیش کی کہ مسلمان یورپی ترکی کو چھوڑ کر ایشیائی ترکی میں چلے جائیں۔ علامہ شبلی نعمانی نے ایک نظم میں اس پر نہایت دلچسپ تبصرہ کیا ہے۔ اس سے آغا خاں کے اندازِ فکر و سیاست کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔
سر آغا خاں ۱۱ جولائی ۱۹۵۷ء کو سوئٹزرلینڈ میں وارسلے کے مقام پر فوت ہوئے۔ اور اسوان (مصر) میں دفن ہوئے۔ مولانا شوکت علی ۱۱-۱۹۱۰ء میں ایک عرصہ تک آغا خاں کے پرائیویٹ سکریٹری رہے تھے۔ مولانا محمد علی سے بھی ان کے تعلقات تھے۔

آمنہ مولانا محمد علی کی منجھلی بیٹی جنھیں وہ پیار میں منا کہا کرتے تھے۔ ان کی شادی محمود اللہ کے ساتھ ہوئی تھی۔ ۱۱ مارچ ۱۹۲۴ء کو علی گڑھ میں انتقال ہوا۔ وہیں مدفون ہیں۔ منا کی بیماری پر محمد علی نے ایک نہایت پرسوز نظم لکھی تھی۔

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں
امتحاں سخت سہی پر دلِ مومن وہ کیا
جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں
ہم کو تقدیرِ الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلہ
اہلِ تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں
تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں
تیری قدرت سے خدایا تیری رحمت نہیں کم
آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں

مولانا نے مذکورہ بالا اشعار میں سے چوتھے شعر میں "مطلوب ہے" کی بجائے "مطلوب تھی" لکھ کر لوحِ مزار پر کندہ کرایا تھا۔

باپو مراد موہن داس کرم چند گاندھی ہیں جو عام طور پر مہاتما گاندھی کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ ۲ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو جنوبی ہند میں پوربندر نامی ریاست میں پیدا ہوئے۔ راج کوٹ میں تعلیم حاصل کی پھر انگلستان گئے اور بیرسٹری کی سند حاصل کی۔ بمبئی میں اور پھر جنوبی افریقہ میں وکالت شروع کی۔ ان کی سیاسی زندگی کا آغاز بھی وہیں سے ہوا۔ ہندوستان واپس آئے۔ کانگریس کی تحریک آزادی میں شریک و معاون ہوئے۔ ترکِ موالات کی تحریک کے بانیوں میں سے تھے۔ خلافت کی تحریک میں مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ علی برادران نے ان سے بے پناہ محبت کی اور ان سے شدید اختلاف کیا۔ انھیں آل انڈیا لیڈر بنانے میں علی برادران کا بڑا حصہ تھا۔ اور مسلمانوں میں ان سے نفرت اور بے اعتمادی پیدا کرنے میں بھی علی برادران نے سب سے زیادہ کام کیا۔ لیکن انھوں نے سیاست میں ایک خاص انداز اختیار کر لیا تھا۔ اسی پر

زندگی بھر چلتے رہے۔ اس کا اندازہ کچھ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ گاندھی اروِن معاہدہ کی ایک دفعہ سے پنڈت جواہرلال نہرو کو شدید اختلاف تھا۔ اور اس کا انھوں نے اظہار بھی کر دیا۔ گاندھی جی انھیں نہ مخالف رکھنا چاہتے تھے نہ ناراض چھوڑ دینا انھیں پسند تھا۔ اس لیے انھیں اپنا ہم خیال بنانے کی پوری کوشش کی۔ اسی سلسلہ بیان میں پنڈت جی لکھتے ہیں۔

"میں نے ان سے کہا کہ معاہدے کی اچھائی برائی ایک طرف میں تو آپ کی اس عادت سے ڈرتا ہوں کہ آپ اچانک کوئی نئی بات کرکے ہمیں چکر میں ڈال دیتے ہیں، آپ کی سیرت میں کوئی نامعلوم چیز ہے جسے چودہ برس کے گہرے تعلقات کے باوجود میں آج تک نہیں سمجھ سکا اور جس سے مجھے بہت اندیشہ ہے۔ انھوں نے اس نامعلوم عنصر کے وجود کا اعتراف کیا اور کہا کہ میں خود پہلے سے اندازہ نہیں کرسکتا کہ یہ کیا کر گزرے گا اور اس کا کیا نتیجہ ہوگا"

ہندو مسلم اتحاد کی تحریک کے وہ سب سے بڑے داعی تھے۔ تقسیم ملک کے بعد بنگال، بہار اور دہلی میں فسادات کو روکنے کے لیے انھوں نے سب سے زیادہ مؤثر کردار ادا کیا۔ پرجوش ہندوؤں کی روش سے خوش نہ تھے۔ ان پر کئی مرتبہ قاتلانہ حملے کیے جاچکے تھے اور وہ ہر بار بچ گئے تھے لیکن ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو دہلی میں ناتھورام گوڈسے نامی ایک پرجوش ہندو نے انھیں گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

بدرالدین طیب جی مشہور مدبّر اور ماہر قانون ۸ راکتوبر ۱۸۴۴ء کو بمبئی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد طیب تھا جو عرب سے تجارت کی وجہ سے بمبئی میں آکر آباد ہوگئے تھے۔ فارسی اردو کی ابتدائی تعلیم کے بعد الفنسٹن اسکول بمبئی میں انگریزی تعلیم پائی۔ پھر لندن میں جاکر تحصیل علمی میں مصروف رہے۔ ۱۸۶۷ء میں دوسری بار لندن گئے اور بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ واپس آکر پریکٹس شروع کی، کاروبار بھی کرتے رہے، سیاست میں بھی حصّہ لیتے رہے۔ کونسل کے ممبر مقرر ہوئے ۱۸۸۷ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے صدر مقرر ہوئے۔ ۱۸۹۵ء میں ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ مسلمانوں کی تعلیمی، سماجی، ثقافتی سرگرمیوں میں حصّہ لیا۔ انجمن اسلام بمبئی کے سکریٹری اور صدر کی حیثیت سے مسلمانانِ بمبئی میں تعلیم کے فروغ کی تحریک میں زبردست حصّہ لیا ۱۹۰۳ء میں

ایجوکیشنل کانفرنس بمبئی کے صدر مقرر ہوئے۔ جسٹس بدر الدین اپنی قانونی مہارت تدبر، حسن تقریر اور اعلیٰ کیریکٹر کی بنا پر بیسویں صدی کے مسلمان زعما میں ایک نمایاں شخصیت تھے۔ ۱۹ر اگست ۱۹۰۶ء کو لندن میں انتقال ہوا۔

برنارڈ شا، جارج دنیائے ادب کا مشہور ڈرامہ نگار، نقاد اور انگلش ایڈیٹر جو آئرلینڈ کا رہنے والا تھا ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوا اور ۲ر نومبر ۱۹۵۰ء کو ایٹ سینٹ لارنس، انگلینڈ میں انتقال ہوا۔ مولانا محمد علی سے دوستانہ علاقہ تھا اور ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ ۱۹۳۰ء میں جب مولانا گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے تو وہ مولانا سے ملنے ان کے ہوٹل میں آئے تھے۔ مولانا محمد علی کے انتقال پر مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ایک خط میں انھوں نے اپنے ان تاثرات کا اظہار کیا کہ محمد علی کے انتقال سے میں نے محسوس کیا کہ اسلام کا ایک بڑا زبردست اور پر جوش خادم اٹھ گیا۔ برنارڈ شا کا انتقال ۱۹۵۰ء میں ہوا۔

بہجت وہبی، ڈاکٹر محمد علی کے ایک ترک دوست اور عقیدت مند۔ پیرس میں مولانا محمد علی جب شدید علیل ہوگئے تو بہجت نے ان کی بڑی خدمت کی۔ اس کا اعتراف خود محمد علی نے اپنے خط میں کیا ہے۔ عبداللطیف اعظمی نے لکھا ہے کہ وہ ترکی کی ایک اہم شخصیت تھے۔ انجمن اتحاد ترقی (ترکی) کے رکن تھے۔ انجمن کی کامیابی کے بعد جولائی ۱۹۲۲ء میں رؤف بے نے جو کابینہ بنائی تھی اس میں وزارت تعلیم کا قلم دان ان ہی بہجت وہبی کے سپرد ہوا تھا۔ مگر بعد میں مصطفیٰ کمال سے اختلاف کی وجہ سے ترک وطن کرکے پیرس میں مقیم ہوگئے تھے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے رفیق درس رہ چکے تھے ۱۹۳۴ء میں وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی دعوت پر توسیعی لیکچرز کے سلسلے میں ہندوستان بھی آئے تھے۔

بی اماں علی برادران کی عظیم ماں، عبدالعلی کی اہلیہ، آبادی بانو نام تھا لیکن ان کی شہرت بی اماں کے پُر محبت نام سے ہوئی کیا ہندو کیا مسلمان، اور کیا عوام اور کیا خواص، سب کی زبان پر یہی دو لفظ تھے۔ ۱۸۵۱ء میں امروہہ (ضلع مرادآباد) میں پیدا ہوئیں۔ ۲۷ برس کی عمر میں بیوہ ہوگئیں۔ انھوں نے اپنی اولاد کی پرورش اور تعلیم و تربیت اس طرح فرمائی کہ ان کا یہ حسن ادائے فرض تاریخ تعلیم و تربیت کا ایک کارنامہ اور مثال بن گیا۔ صرف قرآن مجید پڑھی ہوئی تھیں لیکن نہایت ذہین و فہیم، عاقل اور سوجھ بوجھ رکھنے والی خاتون تھیں۔ تحریک

خلافت اور ترک موالات کے لیے بڑا کام کیا۔ ہندو مسلم اتحاد کی علامت بن گئی تھیں مسلمان ان پر جان چھڑکتے تھے اور ہندو "مائی جی" کی جیکار لگاتے نہ تھکتے تھے۔ بڑے بڑے ہندو ان کے سامنے ادب سے زبان نہ کھولتے تھے۔ انھیں مجسم بھارت ماتا کہتے تھے۔ ان کا فیضان محبت وشفقت اور دل سوزی و دردمندی بلا امتیاز ہندو اور مسلمان سب کے لیے تھا۔ نہایت صابر و شاکر، منتظم اور غیور و خود دار تھیں۔ ۷۳ سال کی عمر میں ۱۳ر نومبر ۱۹۲۴ء کو علی گڑھ میں انتقال ہوا اور وہیں آسودۂ خاک ہوئیں۔

پٹروڈا راؤ بہادر سر اے پی

۱۸۷۵ء میں مدراس میں پیدا ہوئے۔ جاگیردار اور ہائی کورٹ کے وکیل تھے۔ ملک اور بیرونِ ملک بہت سے وفود میں حکومت ہند کی نمائندگی کی۔ گول میز کانفرنس ۱۹۳۰ء میں ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ ۱۹۳۱ء میں لیگ آف دی نیشنز جینوا میں بھی ہندوستانی نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔ ۱۹۳۰ء میں فرقہ وارانہ مسائل کے تصفیے کے لیے آل پارٹیز کانفرنس دہلی انہی کی صدارت میں ہوئی تھی۔ آل انڈیا کمیٹی آف دی جسٹس موومنٹ (نان برہمن) کے چیرمین تھے۔ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۷ء کے دوران میں مدراس میں تعلیم، پبلک ورکس اور اکسائز کے وزیر بھی رہ چکے تھے۔ ۲۶ر مئی ۱۹۴۶ء کو انتقال ہوا۔

تصدق احمد خاں شیروانی

شیروانی خاندان کے ایک ممتاز فرد اور علی گڑھ کے نامور انقلابی اور حریت پرست طلبہ میں تھے۔ اپنے زمانے میں کالج یونین کے نائب صدر بھی رہے تھے۔ ۱۸۸۴ء میں ملونا ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی عبدالرشید خاں شیروانی تھا۔ ابتدائی تعلیم چھپرہ (ضلع علی گڑھ) کے شیروانی انگلش اسکول میں حاصل کی۔ پھر علی گڑھ اسکول میں داخل ہوئے۔ بی اے انھوں نے علی گڑھ کالج سے کیا تھا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے۔ وہاں کیمبرج سے ایم اے کیا۔ کیمبرج میں وہ پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھیوں میں سے تھے۔ لندن سے بیرسٹری کی ڈگری لے کر ہندوستان لوٹے۔ علی گڑھ اور الہ آباد میں ایک عرصہ تک پریکٹس کرتے رہے۔ مچھلی بازار کانپور کی مسجد کے انہدام کا واقعہ پیش آیا تو اس کے ماخوذین کے ایثار پیشہ وکلا میں وہ بھی شامل تھے۔ سیاسی ذوق ان میں شروع ہی سے تھا۔ ۱۹۰۷ء میں علی گڑھ کالج کی مشہور

اسٹرائک کے محرکوں اور بانیوں میں تھے اور انھیں اس جرم میں کالج سے نکال دیا گیا تھا خلافت اور ترک موالات کی تحریکات شروع ہوئیں تو ان میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ خلافت کمیٹی یوپی کے سکریٹری مقرر کیے گئے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پہلے سکریٹری بھی آپ ہی تھے جولائی ۱۹۲۹ء میں آل انڈیا مسلم نیشنلسٹ پارٹی قائم ہوئی تو اس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد اور سکریٹری تصدق احمد خاں شیروانی تھے۔ مرکزی اسمبلی کے بلا مقابلہ ممبر بھی منتخب ہوئے تھے۔ حریت پسندی اور انگریز دشمنی کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ نہایت جری، نڈر اور بے باک تھے۔ ملک کی آزادی کے سلسلے میں وہ قید بھی ہوئے۔ اور سنت یوسفی پر عمل پیرا ہونے کی توفیق ملی۔ ان کی دو گرفتاریوں کا علم تو ان کے نام مولانا کے خط ہی سے ہو جاتا ہے۔ پہلی راج شاہی جیل کی قید، دوسری سنٹرل جیل نینی تال کی قید و بند۔

مولانا محمد علی کے نہایت قریبی دوستوں میں تھے۔ ان کے نام خط سے بھی دونوں کے مابین مخلصانہ اور بے تکلفانہ تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے۔ محمد علی ان کی بہادری، جرأت، عزیمت، تدبر اور اخلاص کے معترف اور ان کے قدردان تھے۔ محمد علی نے ایک غزل کے ایک شعر میں بھی ان کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

یہ ظلم ہے کہ سب کو کر دایک سا خیال
پاتے ہیں عقل بھی کبھی شروانیوں میں ہم

پہلے مصرعہ میں شیروانی خاندان کے بعض اکابر کی طرف اشارہ ہے جن سے بقول مولانا دریابادی "محمد علی کی بڑی سیاسی چشمک رہتی تھی"۔

مولانا محمد علی کا یہ خط ۱۹۲۳ء کا یادگار ہے۔ جب شیروانی نینی تال سینٹرل جیل میں ایک سال کی قید کاٹ رہے تھے اور محمد علی کراچی کے مشہور مقدمے میں سزا بھگت رہے تھے۔

تصدق احمد خاں شیروانی کا انتقال ۲۲ مارچ ۱۹۳۵ء/ ۱۶۔ ذوالحجہ ۱۳۵۳ھ کو علی گڈھ میں ہوا۔ مسلم یونی ورسٹی کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں۔

جعفری مراد سید محمد جعفری ہیں جو مچھلی شہر کے رہنے والے تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈگری یافتہ تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ہمدرد کے اسٹاف میں شامل ہوئے۔ اور ہمدرد کے دور ثانی میں شروع سے آخر تک شامل رہے۔ شروع میں مترجم کی حیثیت سے، پھر سب ایڈیٹر کی حیثیت سے اور مئی ۱۹۲۸ء میں مولانا محمد علی

علاج کے لیے یورپ گئے ۔ اور ہمدرد نئے انتظامات کے تحت نکلنا شروع ہوا، تو ایڈیٹر سید محمد جعفری مقرر ہوئے ۔ مولانا محمد علی کے بڑے مخلص تھے اور اپنے اخلاص و وفا میں آخر تک استوار رہے ۔ ۱۹۲۹ء میں ہمدرد بند ہو گیا تو اپنا اخبار ملت کے نام سے جاری کیا ۔ اخیر جون یا شروع جولائی ۱۹۷۸ء میں دہلی میں انتقال ہوا ۔

جمال میاں مولانا جمال الدین عبدالوہاب عرف عام میں صرف جمال میاں کے نام سے مشہور رہیں ۔ خاندان فرنگی محل کے مشہور رکن اور مولانا محمد عبدالباری فرنگی محلی کے نامور بیٹے ، ۱۲ر ربیع الاول ۱۳۲۸ھ بروز جمعہ مطابق ۶ر دسمبر ۱۹۲۰ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے ۔ پہلے قرآن مجید حفظ کیا پھر مدرسہ نظامیہ فرنگی محل سے درس نظامی کی تکمیل کی ۔

مولانا جمال میاں نے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا ۔ ان کی اس خدمت ملی کے بارے میں سید رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں ۔

"مولانا جمال میاں فرنگی محل کی آتش نوائی، خلوص، جوش اور جذبۂ کار نے یو، پی کے عوام کو پاکستان کا دالہ و شیدا بنا دیا"

یو، پی اسمبلی کے ممبر بھی مقرر ہو گئے تھے اور ہمدم کے نہ صرف ایڈیٹر ہو گئے تھے بلکہ وہ انہی کی ملکیت میں بھی چلا گیا تھا ۔

۱۹۵۷ء تک لکھنؤ میں قیام کیا پھر مشرقی پاکستان چلے گئے جہاں ان کا شروع ہی سے بہت بڑا کاروبار تھا ۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا تھا کہ جواہر لال کی حکومت نے بہ کمال شرافت مولانا کو انٹرنیشنل پاسپورٹ دے کر ان کی وطنیت ہندوستان برقرار رکھی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب حالات سے مجبور ہو کر باضابطہ پاکستانی بن گئے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ وہ اپنی ذاتی حیثیت سے بھی جن شریفانہ اخلاق کا مجموعہ ہیں ۔ ان کے لحاظ سے وہ جہاں بھی ہوں گے آنکھوں پر بٹھائے جائیں گے ۔ ۱۹۷۱ء کے بعد مشرقی پاکستان میں حالات خراب ہوئے تو مغربی پاکستان تشریف لے آئے تھے ۔ اب کراچی میں مقیم ہیں ۔

جناح، قائداعظم محمد علی ۲۵ر دسمبر ۱۸۷۶ء کو کراچی میں پیدا ہوئے ۔ والد کا نام جناح پونجا تھا ۔ سندھ مدرسۃ الاسلام اور کرسچین مشن اسکول کراچی میں تعلیم حاصل کی ۔ جنوری ۱۸۹۳ء میں ایکسپورٹ امپورٹ کے

کاروبار کو وسعت دینے کے لیے لندن تشریف لے گئے۔ کاروبار کی ناکامی کے بعد وہیں وکالت کے امتحان کی تیاری میں لگ گئے۔ ۱۸۹۶ء میں کراچی واپس آگئے لیکن وکالت بمبئی میں شروع کی۔ رفتہ رفتہ شہرت حاصل کی اور ہندوستان کے نامور وکیلوں میں ان کا شمار ہونے لگا۔

قائداعظم کا شمار کانگریس کے صفِ اوّل کے رہناؤں میں ہوتا تھا۔ وہ ہوم رول لیگ میں بھی شامل رہے۔ ہندو مسلم اتحاد کے بہت بڑے داعی تھے۔ مسز سروجنی نائیڈو انھیں سفیرِ اتحاد کے لقب سے یاد کرتی تھیں ۱۹۳۵ء کے بعد وہ باقاعدہ طور پر لیگ میں شامل ہو گئے لیکن ۱۹۳۹ء تک وہ ایک معتدل سیاسی رویے کے رہنما تھے۔ اس کے بعد کانگریس سے ان کے اختلافات انتہا کو پہنچ گئے۔ ۱۹۴۰ء میں لاہور رزدلیوشن کے بعد کانگریس اور مسلم لیگ میں اتحاد و اتفاق اور ملک کی یک جہتی کا کوئی امکان نہ رہا تھا لیکن ۱۹۴۵ء میں قائداعظم نے کیبنٹ مشن پلان منظور کرکے ملک کے اتحاد کا ایک موقع فراہم کر دیا لیکن پنڈت جواہر لال نہرو کے ایک بیان نے جس کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد کا خیال ہے کہ وہ ذمہ دارانہ نہیں تھا، قائداعظم کو اپنا موقف تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔

قائداعظم پاکستان کے پہلے گورنر جنرل اور دستور ساز اسمبلی کے صدر تھے۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو ۱۰ بجے کر بیس منٹ پر کراچی میں انتقال فرمایا۔ ۱۲ ستمبر کو مولانا شبیر احمد عثمانی نے نماز جنازہ پڑھائی اور نئی نمائش کے قریب ایم اے جناح روڈ (سابق بندر روڈ) پر وسیع میدان میں انھیں سپرد خاک کر دیا گیا۔

جہاں آرا والد میاں سر محمد شفیع اور شوہر شاہ نواز تھے، اسی لیے بیگم شاہ نواز کہلائیں۔ شورش کاشمیری نے لکھا ہے کہ وہ پنجابی مسلمانوں میں آزادیٔ نسواں کی داعیہ ہیں جس زمانے میں انھوں نے پردہ اتارا اور قومی تحریکوں میں قدم رکھا ان دنوں مسلمانوں میں خال خال گھرانے ہی بے پردہ ہونے کی جسارت کر سکتے تھے۔ وہ پہلی ہندوستانی خاتون تھیں جنھوں نے ۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ تحریک پاکستان کی بڑی سرگرم رکن تھیں۔ پنجاب میں انھوں نے خواتین میں سیاسی شعور پیدا کرنے اور تحریک پاکستان کو خواتین میں مقبول بنانے میں بڑا حصہ لیا۔ اب بہت ضعیف ہو گئی ہیں لاہور میں رہائش پذیر ہیں۔

جے سنگھ خطوط میں کئی مقامات پر "مہاراجہ الور" کا ذکر آیا ہے۔ اس سے مراد جے سنگھ ہے۔ ۱۸۹۲ء میں جب کہ ان کی عمر سولہ سال کی تھی تخت حکومت پر بیٹھے۔ بلوغ تک انتظام ایک کونسل کے سپرد رہا۔ وسیع القلب، بلند حوصلہ، علوم وفنون کے قدردان، تعصّب سے پاک اور مولانا محمد علی جوہر سے عقیدت تھی ۱۹۲۸ء میں مولانا کے علاج کے لیے سفر یورپ کے تمام اخراجات مہاراجہ نے برداشت کیے تھے۔

جیوفرے کوربٹ، سر ۹ر فروری ۱۸۸۱ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد فریڈرک کوربٹ تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد حکومت ہند کی ملازمت اختیار کی۔ وہ سب سے پہلے ۱۹۰۵ء میں صوبہ متوسط میں اسسٹنٹ کمشنر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد مختلف اوقات میں سٹلمنٹ آفیسر اینڈ ڈپٹی کمشنر، ڈ ... آف انڈسٹریز اینڈ کنٹرولر آف میونی شنیز، ڈپٹی سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا کامرس ڈیپارٹمنٹ، پھر قائم مقام سکریٹری اور پھر جوائنٹ سکریٹری مقرر ہوئے۔ گول میز کانفرنس ۱۹۳۰ء میں برٹش انڈین ڈیلی گیشن کے سکریٹری تھے اس کے بعد انھیں فوڈ کونسل کا چیرمین بنا دیا گیا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد آکسفورڈ یونی ورسٹی میں ہندوستانی تاریخ کے شعبہ میں ریڈر ہو گئے تھے۔ ۲ر نومبر ۱۹۳۷ء کو انتقال ہوا۔

چرول، سر ونٹسائن برطانوی صحافت کا ایک نامور رکن، لندن ٹائمس کے شعبۂ خارجہ کا مدیر اعلیٰ۔ ہندوستان و مشرق کا سیاح۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ایک خط (۱۰ر نومبر ۱۹۱۶ء) میں محمد علی نے اسے "خبیث و بدباطن شخص" کے خطاب سے نوازا ہے۔

حامد علی خاں نواب رام پور کے نواب رضا علی خاں کے جانشین تھے۔ ان ہی کے زمانے میں علی برادران کو دیس نکالا ملا تھا اور داخلہ ممنوع قرار پایا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں انتقال ہوا۔

حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا برصغیر پاک و ہند کے مشہور عالم دین اور سیاسی رہنما جو اپنی جرأت، بے باکی، حق گوئی، غیرت ایمانی اور جنگ آزادی میں بے مثال قربانیوں کی بنا پر امتیازی شان کے مالک تھے۔ ۳ر جولائی ۱۸۹۲ء کو لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے پردادا مولانا

شاہ عبدالقادر لدھیانوی نے اپنے بھائیوں اور بیٹوں کے ساتھ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں حصّہ لیا اور لدھیانہ سے دہلی تک سرزمین ہند کو اپنے خون سے لالہ زار کیا۔ آخری معرکہ چاندنی چوک دہلی میں پیش آیا۔ اور پورے خاندان نے انگریزوں کے ناپاک وجود سے ملک کی سرزمین کو آزاد کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگادی۔ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ایک عرصہ تک پنجاب میں روپوش رہے۔ ہندوؤں تک میں ان کے احترام و اعتماد کا یہ عالم تھا کہ پورے خاندان کے ساتھ انھیں کے درمیان روپوش رہے۔ اور انگریزوں کو خبر نہ ہوئی۔ مولانا حبیب الرحمٰن کے دادا مولانا محمد شاہ اور والد مولانا محمد زکریا بھی خدمت ملک و ملّت میں مصروف رہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن کا اوڑھنا بچھونا بھی قوم و ملّت کی خدمت گزاری تھی۔ وہ جمعیت علماء ہند کے رہنماؤں اور احرار اسلام ہند کے بانیوں میں سے تھے۔ ملک کی آزادی کی تحریک پر انھوں نے کانگریس کا پورا پورا ساتھ دیا۔ وہ ملک کی آزادی کے لیے انگریزوں سے اور مسلمانوں کے حقوق کے لیے ہمیشہ کانگریس کے رہنماؤں سے لڑتے رہے۔ ان کے اخلاص اور دیانت اور تدبر و بصیرت پر گاندھی جی، پنڈت جواہرلال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد اعتماد کرتے تھے۔

تقسیم ملک کے وقت پنجاب میں فساد برپا ہوئے تو آپ پاکستان تشریف لے آئے تھے لیکن پھر ہندوستان چلے گئے۔ اور دہلی میں مقیم ہوگئے۔ چاندنی چوک کے نزدیک کوچہ رحمان کی نسبت آپ ہی کی جانب ہے۔ آپ کے اخلاف میں سے بعض پاکستان میں ہیں اور بیشتر افراد خاندان ہندوستان میں ہیں۔ ۳ر ستمبر ۱۹۵۶ء کو دہلی میں آپ کا انتقال ہوا۔ آخری آرام گاہ جامع مسجد دہلی کے پہلو میں ہے۔

حبیب اللہ خاں، امیر | امیر عبدالرحمٰن کے بیٹے، باپ کی وفات یکم اکتوبر ۱۹۰۱ء کے بعد تخت پر بیٹھے۔ حبیب اللہ ایک مستبد حکمراں تھے۔ انگریزوں سے متعدد معاہدات کیے اور نہایت نیازمندی کے ساتھ ان کی پابندی کی۔ ملک کے امور خارجہ انگریزوں کی تحویل میں تھے۔ امور داخلہ میں بھی انگریز دخیل تھے۔ امیر موصوف میں بعض اخلاقی کمزوریاں بھی تھیں۔ ان باتوں نے ملک کے انقلابی اور دین دار طبقے کو ان سے متنفر کردیا تھا۔ ان نفرتوں کی وجہ سے ۲۰ر فروری ۱۹۱۹ء کو لغمان کے قلعہ گوش میں انھیں قتل کردیا گیا۔

حسرت موہانی | فضل الحسن حسرت ضلع اناؤ (یو۔پی) کے قصبہ موہان میں پیدا ہوئے۔ سال ولادت ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء ہے۔
علی گڑھ کالج سے بی اے پاس کرنے کے بعد وہیں سے "اردوئے معلی" کے نام سے مشہور ادبی رسالہ جاری کیا۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں ادب وشعر کی خدمت کے علاوہ قومی و ملی کوئی تحریک بھی ایسی نہیں تھی جس میں انھوں نے سرفروشانہ حصہ نہ لیا ہو۔ تحریک آزادی، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، تحریک ہجرت تحریک سول نافرمانی، تحریک نمک سازی، تحریک کھدر میں وہ صف اول کے رہنماؤں میں تھے۔ کانگریس میں وہ رہے۔ ریشمی رومال تحریک میں ان کا نام آیا ہے۔ لیگ میں انھوں نے سرگرمی سے حصہ لیا اور متعدد بار اس کے بڑے بڑے رہنماؤں سے ٹکر لی۔ ملک کی آزادی کی تحریک اور انگریز دشمنی کی بنا پر برس ہا برس قید میں رہے اور شدید تکالیف برداشت کیں اور بڑے نقصان برداشت کیے۔

حسرت جتنے بڑے سیاست داں تھے اس سے بڑے وہ اردو کے شاعر تھے۔ اردو شاعری، تنقید اور ادبی تحقیق میں انھوں نے بعد کے ادیبوں، شاعروں کو نئی راہیں دکھائیں۔ انھیں متفقہ طور پر رئیس المتغزلین کہا جاتا ہے ان کے کلام کے تیرہ مجموعے چھپے جو اب کلیات حسرت میں شامل ہیں۔ معانی و بیان میں بھی ان کی چند کتابیں یادگار ہیں۔ ۱۳ رمئی ۱۹۵۱ء کو لکھنؤ میں انتقال ہوا۔

مولانا محمد علی سے حسرت کے کئی رشتے تھے۔ دونوں علی گڑھ کے فرزند تھے۔ سیاست میں دونوں کی راہ ایک تھی، دونوں کا ادبی ذوق بلند تھا، دونوں ملت کے دیوانے، آزادی کے متوالے اور انگریز کے ازلی دشمن تھے۔ مذہب میں دونوں رسوم کے پابند، قوالی کے شیدا، عرس کے دلدادہ تھے اور دونوں کی مذہبی عقیدت وارادت کے رشتے ایک ہی خانوادہ عرفان وتصوف — فرنگی محل سے استوار تھے۔ بعض مسائل میں دونوں میں اختلاف بھی ہوا، لیکن مجلسی و تہذیبی روابط پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا اور دونوں ایک دوسرے کا بدستور احترام کرتے رہے۔

حسن نظامی، خواجہ | اصل نام علی حسن تھا لیکن وہ خواجہ حسن نظامی کے نام سے مشہور ہوئے۔ سید عاشق کے بیٹے تھے۔ ۲ر محرم

۱۲۹۶ھ/ ۲۷ردسمبر ۱۸۷۸ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اردو کے بلند پایہ ادیب اور صاحب طرز انشاپرداز تھے۔ بے شمار کتابیں ان کی اپنی لکھی ہوئیں، اور دوسروں کی لکھی ہوئی ان کے نام سے چھپ چکی ہیں۔ وہ بڑے کامیاب صوفی اور شیخ طریقت بھی تھے۔ ان کے مریدین میں بڑے بڑے مسلمان اور ہندو امرا شامل تھے۔ مشتاق احمد وجدی نے لکھا ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کو برباد کرنے کے لیے مسلمانوں کی جانب سے انگریزی حکومت کے اشارے پر تبلیغ کی تحریک خواجہ صاحب نے شروع کی تھی۔ ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۷۴ھ/ ۳ جولائی ۱۹۵۵ء کو دہلی میں انتقال ہوا اور درگاہ خواجہ نظام الدین میں دفن ہوئے۔

حسین احمد شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند قصبہ ٹانڈا ضلع فیض آباد (یوپی) میں ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام "چراغ محمد" تھا لیکن مولانا مدنی کے نام سے شہرت پائی۔ والد کا نام حبیب اللہ تھا۔ ابتدائی تعلیم ٹانڈا میں اور تکمیل دارالعلوم دیوبند میں ہوئی۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے نامور شاگرد، فیض یافتہ اور حضرت کے سیاسی کاموں میں شریک اور تحریک ریشمی رومال کے بھی رازدار و شریک تھے۔

مدت دراز تک مدینہ منورہ میں قیام رہا اور درس حدیث نبویؐ سے تشنگان علوم نبوت کی سیرابی میں مصروف رہے۔ حضرت شیخ الہند کے ساتھ ۱۹۱۶ء میں آپ کو دارالامن مکہ مکرمہ میں گرفتار کر کے برٹش حکومت کے حوالہ کر دیا گیا۔ تقریباً ساڑھے تین سال تک جزیرہ مالٹا میں قید رہے جون ۱۹۱۹ء میں رہائی کے بعد ہندوستان تشریف لائے۔ اس کے بعد سے علوم و معارف نبویؐ کی تعلیم و اشاعت کے ساتھ ملک کی آزادی کی جد و جہد میں مصروف رہے۔ مفتی محمد کفایت اللہ کے انتقال کے بعد آپ کو جمعیت علمائے ہند کا صدر مقرر کیا گیا۔ آپ اپنی وفات تک اس منصب پر فائز رہے اور جمعیت کی رہنمائی کا فرض انجام دیتے رہے۔ تحریک آزادی کے سلسلے میں متعدد بار جیل گئے۔ ۱۹۲۱ء میں انھیں علی برادران کے ساتھ کراچی کی خلافت کانفرنس میں ایک تقریر کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ بغاوت کے الزام میں علی برادران اور دوسرے حضرات کے ساتھ سزا پائی۔ محمد علی نے اسی لیے انھیں "ہمارے رفیق مولانا حسین احمد" لکھا ہے۔

حضرت شیخ الاسلام عالم دین، محدث، مدرس، سیاسی رہنما، مجاہد جنگ آزادی ہونے کے ساتھ بلند پایہ مصنف بھی۔ آپ کے خطبات، مکاتیب کے متعدد مجموعوں کے علاوہ "نقشِ حیات" کے نام سے دو جلدوں میں آپ کی خود نوشت یادگار ہے۔ ۵ دسمبر ۱۹۵۷ء کو دیوبند میں انتقال ہوا۔ اور وہیں کی سرزمین آپ کا مدفن بنی۔

حمیدہ

مولانا محمد علی کی تیسری صاحبزادی تھیں۔ ۶ مئی ۱۹۲۸ء کو ماجد علی خاں رام پوری سے ان کا نکاح ہوا تھا۔ ہمدرد بابت ۴ مئی ۱۹۲۸ء میں شادی کی اطلاع کے سلسلے میں درج ہے۔ ۶ مئی بروز اتوار کو ماجد علی خلف حافظ احمد علی خاں کے ساتھ شادی ہوگی۔ نکاح مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی پڑھائیں گے۔ حمیدہ کے بارے میں ایک پُر لطف اطلاع یہ بھی ہے۔

"عزیزہ حمیدہ بانو کی بسم اللہ کی رسم مولانا ابوالکلام صاحب نے ادا کی تھی۔"

مرض دق میں مبتلا ہو کر اخیر جولائی ۱۹۲۹ء میں منصوری میں انتقال کیا۔ نعش کو دلی لا کر دفن کیا گیا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا بیٹی کی لوحِ قبر پر یہ اشعار کندہ کرانا چاہتے تھے۔

ہوا محسوس جب سے، ہے خوشی تیری خوشی اپنی
نہ اپنی موت، موت اپنی، نہ اپنی زندگی اپنی
کبھی چھوڑا نہ دامن کو ترے پھر تو ہی بتلا دے
اسے بے چارگی تیری کہوں یا بے کسی اپنی

حیات

مراد حسن محمد حیات ہیں۔ پنجاب کے رہنے والے تھے۔ علی گڈھ سے بی اے کیا۔ علی گڈھ میں "مائی لارڈ" کے عرف سے مشہور تھے۔ ملی و قومی تحریکات میں حصہ لیا۔ تحریک خلافت اور ترک موالات کے سرگرم کارکن تھے۔ ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی جو وفد خلافت انگلستان لے گئے تھے۔ حیات صاحب اس کے سکریٹری تھے۔ ان کا نام ۱۹۲۴ء کے اس وفد خلافت میں بھی شامل تھا جو حجاز کے حالات کے مشاہدے کے لیے جانے والا تھا اور سید سلیمان ندوی کی سربراہی میں گیا بھی تھا لیکن حیات صاحب اس وفد میں نہیں جا سکے تھے۔ انھوں نے مولانا محمد علی کے سکریٹری کی حیثیت سے بھی کام کیا تھا۔ ان کی شادی عبدالغنی پنشنر ڈسٹرکٹ و سیشن جج (لکھنؤ)، جو اصلاً پنجابی تھے، کی بڑی لڑکی سے ہوگئی تھی، اس کے بعد ہی سیاست

سے کنارہ کش ہو کر ملازمت اختیار کرلی تھی۔ بھوپال میں پبلسٹی آفیسر اور پھر نواب صاحب بھوپال کے سکریٹری ہو گئے تھے۔ مولانا محمد علی کے متعدد خطوط میں ان کا نام آیا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے انھیں "پنجابی ثم بھوپالی" لکھا ہے۔ شاید بعد میں مستقل طور پر بھوپال ہی میں آباد ہو گئے تھے۔ ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ ۸ر فروری ۱۹۵۵ء کو بھوپال میں انتقال ہوا۔

مولانا محمد علی سے خصوصی تعلق تھا۔ مولوی عرفان کے نام مولانا نے جو خط لندن سے سفر آخرت سے چند روز قبل لکھا تھا۔ اس میں ان کا ذکر آیا ہے اور مولانا عرفان کو تاکید کی ہے کہ یہ خط حیات کو بھوپال بھیج دو۔

خولہؓ، حضرت مشہور سرفروش اور جانباز صحابیہ مجاہد اسلام حضرت ضرار کی بہن، والد کا نام ازدر تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ جنگوں میں شریک ہوتی تھیں۔ ۱۹ھ میں جنگ اجنادین میں بھائی کی گرفتاری کی خبر سنی تو حضرت خالد کی سربراہی میں مسلمانوں کا لشکر پہنچنے سے قبل دشمن کی فوج پر جا کر ٹوٹ پڑیں۔ چونکہ چہرے پر نقاب پڑا ہوا تھا اس لیے حضرت خالد کو شبہ ہوا کہ یہ کوئی مسلمان مجاہد ہے۔

داؤد محمد داؤد عباسی امروہہ کے رہنے والے تھے۔ محمود احمد عباسی کے بڑے بھائی تھے۔ والد کا نام علی محمد عباسی تھا۔ ۲۰ر رمضان ۱۲۸۰ھ/ ۹ر مئی ۱۸۶۲ء میں امروہہ میں پیدا ہوئے۔ عربی، فارسی کی تحصیل کے علاوہ ابتدائی تعلیم امروہہ میں حاصل کی۔ پھر علی گڑھ کالج سے بی اے پاس کیا۔ اپنے زمانۂ طالب علمی ہی میں ذہانت اور قابلیت کے لیے مشہور تھے۔ شوخی اور ظرافت مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ احباب کی تفریح طبع کے لیے مشہور شعراء کے کلام پر دلچسپ تضمین کرتے تھے۔ ان کی ایک تضمین جو انھوں نے حالی کی مشہور غزل

اس کے جلتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

پر کی تھی بہت مشہور ہوئی۔ حالی نے انھیں بلا کر اصرار کر کے خود ان کی زبان سے سنی اور داد سے ان کی ہمت افزائی کی۔ داؤد کی تضمین یہ ہے ؎

گر کرے قصد کسی کام کا دل سے انساں
پہلے یہ دیکھے وہ اس کام کا ہے بھی شایاں
سن کے لوگوں سے، وہ آئے تھے داؤد کے ہاں

ان کو حالیؔ بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۸۹۱ء میں علی گڑھ کالجیٹ اسکول سے وابستہ ہوگئے پھر ۱۸۹۳ء میں نائب تحصیل دار کے عہدے پر فائز ہوگئے۔ ۲۷ر جون ۱۹۰۰ء کو ۳۸ سال کی عمر میں فتح آباد (ضلع آگرہ) میں انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔

اردو کے ساتھ فارسی اور عربی کے بھی بلند پایہ شاعر تھے۔ ۱۸۹۳ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کا جو تاریخی اجلاس علی گڑھ میں نواب محسن الملک کی صدارت میں ہوا تھا اور اسی موقع پر سر سید راس مسعود کی رسم تسمیہ خوانی انجام دی گئی تھی۔ اس میں داؤد مرحوم نے بھی شرکت کی تھی اور ایک نہایت بلند پایہ اور طویل نظم عربی میں انھوں نے پڑھی تھی۔

مولانا محمد علی کے مخلص دوستوں میں سے تھے۔ محمود احمد عباسی کے نام خط میں میں لکھا ہے کہ "میں (محمد علی) ۱۱½ برس کی عمر میں علی گڑھ گیا تو وہ میرے بھائیوں کے ہادی اور رہنما تھے۔ آج تک اس پر لطف زمانے کو نہیں بھولا ہوں"۔

مولانا محمد علی کو داؤد مرحوم کی جوانا مرگی کا بہت دکھ تھا جیسا کہ ان کے خط سے ظاہر ہوتا ہے۔

رحمت اللہ، سر

مرادسرا براہیم رحمت اللہ ہیں ۱۸۶۲ء میں بمبئی میں پیدا ہوئے۔ میٹرک پاس کرنے سے پہلے تعلیم ترک کردی اور کاروبار میں معروف ہوگئے۔ لیکن بعد میں جب قومی و ملّی کاموں میں حصہ لینے کا شوق پیدا ہوا اور مسلمانوں کی علمی، تعلیمی، تہذیبی تحریکات میں حصہ لینا شروع کیا تو مطالعے سے تعلیمی کمی کو پورا کیا۔ وہ اپنی خدمات کی بنا پر مختلف مناصب پر فائز رہے۔ مسلم لیگ کا اجلاس ۱۹۱۳ء منعقدہ آگرہ ان ہی کی صدارت میں ہوا تھا۔ ۱۹۲۴ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس بمبئی کے صدر آپ تھے۔ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں بدنظمیوں کی تحقیقات کا کمیشن آپ ہی کی سربراہی میں تشکیل دیا گیا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس میں ان کا بھیجا جانا مذبذب تھا۔ اس موقع پر مولانا غلام رسول مہر نے انقلاب میں ایک شذرہ لکھا کہ "سرابراہیم رحمت اللہ مسلمانوں کے ان چند صائب الرائے اکابر میں سے ہیں جو نہایت پختگی اور معقولیت سے اسلامی مطالبات کی حمایت کرسکتے

ہیں۔ اس لیے آپ کا گول میز کانفرنس میں شریک نہ ہونا مسلمانوں کے لیے بے انتہا نقصان کا موجب ہوگا۔" (یکم نومبر ۱۹۳۰ء)

رشاد خلیفۃ المسلمین سلطان رشاد سلطان محمد پنجم کے لقب سے اپریل ۱۹۰۹ء میں ترکی کے تخت خلافت پر بیٹھے۔ محمد اظہر علی علوی کاکوروی مصنف "مصطفےٰ کمال اور تاریخ ترکی و فلسطین" کے بقول بہت ہی بدھے سادے مسلمان تھے، مجلس مبعوثین کے بندے اور سیاسیات سے قطعاً نابلد تھے، ترکی کے لیے سب سے زیادہ مسائل سلطان رشاد کے عہد میں پیدا ہوئے، اور ان کی نا اہلی کی بدولت ترکی مصائب میں گرفتار رہا۔ شروع جولائی ۱۹۱۸ء میں ان کا عہد پُر مصائب ان کے انتقال کی وجہ سے ختم ہوا۔

رؤف پاشا، غازی مشہور ترکی رہنما جس نے ۱۹۱۲ء کی جنگ بلقان میں حمیدیہ کے کپتان کی حیثیت سے دنیا بھر میں شہرت حاصل کی۔ انجمن اتحاد ترقی کے سرگرم رکن اور مصطفےٰ کمال پاشا کے ساتھیوں میں تھے اور عمائد حکومت میں شامل تھے۔ ۱۹۲۲ء میں وزارت انگورہ کا انتخاب از سر نو عمل میں آیا تو وزارت عظمیٰ کا اہم منصب آپ کے حصے میں آیا۔ اس کے دو ماہ کے بعد رؤف بے کو پاشا کے سب سے بڑے خطاب سے نوازا گیا۔ لیکن وہ اتاترک کے مغرب پسندانہ اقدامات میں زیادہ دنوں تک ساتھ نہ دے سکے اور حکومت سے الگ ہوگئے اور بالآخر انھیں جلاوطن ہوجانا پڑا اور ایک عرصہ تک پیرس میں مقیم رہے۔ ۱۹۳۳ء میں انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں توسیعی خطبات دینے کے لیے ہندوستان کا سفر کیا اور کئی دوسرے شہروں میں بھی گئے اور ہندوستان کے مسلمان زعما اور ارباب سیاست سے ملاقاتیں کیں۔

زندگی کے آخری ایام انھوں نے سیاست سے بے تعلق رہ کر اپنے وطن میں گزارے۔ بالآخر ترکی کا یہ عظیم سپوت ۷ رجولائی ۱۹۶۴ء کو ہمیشہ کے لیے اس جہان فانی سے رخصت ہوگیا۔

ریمزے، میکڈانلڈ جیمس مشہور برطانوی مدبر، لیبر پارٹی کا بانی ممبر تھا۔ جو ترقی کرکے انگلستان کی وزارت عظمیٰ کے منصب تک پہنچا۔ ۱۲ر اکتوبر ۱۸۶۶ء کو لاسی موتھ (اسکاٹ لینڈ) میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک زمیندار کا مزارع تھا۔ نوکرانی سے اپنے باپ کے غیر قانونی تعلقات کا

نتیجہ تھا۔ نہایت ذہین اور فطین تھا۔ زندگی کا آغاز ایک اسکول ٹیچر کی حیثیت سے کیا۔ ۱۸۹۶ء میں مارگریٹ گلیڈ اسٹون سے شادی کی۔ ۱۹۱۳ء میں پبلک سروس کمیشن کے ایک ممبر کی حیثیت سے ہندوستان کا دورہ کیا۔ لیبر پارٹی کے رہنما کی حیثیت سے اسے ہندوستان کا ہمدرد سمجھا جاتا تھا لیکن برطانوی وزیراعظم بن کر اس نے اس غلط فہمی کو دور کردیا۔ بہت سے سیاہ قوانین' بنگال اور دوسرے مقامات پر اسی کی وزارت عظمیٰ کے دور میں نافذ کیے گئے۔

کامریڈ کے شائقوں میں سے تھا۔ ۱۹۱۳ء میں مولانا محمد علی سے تعلقات پیدا ہوگئے تھے لیکن مولانا کی رائے اس کے بارے میں بہت خراب تھی۔ مولانا اسے انتہائی درجے کا جھوٹا، فریبی، بدعہد، کینہ پرور، تنگ ظرف اور تنگ دل انگریز سمجھتے تھے۔ مولانا کی رائے تھی کہ اس انگریز وزیراعظم سے کسی بھلائی کی امید نہ رکھنی چاہیے۔ جب یہ اپنی قہرمانی اور استبداد کے ساتھ ہندوستان پر حکومت کر رہا تھا۔ تو مولانا محمد علی نے بڑی جرأت کے ساتھ اس کے خلاف" بھائی رام جی میکڈانلڈ کے کے کچھ حالات" کے عنوان سے چند مضامین لکھے تھے۔

زاہد — زاہد علی نام تھا۔ مولانا شوکت علی کے بیٹے تھے۔ علی گڈھ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ مولانا محمد علی کی صاحبزادی زہرہ ان سے منسوب تھیں۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد والد اور چچا کے کاموں میں ہاتھ بٹانا شروع کیا۔ ہمدرد اور کامریڈ اور ان کے پریس کے منیجر تھے، بعد میں خلافت بمبئی کو سنبھالا، اور مولانا شوکت علی کے انتقال کے بعد تو انھوں نے اپنے آپ کو خلافت اخبار، خلافت پریس اور خلافت کمیٹی کے لیے وقف کردیا تھا۔ تقسیم ملک کے بعد ان کی بیوی بچے پاکستان آگئے تھے لیکن وہ خود اور ان کے چھوٹے بھائی عابد شوکت علی ہندوستان ہی میں ٹھیرے رہے تھے اور بقول مولانا عبدالماجد دریابادی کے" مرحوم و مغفور خلافت کمیٹی کے مزار پر دھونی رمائے بیٹھے تھے"!

یادگار رونق محفل تھی پروانے کی خاک

۱۹ر دسمبر ۱۹۶۸ء کو اپنے بیوی بچوں سے دور بمبئی میں خلافت کا یہ آخری نام لیوا بھی دنیا سے اٹھ گیا۔

زہرہ — مولانا محمد علی کی سب سے بڑی صاحبزادی جن کا اپنے چچا کے بیٹے زاہد علی سے نکاح ہوا۔

سالک، عبدالمجید اردو کے مشہور صحافی، بلند پایہ مزاح نگار، صاحب طرز ادیب، متعدد کتابوں کے مصنف، اور اردو فارسی کے اچھے شاعر بھی تھے۔ سالک صاحب ۱۳ دسمبر ۱۸۹۵ء کو بٹالہ ضلع گورداس پور میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام منشی غلام قادر تھا۔ میٹرک تک کی تعلیم انبالہ میں حاصل کی پھر عملی زندگی میں قدم رکھا۔ ۱۹۱۴ء میں فانوس خیال کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جو دس ماہ زندہ رہا۔ ۱۹۱۵ء میں لاہور آگئے اور سید ممتاز علی کے رسالہ تہذیب نسواں اور پھول کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں روزنامہ زمیندار سے وابستہ ہوئے۔ ایک صحافی کی حیثیت میں تحریک ترک موالات اور تحریک خلافت میں پرجوش حصہ لیا۔ نومبر ۱۹۲۱ء میں گرفتار ہو گئے جس میں انھیں ایک سال کی سزا ہو گئی ۱۹۲۲ء کے اواخر سے وہ پھر زمیندار میں آگئے۔ اسی زمانے میں انھوں نے پرائیویٹ طور پر انٹرمیڈیٹ اور بی اے کے امتحان پاس کیے۔

۱۹۲۷ء میں سالک صاحب اور مہر صاحب نے مل کر انقلاب جاری کیا۔ دونوں میں زندگی بھر قابل رشک برادرانہ تعلقات رہے۔ سالک صاحب نے اپنے خاص کالم "افکار و حوادث" سے مزاح نگاری کے ایک مستقل اسکول کی بنیاد رکھی اور متعدد لکھنے والوں کی تربیت کی۔ وہ ایک باغ و بہار شخصیت تھے انھوں نے سنجیدہ موضوعات پر بھی قلم اٹھایا "سرگزشت" کے نام سے آپ بیتی لکھی، یاران کہن کے نام سے اپنے چند خاص معاصر کا دلچسپ تذکرہ لکھا۔ "ذکر اقبال" اقبالیات میں ہے۔ "راہ و رسم منزلہا" کے نام سے کلام کا مجموعہ ۱۹۲۲ء میں چھپا تھا۔ بچاسوں کی تعداد میں مقالات الگ یادگار ہیں۔

سالک کا شمار ہندوستان پاکستان کے چند بلند پایہ صحافیوں میں ہوتا ہے۔ مزاح نگاری میں وقت کے امام تھے۔ شگفتہ نگاری میں ان کا جواب نہ تھا۔ ادبی و علمی یادگاروں کے علاوہ ان کی صلبی اولاد بھی ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ان کے علمی جانشین، ایک کالم نویس، محقق اور مقالہ نگار کی حیثیت سے بہت مشہور ہیں۔ سالک صاحب کا ۲۷ ستمبر ۱۹۵۹ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔

سائمن، سرجان مشہور برطانوی مدبر سرجان سائمن ۲۷ فروری ۱۸۷۳ء کو پیدا ہوئے۔ ایک پادری کے بیٹے تھے۔ آکسفورڈ اور ایڈن برگ میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۹۱ء میں ایک وکیل کی حیثیت سے عملی زندگی میں

قدم رکھا۔ ۱۳-۱۹۱۰ء میں سولسٹر جنرل، ۱۵-۱۹۱۳ء میں اٹارنی جنرل اور اس کے بعد ۱۸-۱۹۱۵ء میں برطانوی فوج کے ایک میجر جنرل کی حیثیت سے محاذِ جنگ پر خدمات انجام دیں۔ ایک اعتدال پسند کی حیثیت سے سیاست میں حصّہ لیا، اور ۱۹۰۶ء میں اور ۱۹۲۲ء میں دوبار برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر مقرر ہوئے ۱۹۳۱ء میں نیشنل لبرل جماعت میں شریک ہو گئے۔ اور مختلف میعادوں میں ہوم سکریٹری وزیر خارجہ اور وزیر خزانہ کی حیثیت سے اپنے وطن اور قوم کی خدمات انجام دیں ۱۹۲۷ء میں برطانوی حکومت نے ہندوستان کو مزید اصلاحات دینے کے لیے جو کمیشن مقرر کیا تھا اور ۱۹۲۸ء میں ہندوستان آیا تھا اس کے سربراہ یہی سائمن تھے۔ اور اسی مناسبت سے اس کمیشن کو "سائمن کمیشن" کہا گیا۔

سپرو، سرتیج بہادر کشمیر کے رہنے والے تھے۔ ان کے بزرگوں میں سے کسی نے بجنور کی سکونت اختیار کر لی تھی۔ تقریباً ۱۸۷۷ء میں بجنور میں پیدا ہوئے۔ سپرو نے ۱۸۹۵ء میں الہ آباد ہائی کورٹ کے ایک وکیل کی حیثیت سے اپنی عملی زندگی شروع کی اور پھر زندگی بھر الہ آباد ہی میں رہے۔ ایک نہایت کامیاب وکیل کی حیثیت سے بہت مشہور ہوئے۔ قانون میں قابلیت کے لحاظ سے وہ ہندوستان کی ایک منفرد شخصیت تھے۔ وہ ایک بلند پایہ علمی، ادبی اور تہذیبی شخصیت تھے۔ اردو زبان اور مسلمانوں کے کلچر کے بڑے عاشق تھے۔ انجمن روحِ ادب الہ آباد کے بانی تھے۔ انجمن ترقی اردو ہند کے صدر بھی رہے تھے اردو کی ترویج و ترقی کے لیے عمر بھر کوشاں رہے۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین نے لکھا ہے کہ وہ مسلمانوں کی طرزِ معاشرت، نشست و برخاست، زبان و تاریخ اور تہذیب سے بے حد دلچسپی رکھتے تھے۔ بلکہ ان کا لگاؤ عشق کے درجے کا تھا۔ کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا سب کچھ اسلامی تہذیب کا مرقع تھا۔ چنانچہ ان کے یہاں ایک باورچی مسلمان ضرور رہتا تھا اور وہ عموماً وہی چیزیں اپنے دسترخوان پر دیکھنا چاہتے تھے جو مسلمان نوابوں اور رؤسا کے یہاں ہوتی تھیں۔ اردو سے بے پایاں محبت کرتے تھے۔ یہ شغف اتنا زیادہ تھا کہ وہ اردو کی کسی برائی کو سننا گوارا نہ کرتے تھے۔ وہ اتنی شستہ اور پاکیزہ اردو بولتے تھے کہ میں نے کم لوگوں کو اس زمانے میں اتنی اچھی اردو بولتے سنا ہے...... انداز گفتگو نہایت شگفتہ تھا. علامہ اقبال کے معتقد دوستوں میں سے تھے اور ان کی شاعری کے بڑے دلدادہ تھے.

جنوری ۱۹۴۹ء میں جب کہ ان کی عمر ۷۲ سال تھی الہ آباد میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ دو لڑکیوں کے علاوہ ان کے تین لڑکے پرکاش نرائن (جج)، انند نرائن (آئی سی ایس)، اور ترجوگی نرائن (پروفیسر) ہیں۔

سجّاد انصاری سجاد علی نام تھا۔ اودھ کے ضلع بارہ بنکی کے مردم خیز قصبہ گدیہ میں ۱۶ مارچ ۱۸۹۴ء کو ولادت ہوئی۔ کلام مجید ختم کرنے کے بعد رواج کے مطابق گھر پر اردو اور فارسی کی تعلیم شروع ہوئی پھر عربی کی تحصیل کا آغاز کیا۔ اس کے بعد اسکول میں داخل ہوئے۔ ۱۹۱۱ء میں بارہ بنکی کے اسکول سے میٹرک کیا۔ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ سے بی اے کیا اور ۱۹۱۸ء میں علی گڑھ سے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ بارہ بنکی میں وکالت کرتے تھے۔ صرف پانچ سال گزرے تھے کہ دق کے موذی مرض میں مبتلا ہوئے۔ ہر چند کہ علاج پر پوری توجہ دی گئی لیکن حالت بگڑتی ہی چلی گئی۔ ۲۹ جولائی ۱۹۲۴ء (۵ محرم ۱۳۴۵ھ) کو اپنے آبائی قصبہ گدیہ میں انتقال کیا۔

بڑے ذہین، حاضر جواب، زندہ دل اور ظریف الطبع نوجوان تھے اردو ادب کا خاص ذوق رکھتے تھے اور کبھی کچھ شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے۔ شوخ نگاری میں بھی ان کا جواب نہ تھا۔ علی گڑھ میگزین میں چند مضامین لکھے تھے اور انہی نے اپنے لکھنے والے کو شہرت کے آسمان پر پہنچا دیا۔ یہی مضامین جو ان کے دوستوں نے ان کی وفات کے بعد "محشر خیال" کے نام سے چھپوا دیئے تھے۔ ان کی یادگار ہیں۔

سروپ پنڈت جواہر لال نہرو کی بہن تھیں۔ علی برادران نے انھیں ہر جگہ سروپ بہن یا سروپ آپا لکھا ہے۔ ان کی شادی ۱۰ مئی ۱۹۲۱ء کو الہ آباد میں رنجیت ایس پنڈت کے ساتھ ہوئی۔ اسی زمانے میں چونکہ الہ آباد میں کانگریس کا جلسہ بھی ہو رہا تھا اور تمام ہندوستان کے بڑے بڑے ہندو مسلم رہنما وہاں موجود تھے اس لیے اس شادی میں اتنے اور ایسے رہنماؤں نے شرکت کی تھی کہ شاید ہی کسی اور تقریب شادی میں جمع ہوئے ہوں گے۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی بھی شادی میں شریک ہوئے تھے۔ سروپ ان کا کنوار پنے کا نام تھا بعد میں وجے لکشمی پنڈت کے نام سے شہرت پائی۔

سروجنی نائیڈو، مسز انگریزی زبان کی بڑی شاعرہ اور عظیم خطیبہ، بلبل ہند کے لقب سے ملقب تھیں۔ ہندو مسلم اتحاد کی

پیامبر اور مسلم ثقافت کی دلدادہ۔ سروجنی فروری ۱۸۷۹ء میں حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد ڈاکٹر اگھورناتھ چٹوپادھیا ڈھاکہ کے رہنے والے تھے۔ اور ایک مدت تک نظام کالج کے پرنسپل رہے تھے۔ سروجنی نے بارہ سال کی عمر میں میٹرک کا امتحان پاس کرلیا لیکن اس کے بعد صحت کی خرابی کی وجہ سے کئی سال تک تعلیم کا سلسلہ منقطع رہا۔ ۱۸۹۵ء میں وہ مزید تعلیم کے لیے ریاست حیدرآباد کے وظیفہ پر انگلستان گئیں اور کیمبرج کے ویمنس کالج میں تعلیم پائی۔ ان کی شادی میجر نائیڈو کے ساتھ انگلستان جانے سے قبل ہی ہوگئی تھی۔ ۱۸۹۸ء میں ملک واپس آگئیں۔

سروجنی کا ذوق اگرچہ علمی و ادبی تھا لیکن انھوں نے سیاست میں بھی شروع ہی سے حصّہ لیا۔ مسز اینی بسنت کے بعد مسز سروجنی دوسری خاتون تھیں جو ۱۹۲۵ء میں کانگریس کے اجلاس کانپور کی صدر مقرر ہوئیں۔ ۱۹۳۱ء میں گاندھی جی کے ساتھ گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ تحریک آزادی کے سلسلے میں متعدد بار جیل بھی گئیں۔ انھوں نے ملک کی بہت سی تعلیمی، ثقافتی تحریکوں اور جماعتوں میں بھی حصّہ لیا۔ ملک کی آزادی کے بعد صوبہ یوپی (ہندوستان) کی گورنر مقرر ہوئیں۔ ۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو انتقال ہوا۔

سری نواس شاستری، رائٹ آنریبل

مشہور سیاسی رہنما اور مقرر تھے لیکن چونکہ عملی آدمی نہیں تھے اور معرکہ آرائی سے ان کی طبیعت کو مناسبت نہیں تھی اس لیے جب ۱۹۲۱ء میں تحریک ترکِ موالات شروع ہوئی اور گرفتاریوں کا مرحلہ سامنے آیا تو وہ خاموش ہوگئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اس پر اپنی مایوسی اور ناگواری کا اظہار کیا ہے۔ بعد میں تو وہ نہ صرف کانگریس کی سیاست سے بھی بہت پیچھے ہٹ گئے۔ دسمبر ۱۹۳۰ء میں دوسری گول میز کانفرنس کا کانگریس نے مقاطعہ کیا تھا لیکن سری نواس شاستری نے اس میں شرکت کی۔ سول نافرمانی کی تحریک سے بھی نہ صرف الگ رہے بلکہ اس میں گرفتار ہونے والوں کا انھوں نے حقارت سے ذکر کیا۔ جس کا پنڈت جی نے بُرا منایا۔

سعید احمد، ڈاکٹر

مولانا محمد علی نے محمود احمد عباسی کے نام خط میں لکھا ہے "بعض دن ایک اور سب ایڈیٹر جواب علیحدہ ہوچکے ہیں۔ لیڈر یا نوٹ لکھ دیتے ہیں۔ جعفری بیمار ہوگیا تھا تو وہی تاروں کا ترجمہ کردیتے تھے مگر اپنے صبح کے مطب کے بعد۔ اس لیے کہ ڈاکٹر بھی ہیں۔" مولوی سید رئیس احمد جعفری کے ایک فٹ نوٹ سے جو انھوں نے "سیرت محمد علی" میں لکھا ہے۔ ان کی شخصیت ظاہر

ہو گئی ہے۔ جعفری مرحوم نے لکھا ہے کہ "ہمدرد دورثانی کے ایک شریک ادارت جو بعد میں صحافت ترک کرکے پریکٹس کرنے لگے تھے"۔ ملا واحدی نے لکھا ہے کہ "ڈاکٹر سعید احمد بریلوی روزنامہ ہمدرد کے زمانے سے دلی میں تھے۔ ہمدرد کے ایڈیٹوریل اسٹاف سے تعلق تھا۔ ادبی ذوق نے ان کی ڈاکٹری کو ہمیشہ دبائے رکھا، ورنہ طبیب کچھ کم اچھے نہیں تھے۔ متعدد کتابیں لکھ گئے ہیں"۔

سلامت اللہ، مولوی مولانا سلامت اللہ فرنگی محلی، مولانا شرافت اللہ کے صاحبزادے تھے۔ مدرسہ نظامیہ فرنگی میں تحصیل علمی سے فراغت پائی اور پھر اسی مدرسہ میں مدرس مقرر ہوئے۔ مدرسہ کے دارالاقامہ کے ناظم بھی تھے۔ جنگ اٹلی وطرابلس اور جنگ بلقان کے زمانے سے ملی خدمت کے میدان میں قدم رکھا۔ ترکوں کے لیے فراہمی چندہ کی تحریک میں نیز خلافت اور ترک موالات کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انجمن موید الاسلام لکھنؤ کے شریک معتمد تھے۔ جمعیت اصلبر انجمن خدام کعبہ کے رکن، جمعیت عالیہ انجمن خدام کعبہ اودھ کے معتمد اور خلافت کمیٹی اودھ کے صدر تھے اور آخر الذکر عہدے پر تقریباً تین سال خدمت انجام دی۔ تحریک ترک موالات کے سلسلے میں ۹ دسمبر ۱۹۲۱ء کو گرفتار ہوگئے۔ عدالت سے انھیں ایک سال قید اور دو سو روپے جرمانے کی سزا ہوئی تھی لیکن تین ماہ کے بعد ہی انھیں رہائی مل گئی تھی۔ شوال ۱۳۴۶ھ/اپریل ۱۹۲۸ء میں ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں جب تذکرہ علمائے فرنگی محل زیر ترتیب تھا حیات اور فالج میں مبتلا تھے۔

سلیمان ندوی، مولانا سید سید سلیمان ندوی ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء کو دسنہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۶ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فارغ عن التحصیل ہوئے۔ علامہ شبلی کے نامور تلامذہ میں سے تھے۔ ۱۹۱۳ء میں چند ماہ ہفت روزہ الہلال کلکتہ کے سب ایڈیٹر رہے۔ پھر پونا کالج میں پروفیسر ہوگئے علامہ شبلی کے انتقال کے وقت اعظم گڈھ پہنچے۔ دارالمصنفین کو عملی شکل دی۔ اور کامل تیس سال تک وابستہ رہنے کے بعد ۱۹۴۶ء میں بھوپال کے قاضی القضاۃ اور جامعہ احمدیہ کے صدر ہوگئے۔ ۱۹۴۹ء میں پاکستان تشریف لے آئے۔ سیرت النبیؐ کے مصنف کی حیثیت سے وہ بین الاسلامی حیثیت و شہرت کے مالک تھے۔ علامہ اقبال نے انھیں علوم اسلامی کی جوئے شیر کا فرہاد کہا تھا۔ جمعیت علمائے ہند کی سیاست

سے متفق تھے لیکن انھیں مولانا محمد علی کا اعتماد بھی حاصل رہا۔ وہ سیاسی نہیں علمی شخصیت تھے۔ ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی کے ساتھ وفد خلافت کے ممبر کی حیثیت سے انگلستان گئے۔

۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۶ء میں مجلس خلافت کے وفود میں شریک ہو کر حجاز تشریف لے گئے۔ ۱۹۳۳ء میں علامہ اقبال اور سر راس مسعود کے ساتھ افغانستان کا سفر کیا ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو بعد نماز مغرب کراچی میں انتقال ہوا۔ اسلامیہ گورنمنٹ کالج کے احاطے میں ان کی پختہ قبر ہے۔ ان کی تصانیف میں سیرت النبیؐ (جلد ۳ تا ۶) ارض القرآن (دو جلد) سیرت عائشہ، خیام، حیات شبلی، خطبات مدراس، عرب و ہند کے تعلقات، عربوں کی جہاز رانی وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

سر سیّد احمد خاں ۱۸۱۷ء میں بمقام دہلی مغلیہ دربار کے ایک متوسل خاندان میں پیدا ہوئے۔ رواج کے مطابق اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ کسی مدرسے اور اسکول میں نہیں پڑھا۔ ان کے اساتذہ میں کوئی اتنی بڑی شخصیت نہیں جن سے سر سیّد پہچانے جائیں۔ انھوں نے جو کچھ حاصل کیا اپنی محنت سے حاصل کیا۔ وہ بنیادی طور پر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے خانوادہ علمی کے ایک فرد تھے لیکن انھوں نے شاہ صاحب کے افکار اور ان کے اخلاف کی رائے اور عمل پر اکتفا نہیں کیا اور اپنی راہ خود نکالی۔ سر سیّد کی شخصیت جن عقائد و افکار، اعمال و سیرت اور خدمات کی بنا پر تعمیر ہوئی اور جانی پہچانی گئی۔ اس کا تمام سر و سامان ان کا اپنا مہیا کردہ تھا۔

ان کے فکر و عمل نے ہندوستان کے مسلمانوں کی علمی، فکری اور تعلیمی و تہذیبی زندگی کے ہر پہلو اور حیات ملّی کے ہر گوشہ کو متاثر کیا۔ سائنٹفک سوسائٹی، مدرستہ العلوم علی گڈھ اور آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام اور تعمیر و ترقی، تہذیب الاخلاق اور سائنٹفک گزٹ کا اجراء اور آثار الصنادید، خطبات احمدیہ وغیرہ ان کی عملی و علمی زندگی کے جلی عنوان ہیں۔ ۱۸۹۸ء میں علی گڈھ میں انتقال ہوا۔

شاہد مولانا شوکت علی کے صاحبزادے، نوجوانی میں ۱۹۲۶ء کے وسط میں انتقال ہوا۔ مولانا محمد علی اس وقت شملہ میں اسمبلی کے اجلاس کے موقع پر یونٹی کانفرنس اور ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں میں مصروف تھے۔ شاہد کی

خواہش تھی کہ آخری وقت میں چچا کا دیدار کرلے لیکن چچا کے پیروں میں قومی خدمت گزاری کے جذبے نے ایسی زنجیر ڈال رکھی تھی کہ اس سے آزاد نہ ہوسکے اور نماز جنازہ و تجہیز و تکفین میں شرکت نہ کرسکے۔

شاہد حسین، آنریبل یو پی کے ایک سرکار پرست۔ حکومت کی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ مسلمانوں کا جو وفد اگست ۱۹۱۳ء میں مچھلی بازار کان پور کی مسجد کے سلسلے میں یو پی کے گورنر سر جیمس مسٹن سے ملا تھا۔ اس کے ایک رکن یہ بھی تھے۔

شریف شرف عدنان حجاز کے مشہور عالم دین تھے۔ ۱۹۲۶ء میں شاہ عبدالعزیز ابن سعود نے جو موتمر عالم اسلامی منعقد کی تھی، اس کے رئیس یہی بزرگ تھے۔ اور موتمر نے مختلف امور پر غور کرنے کے لیے جو کمیٹی "لجنۃ اقتراحات" کے نام سے بنائی تھی اس میں رئیس موتمر کی حیثیت کے علاوہ حجاز کے نمائندے کی حیثیت سے بھی شامل تھے۔ "لجنۃ اقتراحات" میں ہندوستانی نمائندوں میں مجلس خلافت کی طرف سے مولانا محمد علی، جمعیت علمائے ہند کے نمائندگان کی حیثیت سے مولانا مفتی محمد کفایت اللہ شاہجہان پوری ثم دہلوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی اور جماعت اہل حدیث کی طرف سے مولانا ثناء اللہ شامل تھے۔

شعیب قریشی، محمد ۶ ستمبر ۱۹۰۴ء کو جونپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی۔ بی اے الہ آباد یونی ورسٹی سے اور ایل ایل بی علی گڑھ سے کیا۔ پھر بیرسٹری کی تعلیم کے لیے لندن گئے۔ وہاں مسلم آؤٹ لک کی ادارت میں شریک رہے۔ ہندوستان واپس آکر قوم وملت کی خدمت میں سرگرم ہوگئے۔ ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان کے زمانے میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے ساتھ طبی وفد میں شامل ہو کر ترکی گئے۔ ۱۹۱۷ء میں راجہ غلام حسین کے انتقال کے بعد انھیں نیو ایرا (لکھنؤ) کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ ۱۹۲۲ء میں گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد ینگ انڈیا (احمد آباد) کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔

۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۶ء کے وفود خلافت برائے حجاز میں سکرٹیری کی حیثیت سے شامل تھے۔ خلافت کمیٹی کے سکرٹیری مدت تک رہے تھے کانگریس کے جنرل سکرٹری بھی رہ چکے تھے اور ملک کی آزادی کی خاطر تین سال جیل بھی کاٹ چکے تھے۔

۱۹۲۸ء میں آئین ہند کی تدوین کے لیے جو کمیٹی تشکیل دی گئی تھی اس کے ایک رکن شعیب بھی تھے۔ ۱۹۲۹ء میں ریاست بھوپال کے مشیر المہام ہو گئے، اور سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ پھر پاکستان کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تقسیم ملک کے بعد پاکستان کی مرکزی حکومت کی وزارت میں لے لیے گئے۔ پھر روس اور عراق میں پاکستان کے سفیر رہے۔ ۱۹۵۲ء میں انھیں ہندوستان میں پاکستان کا ہائی کمشنر مقرر کیا گیا۔

ایوب خاں کے عہد میں انھیں پھر وزارت میں لے لیا گیا اور وزارت خزانہ کا قلمدان سپرد ہوا۔ معاشیات میں بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے۔ عالمی بنک کے اپنی وفات تک ۲۴ سال مشیر رہے۔

زندگی کے آخری ایام گمنامی و گوشہ نشینی میں بسر کیے۔ آنتوں کے سرطان میں مبتلا ہو کر ۲۵ فروری ۱۹۶۲ء کو کراچی میں انتقال کیا۔ مرحوم انگریزی زبان میں تحریر و تقریر کی قابلیت اور اپنی ذہانت کے لیے اپنے تمام معاصرین میں ممتاز تھے۔ نہایت با اخلاق، وضع دار، نیک خصلت اور نماز روزے کے پابند تھے۔

مولانا محمد علی کے نہ صرف مخلصین میں تھے بلکہ ان کے اخلاص و محبت، اور نیکی و شرافت نے مولانا کے دل و جگر کے ٹکڑے کو ان سے حاصل کر لیا تھا۔ مولانا کی چھوٹی صاحبزادی گلنار کی شادی ۱۹۳۰ء میں بمقام دہلی ان سے ہوئی۔ ان کے اخلاف میں دو لڑکے اور پانچ لڑکیاں ہیں۔

شفیع، سر میاں محمد

پنجاب کے مشہور سیاسی رہنما، قانون دان اور ماہر تعلیم سر میاں محمد شفیع ۱۰ مارچ ۱۸۶۹ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ میاں دین محمد آف باغبان پورہ کے بیٹے تھے۔ ایف سی کالج لاہور سے انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد انگلستان گئے۔ قانون کی ڈگری لے کر وطن واپس ہوئے۔ ابتداً ہوشیارپور میں وکالت شروع کی۔ ۱۸۹۵ء میں لاہور آ گئے اور یہاں وکالت شروع کی۔

سیاسی، سماجی اور تعلیمی مسائل سے دلچسپی انھیں زمانہ طالب علمی سے تھی۔ انجمن اسلامیان ہند (لندن برانچ)، بیڈنگٹن پارلیمنٹ لندن (ایک سوسائٹی) کے رکن بنے۔ ہوشیارپور میں بھی مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی دور کرنے اور سماجی اصلاح کی کوششوں میں مصروف رہے۔ لاہور منتقل ہونے کے بعد ان کے سامنے زیادہ وسیع میدان

تھا۔ پنجاب میں مسلم لیگ کی برانچ قائم کرنے والوں میں تھے۔ پنجاب برانچ کے پہلے سکریٹری بھی وہی مقرر ہوئے۔ اس طرح ان کا تعلق پنجاب کی سیاسیات سے گزر کر کل ہند سیاست سے ہو گیا۔ ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس لکھنؤ کے وہ صدر مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۶ء میں انھوں نے پنجاب لیگ کی سکریٹری شپ سے استعفیٰ دے دیا اور آل انڈیا مسلم ایسوسی ایشن کے نام سے اپنی ایک جماعت قائم کر لی جس کے پہلے جنرل سکریٹری بھی وہی تھے۔ وہ متعدد بار پنجاب پراونشل کونسل، وائسرائے کی کونسل اور مرکزی اسمبلی کے ممبر مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۷ء میں انھیں مسلم لیگ کا صدر چنا گیا۔ ۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن کی آمد کے موقع پر وہ ملک کی اکثریت کے جوش و جذبات کا ساتھ نہ دے سکے اور کمیشن کے بائیکاٹ میں حصہ نہیں لیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے قائداعظم سے اختلاف کیا اور لیگ جناح لیگ اور شفیع لیگ کے نام سے دو دھڑوں میں بٹ گئی۔ قائداعظم نے انھیں پنجاب و بنگال کے ان ٹوڈیوں میں شمار کیا تھا جو حکومت کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے مل گئے تھے لیکن ۱۹۲۹ء میں یہ اختلاف ختم ہو گیا۔ ۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے اور مسلمانوں کے مطالبات کی نہایت عمدہ طور پر نمائندگی۔ ان کی اصابت رائے اور معقول رویے سے مولانا محمد علی جوہر بہت متاثر ہوئے۔ اس سے پہلے سائمن کمیشن کی آمد کے موقع پر مولانا محمد علی انھیں پنجاب کے کسی مقام پر بھی مسلمانوں کے جلسۂ عام میں مقابلے اور مناظرے کا چیلنج دے چکے تھے۔ ۷؍ جنوری ۱۹۳۲ء کو انتقال ہوا۔

شفیع داؤدی، مولانا حاجی

مظفرپور (بہار) کے رہنے والے مشہور ایڈوکیٹ تحریک خلافت اور ترک موالات کے نامور رہنما، بہار خلافت کمیٹی کے صدر بھی رہے تھے۔ مجلس احرار اسلام بہار کے رکن رکین تھے۔ مولانا غلام رسول مہر نے انھیں "مخلص خادم اسلام" لکھا ہے اور لکھا ہے کہ .....
"بلا شائبہ مبالغہ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ان کا ہر لمحہ تنظیم و تحفظ ملت میں بسر ہوا۔"
مولانا عبدالماجد دریا بادی نے لکھا ہے "مولوی حاجی محمد شفیع داؤدی مظفرپوری ...... ایک زمانہ میں اپنے صوبہ کے نامور ایڈوکیٹ تھے۔ اب وہ کامیاب وکالت چھوڑ چھاڑ، نیم فقیرانہ لباس اختیار کر کے اپنے آپ کو خلافت کمیٹی اور دوسری ملی تحریکوں کے لیے وقف کیے ہوئے تھے اور علی برادران کے خاص الخاص مخلصوں میں تھے۔" ان کے اخلاف اور خاندان کے متعدد افراد کراچی میں ہیں۔

شوق، احمد علی مولانا محمد علی کے خط میں ان کا ذکر "احمد علی" کے نام سے آیا ہے۔ مولانا کے چچا زاد بھائی تھے۔ یہ وہی احمد علی شوق ہیں جو رضا لائبریری رام پور کے ناظم تھے۔ متعدد علمی، تاریخی کتابوں کے مترجم اور تذکرہ کاملان رام پور کے مولف کی حیثیت سے علمی دنیا میں شہرت حاصل کی۔ نہایت با اخلاق، با مروّت، علم دوست اور صاحب کمال شخص تھے۔ اور قلمی اور نادر کتابوں کے خاص ماہر تھے۔ اوائل رمضان المبارک ۱۳۵۲ھ/دسمبر ۱۹۳۳ء میں رام پور میں انتقال کیا۔ ان کی عمر کا اندازہ مولانا سید سلیمان ندوی نے پینسٹھ اور ستر سال کے درمیان کیا ہے۔

شوکت علی، مولانا علی گڈھ کے نامور فرزند، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، کانگریس مجلس خلافت اور مسلم لیگ کے مشہور رہنما، انجمن خدام کعبہ کے جنرل سکریٹری، سراپا حرکت و عمل اور بے پناہ عملی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ مولانا محمد علی کے بڑے بھائی تھے۔ اگرچہ علم وفضل و ذہانت میں ان کا درجہ محمد علی کے برابر نہ تھا لیکن عملی صلاحیتوں نے ان کی اس کمی کو پورا کر دیا تھا۔ بلند پایہ مقرر اور صحافی تھے۔ خدام کعبہ کے نام سے ایک ماہوار رسالہ نکالا تھا اور روزنامہ خلافت بمبئی کے بھی بانی تھے۔ عملی زندگی کا آغاز سرکاری ملازمت سے کیا تھا۔ کچھ عرصہ آغاخاں کے سکریٹری بھی رہے۔ ملک و ملت کی خدمت اور تحریک آزادی کی بدولت نظربندی اور قید کی زندگی بھی گزارنی پڑی۔ ۲۸ نومبر ۱۹۳۸ء کو دہلی میں انتقال ہوا اور سرمد شہید کے مزار سے آگے جامع مسجد کے سامنے میدان کے ایک گوشے میں دفن ہیں۔

طارق علی ناہد و زہرہ کے بیٹے، بسم اللہ خوانی کی رسم ۶ مئی ۱۹۲۸ء کو مولانا محمد علی کی منجھلی بیٹی حمیدہ بانو کی شادی کے موقع پر ادا ہوئی۔ ۹ مئی کے ہمدرد میں حمیدہ کے عقد و رخصتی کی خبر میں یہ بھی درج ہے "۶ مئی کی سہ پہر کو اوّلاً طارق سلمہٗ کی جو مولانا شوکت علی کا پوتا اور مولانا محمد علی کا نواسہ ہے بسم اللہ خوانی کی رسم حکیم جمیل خاں صاحب خلف الصدق حکیم اجمل خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ادا کی"۔ محمد علی نے ایک شعر میں بھی طارق کا ذکر کیا ہے۔

طارق اچھا رہے یارب، کہ یہ ہے
مری اولاد مرے بھائی کی

آج کل کراچی میں مع اہل و عیال مقیم ہیں۔

ظفر علی خاں، ظفر الملّت والدین، مولانا

ہندوستان پاکستان کے مشہور صحافی بدیہہ گو شاعر، بے نظیر مترجم اور شعلہ بیاں مقرر تھے۔ وزیرآباد (پنجاب) میں اپنے آبائی گاؤں کرم آباد میں ۱۲۹۰ھ ۷۳-۱۸۷۲ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کے مراحل وزیرآباد، پٹیالہ اور علی گڑھ میں طے کیے۔ علی گڑھ سے بی اے پاس کرکے حیدرآباد دکن میں ملازمت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ حیدرآباد میں ۱۲، ۱۳ سال قیام رہا۔ لیکن میر عثمان علی خاں کو انگریزوں کے خلاف بھڑکانے کے جرم میں ریاست بدر ہونا پڑا۔ کچھ عرصہ بمبئی میں ادبی مشاغل میں گزارا۔

۱۹۱۹ء میں والد کے انتقال کے بعد زمیندار کو ہاتھ میں لیا اور لاہور سے نکالنا شروع کیا۔ سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۱۰ء سے ہو چکا تھا۔ تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، تحریک سعودی (سلطان عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن کی تحریک جس کا مقصد حجاز کو شریفی اقتدار و اثرات سے پاک کرنا تھا) تحریک مسجد شہید گنج اور جماعتوں میں مجلس خلافت، کانگریس، احرار، اتحاد ملت، مسلم لیگ میں سرگرم حصّہ لیا محمد علی سے معاصرانہ چشمک جاری رہتی تھی۔ ظفر علی کے عقیدت مند انھیں ظفر الملّت والدین کہتے تھے اور یہی خطاب ان کے اخبار میں لکھا جاتا تھا۔ محمد علی نے انھیں طنزاً ظفر الملّت والدین لکھا ہے۔ ان کا تعلق بقول محمد علی "پنجابی ٹولہ" سے تھا۔ عقیدۃً اہل حدیث تھے اس لیے ابن سعود کی شخصیت میں ان کے لیے زیادہ کشش تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کے زیادہ قریبی تعلقات تھے اور یہی محمد علی سے وجہ نزاع تھی۔ اخلاق و سیرت اور علم و فضل کی بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان کے بارے میں لکھا ہے۔

> "ایک زمانہ میں حرکت مجسم، شعلۂ جوالہ تھے۔ تحریر و تقریر دونوں میں ایک شیر زبان یا اژدر دہاں توپ تھے۔ ۱۹۱۱ء، ۱۹۱۲ء سے جو جوش پھیلا اس کے ایک اہم عنصر یہی تھے۔ بڑے پختہ مسلمان اور رسول اکرم صلعم کے تو گویا عاشق زار تھے۔ شاعر اور بڑے برجستہ گو شاعر تھے۔ نعتیہ نظمیں بھی بہت سی کہہ ڈالیں۔ مولانا شوکت علی کے ساتھ کے اور علی گڑھ کے پڑھے ہوئے تھے۔ اب مدت سے خاموش محفل اور گوشہ نشین تھے۔ شعلہ خاکستر بن چکا تھا۔

۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء کو کرم آباد میں انتقال ہوا۔ اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔

عابد عابد علی مولانا شوکت علی کے بیٹے۔ مولانا شوکت علی نے انھیں بڑے ارمانوں کے ساتھ فرنگی محل میں رکھ کر قرآن مجید حفظ کرایا تھا۔ مولانا صبغت اللہ شہید نے لکھا ہے کہ یہ بنگال میں مشغول کاروبار ہیں اور دنیا سے الگ زندگی بسر کرتے ہیں۔"

بڑے بھائی زاہد علی کے انتقال کے بعد خلافت بمبئی کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اور مستقل طور پر بمبئی میں سکونت پذیر ہیں۔

عارف مراد عارف ہسوی ہیں۔ فتح پور ہسوہ کے رہنے والے تھے۔ نہایت اچھے شاعر اور ادیب تھے۔ رسالہ خطیب دہلی از اجرا، ۱۹۱۴ء، میں لکھنا شروع کیا۔ ۱۹۱۸ء میں ہفت روزہ انقلاب دہلی ان کی ادارت میں نکلا۔ اگرچہ فقط تین مہینے زندہ رہا لیکن صحافت میں انقلاب برپا کردیا۔ امرتسر میں جلیانوالہ باغ کا حادثہ پیش آیا تو انقلاب کا داخلہ پنجاب میں بند ہوگیا اور اسی وجہ سے پرچہ اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ محمد علی نے ہمدرد دہلی سے دوبارہ نکالا تو اس کے سب ایڈیٹر بن گئے اور بقول ملا واحدی مرحوم کے لکھنا اور جیل جانا ان کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔ بڑے پکے کانگریسی تھے۔ ملّا واحدی لکھتے ہیں۔

"عارف صاحب ایسے آدمی تھے کہ ہندوستان میں اگر ایک ہندو اور ایک مسلمان بھی انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کا خواہاں نہ رہتا تو بھی وہ انگریز حکومت کے خلاف ہی رہتے۔ عارف صاحب ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے اور کسی قیمت پر اتحاد کو توڑنا پسند نہیں کرتے تھے اور اتحاد توڑنے والے ہندو مسلمانوں کو انگریزوں کا گوگا سمجھتے تھے۔"

واحدی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ۔

"ایک دن کہنے لگے۔ کانگریس سے مولانا محمد علی کے الگ ہو جانے کا مسلمانوں پر اتنا خراب اثر پڑا ہے کہ وہ مجھ تک کو مسلمان نہیں سمجھتے۔ مگر میں آپ کو گواہ کرتا ہوں کہ میں مسلمان مر رہا ہوں۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ عارف صاحب دلی صوبہ کانگریس کمیٹی کے صدر تھے۔

پان کثرت سے کھاتے تھے اور اسی وجہ سے ان کے گلے میں کینسر ہوگیا تھا۔ آخر دسمبر ۱۹۳۵ء یا شروع جنوری ۱۹۳۶ء میں دہلی میں ملا واحدی کے مکان پر انتقال ہوا۔ ہسوہ میں ان کے عزیزوں اور دوستوں نے ان کی یاد میں "عارف نیشنل لائبریری" قائم کر رکھی ہے۔

عبدالباری فرنگی محلی، مولانا قیام الدین

۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد اپنے وقت کے نامور عالم دین مولانا عبدالوہاب تھے۔ مدرسہ نظامیہ فرنگی محل سے فراغت کے بعد حجاز اور شام کا تعلیمی سفر کیا اور بڑے بڑے علما سے استفادہ کیا اور حدیث کی سند حاصل کی۔ تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیا۔ مجلس خلافت، جمعیت علمائے ہند اور انجمن خدام کعبہ کی تاسیس میں حصہ لیا۔ انجمن خدام کعبہ کے خادم الخدام (صدر) تھے۔ ۱۹۱۹ء میں جمعیت کا تاریخی اجلاس امرتسر مولانا ہی کی صدارت میں ہوا تھا۔ مذہبی و سیاسی رہنما ہونے کے علاوہ وہ ایک بلندپایہ مدرس اور کثیرالتصانیف مصنف بھی تھے۔ انھوں نے درس نظامی کی متعدد کتب پر حواشی بھی تحریر فرمائے۔ ۱۹ جنوری ۱۹۲۶ء کو لکھنؤ میں انتقال فرمایا اور خاندانی قبرستان "باغ ملا انوار" میں تدفین عمل میں آئی۔

مولانا محمد علی کے ان سے نہایت عقیدت مندانہ تعلقات تھے۔ علی برادران کے وہ شیخ طریقت بھی تھے۔ دونوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور انھوں نے علی برادران کو مدرسہ نظامیہ فرنگی محل کی جانب سے "مولانا" کے خطاب بھی دلوائے تھے۔ ان روابط عقیدت و نیاز کے باوجود مسئلہ حجاز میں محمد علی کی روش ان کی رائے اور فکر کے خلاف تھی۔ لیکن مولانا محمد علی کی عقیدت میں اس سے فرق نہیں پڑا۔ مرحوم کے انتقال کے بعد فرنگی محل سے مولانا محمد علی کے تعلقات استوار ہو گئے تھے۔

عبدالرحمان، ڈاکٹر

ڈاکٹر انصاری کے بعد دہلی کے سب سے مشہور اور نامور طبیب جو بعد میں نواب صاحب بھوپال کے طبی مشیر ہوگئے تھے۔ مولانا محمد علی کے بے تکلف دوستوں میں سے تھے۔ ۲۲ جون ۱۹۲۷ء کے ہمدرد میں ایک خبر شائع ہوئی ہے کہ ڈاکٹر سید عبدالرحمان جو ایک عرصہ سے دہلی میں اپنے مطب کے ذریعے سے اہل دہلی کی خدمت کر رہے تھے ہز ہائینس سکندر

صولت نواب حمید اللہ خاں صاحب بالقابہم والیٔ بھوپال کے اسٹاف سرجن ہو کر عن قریب دہلی سے بھوپال تشریف لے جانے والے ہیں۔ ان کو ۲۱؍جون کو معززین اور ہندو مسلمان احباب دہلی کی طرف سے ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے مکان پر الوداعی پارٹی کے طور پر چائے نوشی کی دعوت دی گئی۔

عبدالرحمان صدیقی اصلاً سورت کے رہنے والے تھے لیکن ان کے ماموں علی محمد خاں دہلوی حیدرآباد (سندھ) میں قانون کی پریکٹس کرتے تھے اور عبدالرحمان تعلیم کے سلسلے میں ایک عرصہ تک ان کے ساتھ حیدرآباد میں رہ چکے تھے اس لیے سندھی مشہور ہو گئے تھے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ مرحوم اپنے زمانے کے بڑے نامور اور بڑے تیز و طرار علی گڑھی تھے۔ اور اس وقت عبدالرحمان سندھی کے نام سے مشہور تھے۔ بی اے کرنے کے بعد ہی مولانا محمد علی کے کامریڈ (کلکتہ اور پھر دہلی) کے منیجر ہو گئے اور اسی زمانے میں جب جنگ بلقان میں ڈاکٹر انصاری کا مشہور طبی مشن ترکی جانے لگا تو اس میں نہ صرف سرگرمی کے ساتھ شریک ہوئے بلکہ اس وفد کے منیجر بھی مقرر ہوئے اور بعد میں اپنے حسن خدمات کے صلہ میں تمغہ مجیدیہ سلطان کے ہاں سے حاصل کیا۔ واپس آکر ایک بار پھر طالب علمی اختیار کی اور علی گڑھ سے ایم اے اور ایل ایل بی دونوں ایک ساتھ کیے۔ ۱۹۱۹ء میں آکسفورڈ جاکر ڈی فل کی تیاری شروع کی اتنے میں تحریک ترک موالات و خلافت زور پکڑ گئی اور ۱۹۲۱ء میں ہندوستان واپس آگئے۔ پیشہ بجائے بیرسٹری کے تجارت اختیار کیا اور کلکتہ میں ان کا شمار بڑے کاروباری لوگوں میں ہونے لگا۔ بنگال اسمبلی کے ممبر ہوئے۔ کلکتہ کے میئر ہوئے۔ اور اپنا انگریزی روزنامہ مارننگ نیوز نکالا۔ ملت کی خدمت ہر ممکن طریقے سے اخلاص و دیانت کے ساتھ کرتے رہے اور پاکستان بنوانے میں سرگرمی سے ساعی رہے۔ ۱۹۵۲ء میں کچھ دن مشرقی پاکستان میں گورنر بھی رہے۔

وہ ایسٹرن یونین فیڈرل انشورنس کمپنی کے مینجنگ ڈائرکٹر بھی رہے تھے۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کی مجلس نظما کے رکن تھے۔ ۲۴؍مئی ۱۹۵۳ء کو کراچی میں طویل علالت کے بعد انتقال کیا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ "وہ راست گوئی، اخلاقی جرأت، بے باکی و آزادی میں نیک نام نہیں بدنام تھا۔۔۔

اس نے ہر جگہ سچ کی حمایت اور آزادی کی تائید کی۔ وہ نہایت قابل شخص تھا، علم کا شائق اور علم دوست تھا۔ اس کی معلومات کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ وہ بڑا پُر اثر اور پُر جوش مقرر تھا اس کی تحریر شگفتہ اور پر زور ہوتی تھی۔ وہ غریبوں کا ہمدرد تھا۔ اس پر خدا کی رحمت ہو کہ اس نے بہتوں کا ساتھ دیا۔ بہتوں کے بگڑے کام بنائے اور بہتوں کی دوستی کا حق ادا کیا۔"

عبدالرحمٰن صدیقی مولانا محمد علی کے بے انتہا دوست اور مخلص تھے۔

عبدالرحیم، سر

بہار کے مشہور سیاسی اور سماجی رہنما اور ماہر قانون تھے ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے۔ مدنا پور ہائی اسکول سے میٹرک اور پریسیڈنسی کالج کلکتہ سے بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں اور انگلستان جاکر قانون کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۰۰ء میں کلکتہ میں پریکٹس شروع کی۔ ڈپٹی لیگل اور پریسیڈنسی مجسٹریٹ کلکتہ، مدراس ہائی کورٹ کے جج، پبلک سروس کمیشن کے ممبر اور دو مرتبہ مدراس ہائی کورٹ کے قائم مقام چیف جسٹس مقرر کیے گئے۔

سیاسی و تعلیمی تحریکات سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ۱۹۰۶ء کے آل انڈیا ڈیپوٹیشن میں شریک تھے جو لارڈ منٹو سے ملا تھا۔ مسلم لیگ کے احیاء میں حصہ لیا۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ اور مجلس العلماء تبعور کے اجلاسوں کی استقبالیہ کمیٹیوں کی صدارت کے علاوہ دو مرتبہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں کی صدارت کی۔

کراچی میں وفات پائی۔

عبدالرؤف داناپوری، مولانا ابوالبرکات

ممتاز طبیب، مشہور عالم دین خوش بیان خطیب، اور بلند پایہ مصنف مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف داناپور (نزد پٹنہ، صوبہ بہار) میں تقریباً ۱۸۷۴ء میں پیدا ہوئے۔ علوم دینیہ میں پوری دسترس رکھتے تھے، اور زمانہ کی ضروریات اور عصری خیالات و افکار سے پوری طرح باخبر تھے۔ ایک مدت سے طبیب کی حیثیت سے کلکتہ میں مقیم تھے اور گویا کہ کلکتہ ان کا وطن ثانی بن گیا تھا۔ سیاست کا ذوق رکھتے تھے۔ تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات میں حصہ لے چکے تھے۔ سیاسی مسلک کے لحاظ سے جمعیت علمائے ہند کے ساتھ تھے اور اس کے بعض صوبائی اور مقامی جلسوں کی صدارت بھی کر چکے تھے۔ آخر میں وہ مسلم لیگ سے متاثر ہو گئے تھے اور جمعیت علمائے اسلام میں شرکت اختیار کر لی تھی۔

مولانا عبدالرؤف داناپوری سیاسی ذوق رکھنے اور بلند پایہ طبیب ہونے کے علاوہ اعلیٰ پائے کے مصنّف بھی تھے۔ ان کی تصنیفات میں سب سے اہم کتاب "اصح السیر فی ہدیٰ خیر البشر صلّی اللہ علیہ وسلّم" ہے جس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا۔ مرحوم متواضع، سادہ مزاج اور خلیق شخص تھے۔ تقریباً ۷۴ سال کی عمر میں ۲۰ر فروری ۱۹۴۸ء کو کلکتہ میں انتقال ہوا اور بقول سید سلیمان ندوی "کلکتہ کی سرزمین علم و عرفان کے نور سے محروم ہو گئی"۔

عبدالعلی خاں رام پور کے رہنے والے اور مولانا محمد علی کے علی گڑھ کے ساتھی بلکہ ہم وطن و ہم جماعت اور ہم پیالہ و ہم نوالہ حنیف خاں صاحب معروف بہ عمرا خاں کے صاحبزادے تھے۔ ایک مدت تک جامعہ پریس اور ہمدرد پریس کے منیجر رہے اور مدتوں ڈاکٹر انصاری کے پرائیویٹ سکریٹری رہے۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی آگئے تھے۔ ۶ر نومبر ۱۹۶۲ء کو انتقال ہوا۔ مرحوم کی خود نوشت پروفیسر محمد ایوب قادری نے مرتب کر کے روزنامہ جنگ کراچی و راولپنڈی ۹ر جون تا ۳۰ر جون ۱۹۶۴ء میں متعدد قسطوں میں چھاپ دی ہے۔

عبدالقادر، مولانا قصور ضلع لاہور کے مشہور اہلِ حدیث، سیاسی رہنما اور کامیاب وکیل تھے۔ خلافت، ترک موالات، جہاد، ہجرت، نظم جماعت کی تحریکات کے پنجاب میں خاص رکن تھے۔ مسئلہ حجاز میں نہایت سرگرمی سے حصّہ لیا اور ۱۹۲۴ء کے وفد خلافت میں شریک ہو کر حجاز گئے ۱۹۲۶ء کی موتمر مکہ معظمہ میں شاہ عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن آل السعود کی دعوت پر جماعت اہل حدیث کے وفد میں شریک ہو کر حجاز گئے۔ مجلس احرار اسلام کے بانیوں میں سے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی مولوی عبداللہ اور مولانا قصوری کے ابنائے سعید مولوی محی الدین اور مولوی محمد علی نے بھی قومی اور ملّی تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ اسی بنا پر مولانا ابوالکلام آزاد نے ان کے خاندان کو "خاندان سعادت قصور" لکھا ہے۔

نہایت دین دار، متواضع، ملنسار، مخیر، کشادہ دست اور فراخ قلب شخص تھے۔ تحریک خلافت اور مسئلہ حجاز میں ان کا تعلق اس جماعت سے تھا۔ جنھیں مولانا محمد علی جوہر "پنجابی ٹولی" کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ان خطوط میں بھی

ایک آدھ جگہ اس پنجابی قول کا ذکر خیر آیا ہے۔ دسمبر ۱۹۴۲ء میں جب کہ ان کی عمر تقریباً اسّی سال کی تھی۔ دل کے درد سے لاہور میں انتقال فرمایا نعش کو تصور لے جاکر دفن کیا گیا۔

عبدالقیوم، نواب سر ۱۸۶۴ء میں موضع ٹوپی تحصیل صوابی ضلع مردان میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام صاحبزادہ عبدالرؤف تھا۔ ایڈورڈ ہائی اسکول پشاور سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور پٹواری کی حیثیت سے سرکاری ملازم ہوگئے اور رفتہ رفتہ اپنے حسن کارکردگی کی بنا پر گرداور، پھر نائب تحصیل دار ہوگئے۔ ۱۸۹۴ء میں وہ اسسٹنٹ پولٹیکل ایجنٹ اور بالآخر پولٹیکل ایجنٹ بنا دیے گئے۔ ۱۹۱۹ء میں وہ اس عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے۔ ان کے ایک مصنف کے بقول "ان تین نمایاں شخصیتوں میں سے جنھوں نے صوبہ سرحد میں انگریزی حکومت کی ملکی تدابیر اور اقدامات کو کامیاب بنانے میں غیر معمولی خدمات انجام دیں، ایک صاحبزادہ عبدالقیوم تھے"...... انگریزی حکومت کی خدمات کے صلے میں صاحبزادہ صاحب کو ۱۸۹۸ء میں خان بہادر، ۱۹۰۸ء میں سی آئی ای، ۱۹۱۵ء میں نواب، اور ۱۹۱۷ء میں سر (کے سی آئی ای) کے خطابات ملے۔ ۱۹۲۹ء میں انھیں قیصر ہند گولڈ میڈل ملا۔ تعلیم کے فروغ و اشاعت سے انھیں خاص دلچسپی تھی۔ ان کے ایک اور تذکرہ نگار حافظ عبدالقدوس نے لکھا ہے کہ ان کی شخصیت کے نمایاں پہلو تعلیمی میدان میں ان کی خدمات ہیں جن کی بدولت وہ سرحد کے "سرسید" کہلائے۔ ۱۹۱۳ء میں اسلامیہ کالج پشاور انہی کی کوششوں سے قائم ہوا۔ وہ اس وقت سے وفات تک کالج کونسل کے آنریری سکریٹری رہے۔ ۱۹۲۵ء میں وہ ایجوکیشنل کانفرنس اجلاس علی گڑھ کے صدر مقرر ہوئے تھے۔ ۱۹۳۲ء کی سرحد میں اصلاحات کے بعد وہ سرحد کے وزیراعلیٰ بھی رہ چکے تھے۔ صوبہ سرحد کی اس ممتاز شخصیت کا انتقال ان کے گاؤں ٹوپی میں تہتر برس کی عمر میں نومبر ۱۹۳۷ء میں ہوا۔

عبدالماجد دریابادی، مولانا ہندوستان پاکستان کے مشہور ادیب، انشا پرداز، صحافی اور مفسر قرآن مولانا عبدالماجد ۱۳ مارچ ۱۸۹۲ء کو دریاباد ضلع بارہ بنکی (اودھ) میں پیدا ہوئے والد مولوی عبدالقادر ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ان کے دادا مفتی مظہر کریم جنگ آزادی

کے رہنماؤں میں سے تھے جنھیں کالے پانی بھیج دیا گیا تھا۔ مولانا دریابادی نے میٹرک سیتاپور سے اور انٹر اور بی اے کیننگ کالج لکھنؤ سے کیا۔ تحریر و مطالعہ کا شوق بچپن سے تھا۔ ملک کے مشہور رسائل میں لکھا۔ ہمدرد دہلی کی نگرانی کی۔ معارف، اعظم گڈھ کے ادارتی فرائض انجام دیے۔ سچ، صدق اور صدق جدید کے نام سے اپنے ہفت روزہ رسائل نکالے۔ مطالعہ نے انھیں الحاد کے دروازے تک پہنچایا لیکن سعادت ازلی نے رہنمائی کی اور پھر اسلام کی حقانیت دل میں جاگزیں ہوگئی۔ قرآن کریم کی معرکہ آرا تفسیر لکھی اور ملحد عبدالماجد سے مولانا عبدالماجد بنے۔ تحریک خلافت میں حصہ لیا۔ مولانا محمد علی جوہر کے بڑے عقیدت مند تھے۔ ادب، تصوف، تفسیر، سیرت سوانح اور مختلف موضوعات پر تقریباً پچاس کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ ۶ر جنوری ۱۹۷۷ء کو اپنے وطن مالوف دریاباد میں انتقال ہوا۔

عبدالمجید، خواجہ | علی گڈھ کے مشہور نیشلسٹ اور بیرسٹر تھے۔ کیمبرج کے تعلیم یافتہ، نہایت جری، بے خوف اور مخلص سیاست داں تھے۔ تحریک خلافت و ترک موالات میں زبردست حصہ لیا۔ جب مولانا محمد علی نے ۱۹۲۰ء میں ترک موالات کے زمانے میں یونی ورسٹی کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کے عزم کا اظہار کیا۔ تو خواجہ صاحب ان کے دست و بازو بنے ہوئے تھے۔ لیکن جب ۱۹۴۷ء کے بعد یونی ورسٹی کی ناؤ ڈگمگا رہی تھی تو وہ اس کے وجود کے تحفظ اور اس کی اسلامیت کے دفاع کے لیے سینہ سپر ہوگئے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پہلے شیخ الجامعہ مولانا محمد علی تھے لیکن جب ان کی قومی مصروفیات نے انھیں جامعہ پر توجہ سے لاچار کر دیا تو خواجہ صاحب کو شیخ الجامعہ بنایا گیا۔ اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے آنے تک انھوں نے نہایت محنت اور تن دہی سے جامعہ کی خدمت کی۔ اخیر میں مولانا محمد علی سے شدید اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔

علی گڈھ میں ان کی کوٹھی "سمیع منزل" قومی و ملی تحریکات کا مرکز تھی۔ مرحوم بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ کنبہ پروری میں بے مثال تھے۔ ۲ر دسمبر ۱۹۶۲ء کو علی گڈھ میں انتقال ہوا۔

عبدالواحد غزنوی، مولانا سید | مولانا غلام رسول مہر کے نام خط میں ایک جملہ ہے "مولانا عبدالقادر

قصوری جن کا انتخاب اہل حدیث کی طرف سے مع اسمٰعیل صاحب غزنوی اور غالباً ان کے والد کے چینیاں والی مسجد کے جلسے میں کیا گیا ہے"۔ یہاں غالباً کی ضرورت نہیں۔ اشارہ مولانا اسمٰعیل غزنوی کے والد ماجد مولانا سید عبدالواحد غزنوی کی طرف ہے جو مشہور عالم دین، ملت کے مخلص خدمت گذار، اور اس زمانہ میں اور اس کے بعد اپنی وفات تک چینیاں والی مسجد (لاہور) میں امام تھے۔ زندگی کے ساٹھ سال قرآن وحدیث کی خدمت سے معروف رہے ۱۹۲۶ء میں سلطان ابن سعود کی دعوت پر جماعت اہل حدیث کا جو وفد موتمر عالم اسلامی میں شرکت کے لیے حجاز گیا تھا اس میں مولانا عبدالواحد غزنوی بھی شامل تھے۔ حضرت مولانا اپنے زہد وورع اور علم وفضل کی وجہ سے ہر حلقے میں انتہائی عزت وتکریم کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کی صاف وسادہ زندگی اور غیرت وحمیت دینی کو دیکھ کر صحابۂ کرام کی زندگیاں آنکھوں کے سامنے آجاتی تھیں۔ اعلان حق کے معاملہ میں شمشیر برہنہ تھے اور بلا خوف لومۃ لائم سچ کا اظہار فرما دیتے تھے۔ مولانا مہر صاحب نے لکھا ہے کہ "آپ سلف صالحین کی ایک نہایت مقدس یادگار تھے"۔ سلطان عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن والیٔ نجد وحجاز سے غزنوی خاندان کے بہت قریبی تعلقات تھے۔ سلطان المعظم نے آپ کی وفات پر مولانا سید محمد اسمٰعیل غزنوی کو تعزیت کا جو خط لکھا تھا۔ اس سے مرحوم سے سلطان موصوف کے تعلق خاطر کا جو اظہار ہوتا ہے اس کی دوسری مثال شاید ہی پیش کی جاسکے۔ سلطان المعظم کا یہ تاریخی خط محفوظ کر دیا جانا نہایت مناسب ہوگا.... سلطان فرماتے ہیں۔

> "اپنے والد محترم کی وفات پر مخلصانہ تعزیت قبول کیجیے۔ اللہ تعالیٰ ان پر رحمت کا سایہ کرے۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی وناصر ہو۔ مجھے مرحوم کی جگہ اپنا شفیق سمجھیے۔ ہم اور تمام مسلمان اس حادثہ فاجعہ پر بے حد اندوہ گیں ہیں۔
>
> عبدالعزیز"

علم وعرفان کا یہ روشن آفتاب ۸۰ سال کی گردش لیل ونہار کے بعد ۲۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو امرتسر میں ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔ ان کی وصیت کے مطابق اپنے والد ماجد مولانا عبداللہ غزنویؒ اور برادر اکبر مولانا عبدالجبار غزنوی

کے پاس دفن کیا گیا۔

عبدالوہاب خاں، کنور موروثی رئیس ریاست مڈراک (ضلع علی گڑھ) و جاگیردار ٹھکانہ "جگر" ریاست جے پور۔ کنور محمد خورشید علی خاں ابن حاجی محمد عبدالواجد علی خاں کے صاحبزادے تھے۔ آٹھ واسطوں سے ان کا سلسلۂ نسب راجہ لال سنگھ ملقب بہ لال خاں مورث اعلیٰ لال خانی راجپوت خاندان سے ملتا ہے۔ درس نظامی کے فارغ التحصیل تھے۔ تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات میں شریک رہے اور بڑے ایثار سے کام لیا۔ صوبائی خلافت کمیٹی اور جمعیتہ مرکزی تبلیغ الاسلام کے بڑے سرگرم عہدے دار تھے۔ ۱۸۸۱ء میں موضع بڈھانی ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۷ء میں تقریباً چھپّن سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ کنور محمد عبدالباقی خاں (ف ۱۹۷۵ء) ان کے اکلوتے فرزند تھے۔ ایک صاحبزادی زبیدہ بیگم زوجہ کنور حبیب احمد خاں ہیں اور شیخوپورہ میں مقیم ہیں۔

عثمان مولانا محمد علی کے بھانجے اور ہمدرد کے مینجر۔ مولانا شوکت علی کی ایک صاحبزادی ان سے بیاہی تھیں۔

عدنان بے، ڈاکٹر یہ وہی ترکی نوجوان ہیں جن سے خالدہ ادیب خانم نے ۱۹۱۵ء میں دوسری شادی کی تھی۔ ترکوں کی احرار پارٹی سے تعلق رکھتے تھے اور ہمیشہ عدنان اور خالدہ خدمات ملّی میں خلوص کے ساتھ مصروف رہے۔ انھیں مصطفےٰ کمال پاشا کے دربار میں بڑا رسوخ حاصل تھا اور ایک دوبار مصطفےٰ کمال پاشا کی غیر حاضری میں انھوں نے قائم مقام صدر کے فرائض بھی انجام دیے تھے پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ انھیں اور خالدہ کو مصطفےٰ کمال پاشا سے اختلاف کے باعث وطن چھوڑنا پڑا تو پیرس میں مقیم رہے۔

عرفان، مولانا ابوالمعارف محمد مولانا عرفان ہزارہ (صوبہ سرحد) کے رہنے والے تھے۔ حافظ قرآن اور باقاعدہ عالم دین تھے۔ فلسفہ ان کا خاص موضوع تھا۔ عربی زبان پر انھیں بڑا عبور حاصل تھا تحریک خلافت و ترک موالات میں بڑی شد و مد سے حصہ لیا۔ ان کی انقلاب انگیزی اور انگریز دشمنی کی بنا پر صوبہ سرحد میں ان کا داخلہ بند کر دیا گیا تھا۔ ملک کی آزادی کے لیے سنت یوسفی پر عمل پیرا ہونے کی توفیق بھی نصیب ہوئی۔ ۱۹۲۵ء کے وفد خلافت برائے حجاز کے وہ ایک رکن تھے اور ۱۹۲۶ء میں مکہ معظمہ میں موتمر

اسلامی میں شرکت کے لیے جمعیت علمائے ہند نے جو وفد بھیجا تھا اس میں بھی شریک تھے۔ مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید دہلوی اور علی برادران سے بہت قریبی تعلقات تھے۔ ایک مرتبہ کانگریس کے ٹکٹ پر الیکشن میں کھڑے ہوگئے تھے لیکن مولانا شوکت علی کے کہنے سے الیکشن میں حصّہ نہیں لیا۔ مجلس خلافت کے نائب سکریٹری ہوگئے تھے روزنامہ خلافت بمبئی سے بھی تعلق تھا۔ اس لیے ان کا آخری دور بمبئی میں بسر ہوا۔ تمام عمر مجرد رہے اور نہایت پاک صاف زندگی گزاری۔ نسلاً پٹھان تھے اور حد درجہ غیور۔

۱۴ر اپریل ۱۹۳۹ء کو بمبئی میں اچانک انتقال ہوا۔

عزیز الدین، ڈپٹی کلکٹر، خان بہادر قاضی

قاضی صاحب ۷ر اپریل ۱۸۶۱ء کو پیدا ہوئے ۱۸۸۵ء میں یو پی کی سول سروس سے ملازمت کا آغاز کیا اور ۱۹۱۱ء میں نہایت عزت کے ساتھ ریٹائر ہوئے۔ ان کی خدمات کا شاندار دور اس کے بعد ہی شروع ہوتا ہے۔ وہ مختلف اوقات میں الہ آباد یونی ورسٹی کے فیلو، علی گڈھ مسلم یونی ورسٹی کورٹ اور دہلی یونی ورسٹی کورٹ کے ممبر، آگرہ یونی ورسٹی سینٹ کے ممبر، آگرہ کالج کے ٹرسٹی، بورڈ آف انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن راجپوتانہ اور اجمیر کے ممبر رہے تھے۔ بھارت پور ریجنسی کی کونسل کے ریونیو ممبر اور دھول پور اسٹیٹ کے جوڈیشنل منسٹر بھی رہے تھے۔ ان کی ۴۳ تصنیفات کی تعداد بھی معلوم ہوئی۔ جن میں کنگ جارج پنجم کی لائف بھی شامل ہے" ہو واز ہو" میں یہ اعتراف بھی موجود ہے کہ جنگ عظیم اول اور تحریک ترک موالات کے زمانے میں انھوں نے برٹش گورنمنٹ کی نہایت قابل قدر خدمات انجام دیں۔

۱۸ر جون ۱۹۴۰ء کو انتقال ہوا۔

عزیر گل، مولانا محمد

حضرت شیخ الہند کے تلمیذ و خادم خاص، عالم دین، مجاہد فی سبیل الحریت مولانا عزیر گل ۱۸۹۳ء کے قریب" زیارت کاکا صاحب" تحصیل نوشہرہ (ضلع پشاور) میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی محمد شاہد گل تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے علاقے کے مدارس میں حاصل کرکے عازم دیو بند ہوئے اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے تلمذ کی سعادت سے مشرف ہوئے۔ تکمیل تعلیم سے فراغت کے بعد درس

و تدریس کا شغل اختیار کیا۔ حضرت شیخ الہند نے حجاز کے لیے احرام سفر باندھا تو انھیں معیت کا شرف حاصل ہوا۔ ریشمی رومال تحریک میں مولانا عزیر گل بھی شریک تھے۔ اور جب حضرت گرفتار ہوئے تو بھی مولانا عزیر گل ابتلاء وآزمائش کے راستوں سے حضرت کے ساتھ نہایت استقلال اور ثابت قدمی کے ساتھ گذرے اور رفاقت کا حق ادا کیا۔ ۱۹۱۹ء میں رہائی کے بعد بھی حضرت کی رفاقت کو وطن کے قیام و راحت پر ترجیح دی۔ حضرت کے انتقال کے بعد بھی ان کی محبت نے حضرت کا آستانہ چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ اکثر قیام دیوبند میں رہا۔ خلافت کمیٹی دیوبند کا صدر بھی انھیں کو بنایا گیا تھا۔ معاش کے لیے ایک مختصر سا کاروبار کر لیا تھا۔ پھر کچھ عرصہ راندیرا اور رڑکی کے مدارس عربیہ میں خدمات تدریس انجام دیں۔ شروع ۱۹۴۵ء میں وہ اپنے آبائی وطن قصبہ زیارت کاکا خیل تشریف لے آئے اور ایک کچا گھر بنا کر کاشت کاری کا شغل اختیار کر لیا۔ الحمد للہ کہ مولانا عزیر گل ابھی تک حیات ہیں اور پورے برصغیر پاکستان و ہندوستان میں تحریک شیخ الہند کی واحد یادگار ہیں۔

عصمت پاشا، جنرل

۱۸۸۴ء میں سمرنا میں پیدا ہوئے۔ مختلف مدارس میں ابتدائی عام اور فوجی تعلیم حاصل کرنے کے بعد استنبول کے ملٹری کالج میں داخل ہوئے۔ یہیں پہلی بار انجمن اتحاد و ترقی کے رکن بنے۔ ۱۹۰۸ء کے انقلاب ترکی میں پیش پیش تھے۔ جنگ عظیم اول میں انور پاشا کے ماتحت کام کیا۔ قسطنطنیہ پر انگریزوں اور سمرنا پر یونانیوں کے قبضے کے بعد اناطولیہ چلے گئے۔ اور مصطفیٰ کمال پاشا نے انھیں اناطولیہ کی مغربی سپاہ کا کمانڈر بنا دیا۔ انونو کے مقام پر یونانیوں کو شکست دے کر سمرنا کو آزاد کرا لیا اور فاتح انونو کہلائے۔ اس کے بعد انونو ان کے نام کا جزو بن گیا اور عصمت انونو کہلانے لگے۔ جب مصطفیٰ کمال پاشا ترکی کے پہلے صدر بنے تو عصمت پاشا کو انھوں نے وزیر اعظم بنایا۔ عصمت پاشا کمالی حکومت کے اعیان میں سے تھے۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے نام نہاد منصب خلافت کا خاتمہ کیا تو ان کے سب سے بڑے موید عصمت پاشا تھے اسی وجہ سے مولانا محمد علی نے اتاترک کے نام کے ساتھ عصمت پاشا کا نام لیا ہے۔ اتاترک کے انتقال کے بعد عصمت پاشا ترکی کے دوسرے صدر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد زندگی کے آخر تک سیاست میں

حصہ لیتے رہے۔ ان کی ذات اور ان کے تدبر اور رہنمائی سے ترکی کو بڑا فائدہ پہنچا۔ ۱۹۷۴ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

علی امام، سر

صوبہ بہار کے مشہور سیاسی و سماجی رہنما اور کامیاب بیرسٹر۔ ۱۹۰۸ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس امرتسر کے صدر تھے۔ ۱۹۱۳ء میں جب کانپور میں مچھلی بازار کی مسجد کے ایک حصہ کے انہدام کا حادثہ پیش آیا تو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر تھے۔ حیدرآباد دکن کی صدارت عظمیٰ تک پہنچے۔ رد بیر ان کا بھی عام خطاب یافتوں اور نوابوں کی طرح انگریز پرستانہ تھا۔ لیگی بھی تھے اور کانگریس کی طرف بھی مائل تھے۔ ۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس میں برطانوی حکومت نے انھیں بھی بھیجنا چاہا تو انقلاب لاہور نے ایک سخت اداریہ لکھا اور اس میں بتایا کہ وہ گزشتہ تین سال سے مسلمانوں اور ان کے اعلان کردہ مقاصد سے کھلم کھلا اختلاف کرتے رہے ہیں اس لیے وہ مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے کانفرنس میں شرکت کرکے نہ ان کے خیالات کی صحیح صحیح ترجمانی کرتے اور نہ ان کے مقاصد کو تقویت پہنچاتے اس اداریے کا یہ نتیجہ نکلا کہ حکومت کو اپنی رائے پر نظرثانی کرنی پڑی۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں انتقال ہوا۔ رانچی سے باہر ان کے محل اور باغ کے ایک گوشہ میں قبر ہے۔

علی حسن خاں، نواب

نواب صدیق حسن خاں کے نامور فرزند اور بلند پایہ علمی شخصیت تھے۔ صفی الدولہ، حسام الملک اور شمس العلماء کے معزز خطابات سے سرفراز کیے گئے۔ تقریباً ۱۲۸۳ھ میں بھوپال میں پیدا ہوئے۔ جدید اعلیٰ تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم سے بھی بہرہ مند تھے۔ سرسید کی تعلیمی تحریک اور ندوۃ العلماء کی مذہبی اور تعلیمی تحریک میں نہ صرف شامل تھے بلکہ اس کے رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے۔ ندوہ کے کچھ مدت تک اعزازی ناظم بھی رہے تھے۔ دارالمصنفین کے اساسی ارکان میں سے تھے۔ یوپی اور خصوصاً لکھنؤ کی ہر علمی، تعلیمی اور معاشرتی اصلاحی تحریک میں ان کا نام سرفہرست رہتا تھا۔ ۱۶ نومبر ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ میں انتقال ہوا۔

نواب صاحب علم و تہذیب کی ایک نادر شخصیت تھے۔ متعدد علمی، ادبی، تاریخی، سوانحی اور مذہبی کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں۔

مولانا محمد علی، نواب صاحب کا بڑا ادب و احترام کرتے تھے۔ کچھ تو اس لیے

کہ وہ ایک بڑے باپ کے بیٹے تھے اور کچھ اس لیے کہ وہ خود بھی علم وفضل اور دولت وثروت میں ایک ممتاز شخصیت اور ریاست بھوپال کے رکن رکین تھے۔
نواب صاحب موصوف بھی مولانا محمد علی کے جوش وجذبات اسلامی کی بنا پر ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔

علی محمد خاں، محمد اودھ کی ایک چھوٹی سی لیکن نہایت معروف ریاست "محمود آباد" کے رئیس تھے۔ حکومت کی طرف سے انھیں مہاراجہ، سر اور دیگر کئی خطاب ملے ہوئے تھے۔ ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئے تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے کہ مہاراجہ صاحب محمود آباد سر علی محمد خاں علم دوست اور بڑے علمی مذاق کے آدمی تھے۔ شاعر بھی تھے ساحر تخلص کرتے تھے مولانا محمد علی کے دوستوں میں تھے۔ علی گڑھ کالج کو یونی ورسٹی بنانے کے لیے حکومت کی شرائط مان لینے کے حامی تھے۔ تعلقات کی بنا پر مولانا محمد علی بھی ان کے ہم نوا ہو گئے لیکن حسرت موہانی اور خود راجہ صاحب محمود آباد کے نام خط سے معلوم ہوتا ہے کہ یونی ورسٹی کے معاملے میں بھی محمد علی کو ان سے شدید شکایات پیدا ہو گئی تھیں اور نہرو رپورٹ کے موقع پر دونوں میں پھر اختلاف پیدا ہو گیا رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں:۔

"سیاسیات میں حصہ لیتے تھے۔ شروع میں بڑے انتہا پسند تھے۔ بعد میں سر بار کورٹ بٹلر گورنر یو پی نے انھیں قوم پروروں سے توڑ لیا اور یو پی کا ہوم ممبر بنا دیا۔ زندگی کے آخری دور میں پھر نیشنلسٹ بن گئے تھے۔"

۱۹۱۷ء اور ۱۹۲۸ء میں مسلم لیگ کے اجلاسوں کے جو کلکتہ میں ہوئے تھے، صدر راجہ صاحب ہی تھے۔ چونکہ نہرو رپورٹ کے حامیوں میں سے تھے اس لیے ۱۹۲۹ء کے اجلاس مسلم لیگ کا صدر بھی آپ ہی کو بنایا گیا تھا لیکن یہ اجلاس ملتوی ہو گیا۔ ۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت راجہ صاحب کو بھی دی گئی تھی روزنامہ انقلاب لاہور اور دوسرے اخبارات نے اس موقع پر مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے ان کے جانے پر شدید اعتراض کیا۔ انقلاب لاہور نے لکھا۔

"کوئی مسلم جماعت بھی مہاراجہ صاحب محمود آباد اور سر علی امام کی شرکت کانفرنس کو مستحسن نہیں سمجھ سکتی۔ اس لیے کہ یہ دونوں

بزرگ گزشتہ تین سال سے مسلمانوں اور ان کے اعلان کردہ مقاصد سے
کھلم کھلا اختلاف کرتے رہے ہیں اور ہندوؤں کی ہاں میں ہاں ملاتے
رہے ہیں۔ یہ دونوں مسلمان ہیں اور انھیں کانفرنس میں مسلمانوں
کے نمائندوں کی حیثیت سے ہی شریک کیا جاتا۔ لیکن ان کے
خیالات و اعمال سے صاف ظاہر ہے کہ کانفرنس میں مسلمانوں
کی صحیح نمائندگی اور ان کے خیالات کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی کرکے
انھیں تقویت نہ پہنچاتے بلکہ نقصان و خسران کا موجب بنتے۔"

واضح رہے کہ مسلمانوں کے ردعمل کو دیکھ کر حکومت نے سر علی امام کو تو مدعو ہی نہیں کیا اور مہاراجہ صاحب نے مسلم پریس کے اس ردعمل کی وجہ سے یا اپنی بیماری کی وجہ سے کانفرنس میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے تھوڑے عرصہ بعد ۱۹۳۱ء میں مہاراجہ صاحب کا انتقال ہو گیا۔

عمادی، مولانا عبداللہ موضع امرتھوا ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔ کسی درسگاہ کے طالب علم نہ رہے تھے لیکن اردو، فارسی اور عربی کے مستند ادیب اور مورخ تھے اور تقریباً ہر علم و فن سے آشنا تھے۔ البیان لکھنؤ کے ایڈیٹر، الندوہ لکھنؤ کے سب ایڈیٹر، وکیل اور تہذیب الاخلاق امرتسر کے ایڈیٹر اور الہلال کلکتہ کے سب ایڈیٹر رہے۔ اس کے بعد زمیندار لاہور میں چلے گئے۔ اور اس کی زمام ادارت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ آخر میں وہ دارالترجمہ حیدرآباد میں چلے گئے تھے۔ دائرۃ المعارف اور کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن کے مشیر اور رکن رکین ہو گئے تھے۔ متعدد تصانیف بھی ان کی یادگار ہیں لیکن ابھی تک ان کے تمام نوادرِ علمی اخبارات و رسائل میں چھپے ہوئے ہیں۔ بہت سے مضامین جن میں وہ اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے "خدا بندہ" کے نام سے چھپے تھے۔

مولانا عمادی نہایت خلیق اور ملنسار تھے اور اپنے ہر ملنے والے کی بہت تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ حیدرآباد دکن میں جہاں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ ۱۱ شوال ۱۳۶۶ھ/ ۲۸ اگست ۱۹۴۶ء کو اس جہانِ فانی سے سفر آخرت اختیار کیا۔

عنایت اللہ خاں، سردار والیٔ افغانستان امیر حبیب اللہ خاں کے بڑے بیٹے تھے اور حکومت میں معین السلطنت کے عہدے پر فائز تھے۔

غلام جیلانی خاں افغان فوج کے مشہور جنرل ۔ ۱۹۲۳ء میں امیر امان اللہ خاں کو افغانستان چھوڑنا پڑا تو ان کے ساتھ ترک وطن کرنے والوں میں غلام جیلانی خاں بھی تھے۔ ۱۹۲۶ء میں موتمر اسلامی حجاز میں افغانستان کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی تھی، اور مختلف امور کی کمیٹی "لجنۃ اقتراحات" کے بھی ایک رکن تھے۔

غلام حسین، راجہ علی گڑھ کا تعلیم و تربیت یافتہ اور ملّت کا یہ مایۂ ناز سپوت ضلع جہلم کے ایک گمنام گاؤں اور ایک غریب اور غیر معروف خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ بچپن ہی سے نہایت ذہین اور انگریزی زبان و ادب کا شوقین تھا۔ علی گڑھ کی تعلیم و تربیت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ اس کا جوہرِ عقل چمک اٹھا اور ذوق ادب سان پر چڑھ گیا۔ اپنے تعلیمی اخراجات ٹائمز آف انڈیا بمبئی، سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور اور پانیر الہ آباد میں مضمون نگاری کر کے پورے کرتے رہے۔ ۱۹۰۷ء میں تعلیم سے فراغت کے بعد وطن مالوف کا رخ کیا اور اسلامیہ ہائی اسکول ہوشیار پور کے ہیڈ ماسٹر ہو گئے اور پھر جب ۱۹۱۰ء میں مولانا محمد علی نے کلکتہ سے کامریڈ نکالا تو انھیں اس کا سب ایڈیٹر مقرر کیا۔ یہ کام ان کے ذوق کا تھا۔ جی لگا کر کام کیا اور ان کی قابلیت انگریزی دانی اور انشا پردازی کی پورے ہندوستان میں دھوم مچ گئی ۱۹۱۵ء میں مولانا محمد علی کی نظر بندی اور کامریڈ کی بندش کے بعد وہ لکھنؤ چلے گئے، اور وہاں سے نیو ایرا نامی ہفت روزہ جاری کیا اور خوب چلایا۔ نیو ایرا کا پہلا پرچہ ۷ر اپریل ۱۹۱۷ء کو نکلا تھا۔ چند ماہ بعد اگست ۱۹۱۷ء میں ایک گھوڑے سے ٹکر میں سر پھٹ گیا اور چند ہی دن بعد ۵ر اگست کو رحلت کی۔ مولانا محمد علی اس وقت نظر بند تھے۔ انھیں اس حادثے کا سخت صدمہ ہوا۔ انھوں نے ایک پُر درد نوحہ مرحوم کے انتقال پر لکھا۔ اگرچہ گنتی کے صرف دس شعر ہیں۔ یہ دل کے قاش ہیں جو انھوں نے کاغذ پر سجا دیے ہیں۔ چند شعر یہ ہیں۔

ابھی مرنا نہ تھا غلام حسین کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

کچھ تو انعام حق پرستی کے — ہم غریبوں سے بھی لیے ہوتے
اے مرے رند بادۂ حق کے — ابھی دوچار زخم پیے ہوتے
آج جو سر ہیں دل کے قاش فروش — کاش کچھ اور قافیے ہوتے

فاروق گورکھپوری محمد فاروق نام، دیوانہ تخلص، علی گڑھ کے تعلیم یافتہ ہمدرد دہلی کے ادارۂ تحریر کے ایک رکن اور محمد علی کے دوست تھے۔ افسوس کہ انھوں نے دوست کے اعتماد کو جھٹلایا، ایک ہزار روپیے لے کر چلتے بنے۔ ایک قومی خدمت گار کو دھوکا دیا اور قومی خدمت اور ملت کی تربیت کے ادارے کو نقصان پہنچایا۔ لیکن ان کی دماغی صلاحیت کا مولانا محمد علی نے اعتراف بھی کیا ہے کہ وہ ان کے خیالات کی ترجمانی کے اہل تھے بقول دریابادی کے فاروق صاحب کو مولانا کی اداشناسیوں میں ملکہ حاصل تھا۔ ہمدرد کے دورِ اول میں ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۵ء تک اور دور ثانی میں ۱۹۲۵ء کے آغاز سے مئی ۱۹۲۶ء تک ہمدرد کے چیف سب ایڈیٹر رہے اردو کے مشہور ترقی پسند ادیب اور نقاد پروفیسر مجنوں گورکھپوری جواب پاکستان میں ہیں اور کراچی میں مقیم ہیں۔ انہی صاحب کمال کی یادگار ہیں۔

فتحی بے، علی ترکی کے زعما میں سے تھے مصطفیٰ کمال کی پہلی حکومت میں وزیر داخلہ تھے۔ بڑے فاضل، بڑے بہادر اور اولوالعزم شخص تھے۔ ۱۹۳۰ء میں وہ فرانس میں ترکی کے سفیر تھے۔

فضل الحق، اے کے بنگال کے مشہور رہنما، مولوی اے کے فضل الحق ۲۶ راکتوبر ۱۸۷۳ء کو باریسال میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ ۱۸۹۳ء میں پریسیڈنسی کالج کلکتہ سے بی اے کیا۔ ۱۸۹۵ء میں ایم اے اور ۱۸۹۷ء میں یونی ورسٹی لا کالج کلکتہ سے قانون کا امتحان پاس کیا۔ ابتدا میں وکالت کی پھر سرکاری ملازمت اختیار کرلی لیکن ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کی تنسیخ کے خلاف احتجاجاً ملازمت سے استعفیٰ دے دیا، اور پریکٹس شروع کردی۔ ان کی زندگی تقسیم ملک سے قبل اور بعد میں بڑی ہنگامی گذری۔ انھوں نے کئی جماعتیں خود بنائیں۔ مسلم لیگ میں بھی شریک رہے۔ ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان پیش کرنے کا انھیں اعزاز حاصل ہوا۔ فضل الحق کی زندگی میں قائداعظم اور مسلم لیگ کے بارے میں ان کے رویے میں کئی نشیب و فراز آئے

انھیں قائداعظم کا ہدف تنقید بھی بننا پڑا۔ مسلم لیگ سے ان کا اخراج بھی عمل میں آیا۔ ملک کی آزادی کی جدوجہد میں اور مسلمانوں کے حقوق کے لیے کوششوں اور مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے میں ان کی مساعی قابل تبریک ہیں۔ ۲۷ر اپریل ۱۹۶۲ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔

فرید احمد محمود احمد عباسی کے بڑے بھائی حکیم فرید احمد عباسی، ان کے نام کے ساتھ امام طب، استاد الاطبار اور حکیم اجمل خاں کے جانشین خاص، القاب نظر آئے ہیں۔ تذکرۃ الاطبار مرتبہ حکیم ریاض احمد قریشی میں ان کے اپنے قلم سے روداد حیات یہ ہے۔

"پیدائش ۱۲۸۸ھ، علوم عربیہ کی تعلیم کے بعد مدرسہ طبیہ مجیدیہ (دہلی) میں داخل ہوا۔ ۱۳۰۶ھ میں سند ملی۔ اس کے بعد کچھ عرصہ امروہہ (ضلع مراد آباد) میں اپنے مکان پر مطب کیا۔ بعد ازاں ریاست بھیکم پور میں ملازم ہوگیا۔ تقریباً بیس سال نہایت کامیابی کے ساتھ مطب کیا۔ بعد ازاں مسیح الملک کی تحریک پر دہلی آیا اور طبیہ کالج دہلی میں وائس پرنسپل اور زنانہ طبیہ کالج کے پرنسپل کے فرائض ادا کرتا رہا۔"

مرتب تذکرۃ الاطبار کے مطابق ۱۹۶۳ء میں لاہور میں وفات پائی۔

قطب میاں پورا نام قطب الدین عبدالوالی تھا۔ لیکن قطب میاں کے عرف سے مشہور تھے۔ مولانا عبدالروٗف بن مولانا عبدالوہاب کے نامور فرزند، مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے بھتیجے، داماد اور ان کے جانشین تھے ۱۹ر رجب ۱۳۱۴ھ/ ۲۴ر دسمبر ۱۸۹۶ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ نظامیہ فرنگی محل کے فارغ التحصیل تھے بعد میں اسی مدرسہ میں مدرس بھی ہوگئے تھے۔ سیاست کے ذوق سے بھی آشنا تھے۔ تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات میں حصّہ لیا۔ خلافت کمیٹی اودھ کے صدر رہے تھے پھر بعض اختلاف کی وجہ سے اس سے الگ ہوگئے اور جمعیۃ خدام الحرمین قائم ہوئی تو اس میں شریک ہوگئے اور ملت کی خدمات حتی الوسع انجام دیں۔ اواخر اپریل یا شروع مئی ۱۹۵۴ء میں لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے لکھا ہے کہ ایک زمانے میں بڑے ہونہار اور خوش رو اور خوش طبع تھے اور حق گوئی اور حق پسندی کا جوہر ان میں اپنے

گرد و پیش کے علما سے زیادہ تھا۔

قمر پورا نام قمر علی خاں ہے۔ علی برادران کے سب سے بڑے بھائی بندہ علی خاں کے پوتے اور حافظ احمد علی کے داماد تھے۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان آگئے تھے۔ محکمۂ کسٹم میں عہدہ دار تھے۔ چند سال ہوئے انتقال ہو گیا۔

کچلو، ڈاکٹر پورا نام ڈاکٹر سیف الدین کچلو تھا۔ امرتسر کے رہنے والے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے کیمبرج کے ساتھیوں میں سے تھے قومی و ملی تحریکات میں زندگی بھر زور شور سے حصہ لیتے رہے۔ مشہور مقدمہ کراچی کے ماخوذین اور سزا یافتوں میں یہ بھی شامل تھے۔ سید رئیس احمد جعفری نے "کاروان گم گشتہ" میں ان کے بارے میں لکھا ہے۔

"مولانا محمد علی کے رفیق زنداں رہ چکے تھے۔ جلیانوالہ باغ کے حادثہ میں انھوں نے شہرت حاصل کی۔ تحریک خلافت کے زعیم ہیں۔ پھر شدھی سنگٹھن کے زمانے میں، جواب آل غزل کے طور پر انھوں نے تحریک تنظیم کی بنیاد ڈالی جو بہت مقبول ہوئی۔ ۱۹۲۷ء میں یہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سکریٹری تھے لیکن ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ کے حامی بنے۔ پھر سے کانگریس میں شریک ہو گئے اور زندگی کے آخری دن تک اپنے غیر فرقہ وارانہ مسلک پر قائم رہے۔ پاکستان کی تائید ایک لمحے کے لیے بھی نہیں کی۔ ایک وہ زمانہ بھی تھا کہ یہ "سیف الملت والدین" کہلاتے تھے یا وہ دور آیا کہ

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

تقسیم ملک کے بعد وہ ہندوستان ہی میں رہے۔ محولہ بالا شعر ان کے قیام ہندوستان کے لیے استعارۃً پیش کیا گیا ہے۔ امرتسر کی سکونت وہ تقسیم ملک سے بہت پہلے ترک کر چکے تھے اور دہلی ان کا وطن ثانی اور مرکز و محور خدمتِ قومی بن گیا تھا۔ یہیں آخری آرام گاہ کے لیے جامعہ ملیہ کے قبرستان میں جگہ پائی۔

کفایت اللہ، مولانا محمد مولد و منشا طفولیت شاہجہان پور (یوپی) تھا۔ لیکن عمر عزیز کا بیشتر حصہ دہلی میں بسر ہوا۔ اس لیے شاہجہان پوری ثم الدہلوی کی نسبت سے مشہور تھے۔ ہندوستان کے عہد

جدید میں ان سے بڑا فقیہہ اور صاحب افتا پیدا نہیں ہوا۔ انھیں باتفاق علمائے ہند مفتیٔ اعظم کہا جاتا تھا۔ آپ کے والد کا نام شیخ عنایت اللہ تھا۔ مفتی صاحب ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم شاہجہان پور میں حاصل کی۔ تکمیل کے لیے دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے نامور وارشد تلامذہ میں سے تھے۔ ۱۹۰۲ء میں مدرسہ امینیہ دہلی کے شیخ الحدیث اور مفتی مقرر ہوئے۔ اور مدرسہ کے بانی و مہتمم مولانا امین الدین کے انتقال کے بعد مدرسہ کے اہتمام کی ذمہ داری بھی آپ ہی کے کاندھوں پر آگئی۔ پچاس برس تک اسی مدرسہ میں درس حدیث دیا۔ حضرت شیخ الہند کی صحبت نے ملک و قوم کی خدمت گذاری کا جذبہ بھی پیدا کر دیا تھا۔ ۲۰ سال تک مسلسل جمعیت علمائے ہند کے صدر رہے۔ تحریک آزادی کی جدوجہد میں پیش پیش رہے اور قید و بند کی آزمائشوں سے بھی گذرے۔

مفتی صاحب اپنے علم و فضل کے لحاظ سے بین الاسلامی شخصیت تھے۔ طبقۂ علما میں اپنی متانت، تقویٰ، تفقہ فی الدین، اصابت رائے اور سیاسی بصیرت اور اخلاقی کمالات کے لیے مشہور تھے۔ یکم فروری ۱۹۵۳ء کی شب میں دہلی میں انتقال فرمایا۔ خواجہ بختیار کاکیؒ کے احاطے کے قریب دفن ہوئے۔

کملا نہرو پنڈت جواہر لال نہرو کی بیوی تھیں۔ ۱۹۱۶ء میں دہلی میں بسنت پنچمی کے دن دونوں کی شادی ہوئی تھی۔ کملا نہرو بھی ایک سیاسی کارکن تھیں اور ۱۹۳۱ء میں سول نافرمانی کی تحریک کے سلسلے میں گرفتار بھی ہوئی تھیں اور ۲۶ دن کے بعد رہائی ملی تھی۔ کملا عورتوں کے حقوق کی بہت حامی اور مردوں کے استبداد کی شدید مخالف تھیں۔ لیکن یکم جنوری ۱۹۳۱ء کو جب وہ گرفتار ہوئیں اور کسی اخبار کے نمائندے نے ان سے پیام کی درخواست کی تو انہوں نے کہا۔

"مجھے فخر ہے کہ میں اپنے شوہر کے نقش قدم پر چل رہی ہوں اور امید ہے کہ لوگ لڑائی جاری رکھیں گے۔"

پنڈت جی نے ان کے اس بیان پر لکھا ہے کہ اگر اسے سوچنے کا موقع ملتا تو شاید وہ یہ الفاظ نہ کہتی اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو عورتوں کے حقوق کا حامی اور مردوں کے استبداد کا مخالف سمجھتی تھی مگر اس وقت اس پر وہ جذبہ غالب آگیا

جو ہر بیوی کے دل میں ہوتا ہے اور ایسے مردوں کے استبداد کا بھی خیال نہیں رہا۔ اواخر فروری ۱۹۳۶ء کو انتقال ہوا۔

گلنار مولانا محمد علی کی سب سے چھوٹی صاحبزادی جن کا نکاح شعیب قریشی کے ساتھ دہلی میں ۲۹ مئی ۱۹۳۰ء کو ہوا۔ ۱۹۳۰ء میں مولانا محمد علی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن تشریف لے گئے تو گلنار اور شعیب قریشی بھی لندن میں تھے۔ اس موقع پر وہیں ہوٹل میں مولانا نے گلنار کی سالگرہ منائی تھی۔

گوہر، ذوالفقار علی خاں مولانا محمد علی کے سب سے بڑے بھائی تھے۔ مولانا شوکت علی سے بھی بڑے۔ سید محفوظ علی بدایونی نے لکھا ہے کہ ذوالفقار علی خاں ازل سے حسن پرست اور عیش پرور دماغ لے کر آئے تھے۔ ایسے دل و دماغ کو شاعری سے جتنا لگاؤ ہو تھوڑا ہے۔ داغ کے شاگرد ہوئے۔ اور گوہر تخلص اختیار کیا۔ ان کے دل اور دماغ کی اس رفتار نے جوانی میں قادیانی مذہب میں حسن و عیش کا سامان ڈھونڈھا۔ اور اس وجہ سے خاندان والوں سے الگ اور بڑی حد تک بے تعلق ہو گئے تھے۔ صرف خاص تقریبوں کے موقع پر شریک ہو جاتے تھے۔ زیادہ تر قیام قادیان میں رہتا تھا۔ علی گڈھ سے بی اے کیا تھا۔ ان کی شاعری کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے "گو بہت کم کہتے تھے لیکن اچھا کہہ لیتے تھے" ان کی اولاد نے بھی انھیں کا مذہب اختیار کیا۔ ان کے خاندان کے بعض افراد کراچی میں مقیم ہیں۔

لاجپت رائے، راجہ پنجاب کے مشہور کانگریسی رہنما تھے۔ ۱۹۲۰ء میں کانگریس کا خاص اجلاس کلکتہ میں ان کی صدارت میں ہوا تھا۔ رئیس احمد جعفری نے انھیں مہاسبھا کا رکن رکین بھی لکھا ہے۔ ۱۹۲۸ء میں جب سائمن کمیشن لاہور پہنچا تو اس کے خلاف ہندوؤں اور مسلمانوں نے لالہ لاجپت رائے، مولانا ظفر علی خاں، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، چودھری افضل حق، ڈاکٹر ستیہ پال وغیرہ کی زیر قیادت ایک فقید المثال احتجاجی جلوس نکالا — جلوس لاہور ریلوے اسٹیشن کے باہر کمیشن کے خلاف نعرے لگا رہا تھا۔ کمیشن کے ارکان اسٹیشن سے باہر آئے تو گھڑ سوار پولیس نے جس کی قیادت اسکاٹ نامی سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کر رہا تھا۔ منظاہرین پر حملہ کر دیا۔ زبردست لاٹھی چارج

میں سینکڑوں ہندو اور مسلمان زخمی ہوئے۔ اور گھوڑوں سے روندے گئے۔ لالہ لاجپت رائے کے سینے میں زخم آئے وہ چند دن بعد ۱۹۲۸ء کے اواخر میں انتقال کر گئے زخمی ہو کر گرنے کے بعد انھوں نے ہندو اور مسلمان نوجوانوں سے کہا تھا۔۔۔ "میرے بچو! میں تمھیں آخری پرنام کرتا ہوں اور آشیرباد دیتا ہوں۔ ہندوستان تمھارے حوصلوں اور ولولوں کا راستہ دیکھ رہا ہے"! ان کی موت پر ملک گیر احتجاج کیا گیا۔ بھگت سنگھ اور ان کے انقلابی ساتھی اسکاٹ کی تلاش میں تھے کہ اس کے دفتر کا ایک سارجنٹ سانڈرس نامی ان کی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ اور اس طرح نوجوانوں کے حوصلوں اور ولولوں نے ملک کو انقلاب اور آزادی کا راستہ دکھا دیا۔ رئیس احمد جعفری نے لکھا ہے کہ لاجپت رائے کا انتقال ہوا تو مولانا محمد علی بغرض علاج یورپ گئے ہوئے تھے۔ لیکن واپس آتے ہی انھوں نے جو سب سے پہلے بیان دیا ہے۔ اس میں انھوں نے لاجپت رائے کی وفات کو قابل رشک بتایا اور اپنے لیے تمنا کی کہ کاش ایسی سعادت انھیں بھی حاصل ہوتی"!

مالوی، پنڈت مدن موہن

۱۸۶۲ء میں الہ آباد کے ایک غریب خاندان میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۸۴ء میں بی اے پاس کرنے کے بعد تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ تین سال کے بعد راجہ رام پال سنگھ کی درخواست پر اخبار "ہندوستان" کی ایڈیٹری قبول کر لی اور کئی سال تک اس کے ایڈیٹر رہے۔ ۱۸۹۲ء میں وکالت کا امتحان پاس کر لیا۔ اس کے بعد سیاست میں حصہ لینے لگے۔

کانگریس کے مشہور رہنما تھے۔ ان کی صدارت میں کانگریس کے دو سالانہ اجلاس لاہور اور دہلی میں ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۸ء میں منعقد ہوئے۔ تحریک خلافت اور ترک موالات میں مسلمانوں کے شانہ بشانہ شریک رہے۔ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے داعی تھے۔ تحریک آزادی کے سلسلے میں وہ گرفتار بھی ہوئے اور جیل بھی کاٹی۔ ہندو یونی ورسٹی بنارس کا قیام ان کا زندہ جاوید کارنامہ ہے۔ ہندی زبان کی ترویج میں خاص طور پر حصہ لیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ان میں بڑی زندگی اور زندہ دلی تھی اور نوجوانوں کی طرح ہر چیز کا شوق تھا۔ اس لیے ان کی صحبت میں بڑا لطف آتا تھا۔ ان کا ایک لطیفہ رئیس احمد جعفری نے لکھا ہے کہ محمد علی ایک بار عربی وضع اختیار کر کے اسمبلی

تشریف لے گئے۔ اتفاقاً پنڈت مدن موہن مالوی سے ملاقات ہوگئی۔ مالوی جی نے دیکھا تو کہا" اخاہ! مولانا محمد علی آپ ہیں، میں تو اس لباس میں سمجھا بیگم صاحبہ بھوپال تشریف لارہی ہیں"، محمد علی نے کہا" بیگم صاحبہ بھوپال ایسی شیر دل خاتون ہیں کہ اس زنانی" مجلس میں آنا پسند نہیں کرتیں"

۱۹۳۵ء میں انتقال ہوا۔

محمد احمد دہلوی، حکیم | حاذق الملک اوّل حکیم عبدالمجید خاں کے لڑکے اور حاذق الملک ثانی حکیم محمد اجمل خاں کے بھتیجے۔ خود بھی بڑے طبیب حاذق تھے۔ ان کے دادا حکیم محمود خاں تھے جن کا نہایت غم انگیز مرثیہ حالی نے لکھا تھا۔ محمد علی سے ان کے خاندانی تعلقات تھے۔ محمد علی ان کے والد کے دوستوں میں سے تھے۔ اس لیے حکیم محمد احمد ان سے نہایت احترام، عزّت اور تکریم سے پیش آتے تھے۔

محمد علی لاہوری | قادیانیوں کی لاہوری پارٹی" جماعت احمدیہ" کے پہلے امیر اور قرآن مجید کے مشہور انگریزی مترجم مولوی محمد علی دسمبر ۱۸۷۰ء میں کپور تھلہ (مشرقی پنجاب) کے ایک موضع مرار میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام فتح الدین تھا۔ کپور تھلہ کے رندھیر ہائی اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد لاہور آگئے اور گورنمنٹ کالج سے ۱۸۹۴ء میں بی اے پاس کیا۔ ۱۸۹۶ء میں ایم اے، اور ساتھ ہی ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۹۷ء میں مرزا غلام احمد قادیانی سے متاثر ہو کر قادیانی مذہب اختیار کرلیا۔ مرزا صاحب کے انتقال کے بعد جماعت دو حصوں میں تقسیم ہو کر قادیانی پارٹی اور لاہوری پارٹی کہلائی۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو کراچی میں ان کا انتقال ہوا لیکن تدفین لاہور میں ہوئی۔

محمد علی پاشا، شہزادہ | مصر کے سابق وزیر اوقاف اور جماعت احرار مصر کے مشہور رہنما تھے۔ مولانا محمد علی کے انتقال پر انھوں نے کہا" اے معزز مسافر! یہ مصیبت بڑی ہے۔ تکلیف بھاری ہے لیکن ہم صبر کے اجر سے برداشت کرلیں۔ میں اس لیے آیا ہوں کہ تم کو سلام کہوں۔ تم مرے نہیں بلکہ زندہ ہو" انھوں نے غلاف کعبہ کا ایک ٹکڑا بھی تبرک کے طور پر تابوت پر رکھنے کے لیے عنایت کیا تھا۔

محمد میاں پورا نام محمد سعید عبدالرزاق تھا لیکن محمد میاں کے عرف سے معروف تھے۔ فرنگی محل کے مشہور عالم دین اور ملی کارکن مولانا قطب میاں کے بڑے بیٹے تھے۔ ان کی والدہ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی صاحبزادی تھیں۔ چونکہ والدہ کا انتقال ان کی اور نور میاں کی کم عمری ہی میں ہوگیا تھا اس لیے ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت ان کے عظیم نانا مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے زیرسایہ ہوئی۔ مدرسہ نظامیہ فرنگی محل میں اوّلاً قرآن مجید حفظ کیا، پھر عربی، فارسی اور علوم دینی کی تحصیل پر توجہ دی۔ ۱۹۳۰ء میں تذکرہ علمائے فرنگی محل کی تالیف کے وقت زیر تعلیم تھے۔

محمود احمد عباسی امروہہ ضلع مرادآباد کے مشہور عباسی خاندان کے فرد والد کا نام علی محمد عباسی تھا۔ ۱۴ رجمادی الثانی ۱۳۰۲ھ/ ۳۱ مارچ ۱۸۸۵ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے۔ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد ایک اسکول میں مدرس ہوگئے۔ ۱۹۰۸ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کے آفس سپرنٹنڈنٹ تھے آزادی کے بعد پاکستان آگئے تھے۔ کراچی میں قیام تھا ۱۴ رمارچ ۱۹۷۴ء کو جمعرات کے دن انتقال ہوا۔ مشہور محقق اور اہل قلم تھے۔ حقیقت قوم کمبوہ، تاریخ امروہہ (۳ جلد)، تاریخ بادشاہ بیگم، سیّد و سادات، معاویہ و یزید، تحقیق مزید بسلسلہ معاویہ و یزید (دو جلد)، سیرت ام ہانی اور متعدد کتابچے ان کی علمی یادگار ہیں۔

مولانا محمد علی کے ان کے خاندان کے تعلقات تھے۔ جیسا کہ داؤد مرحوم پرنوٹ سے معلوم ہوگا۔ مولانا محمد علی کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ محمود احمد عباسی ہمدرد میں کام کرنے کے شائق تھے۔ بلاشبہ ہمدرد سے وابستگی ایک بڑا اعزاز تھا لیکن ہمدرد کی مالی حالت ایسی نہ تھی کہ یہاں سے ان کی ہمت افزائی کی جاتی۔ مولانا محمد علی نے نہایت تفصیل کے ساتھ اور بغیر کچھ چھپائے حالات سامنے رکھ دیے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد نہ محمود احمد نے سرگرمی دکھائی اور نہ ہمدرد سے ان کی وابستگی کی نوبت آئی

محمود حسن دیوبندی، مولانا مشہور عالم دین، بلندپایہ محدث، انقلابی سیاسی رہنما، مولانا محمود حسن عام طور پر "شیخ الہند" کے لقب سے مشہور ہیں۔ ۱۸۵۱ء میں بریلی میں پیدا ہوئے۔ جہاں آپ کے والد بسلسلہ ملازمت مقیم تھے۔ والد کا نام مولانا ذوالفقار علی اور وطن آبائی دیوبند ضلع سہارنپور تھا۔ مولانا ذوالفقار علی کا شمار دارالعلوم دیوبند

کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ مولانا محمود حسن دارالعلوم دیوبند کے پہلے طالب علم تھے۔ آپ نے بعض کتابیں حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی سے بھی پڑھیں۔ انہی کی صحبت میں آپ کی سیاسی تربیت ہوئی اور ملک و ملت کی خدمت گزاری کا جذبہ دل میں پیدا ہوا۔ تکمیل تعلیم کے بعد دارالعلوم میں مدرس مقرر ہوئے، اور آپ کے ذوق علم وتدریس نے آپ کو بہت جلد دارالعلوم میں تدریس کے اعلیٰ منصب تک پہنچا دیا۔

درس وتدریس کے ساتھ طلبہ کی تربیت پر خاص توجہ فرماتے تھے۔ چنانچہ آپ کی تعلیم وتربیت اور توجہ سے علمائے دین کی ایک ایسی جماعت پیدا ہوگئی جو درس وتدریس، وعظ وتذکیر، تصوف وطریقت، تصنیف وتالیف اور ملک وملت کی رہنمائی میں پورے ملک میں سربلند ہوئی اور ان کی علمی وعملی فتوحات کی چاردانگ عالم میں دھوم مچ گئی۔

حضرت شیخ الہند کی تعلیم وتربیت سے جس طرح ان کے تلامذہ کی ایک نہیں متعدد جماعتیں تیار ہوئیں جنھوں نے ملک وملت کی مختلف میدانوں میں خدمت کی۔ طلبہ کی سیاسی تعلیم وتربیت اور جہاد آزادی کی تیاری کے لیے ثمرۃ التربیت دیوبند (۱۸۷۸ء) جمعیۃ الانصار دیوبند (۱۹۰۹ء) اور نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی (۱۹۱۳ء)، کے نام سے جماعتیں اور مراکز قائم کرائے اور ان کی رہنمائی کی۔ اسی طرح آپ کے افکار وسیرت اور مجاہدات ملی سے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بھی ایک بڑی جماعت متاثر ہوئی۔ علی برادران، ڈاکٹر انصاری، مظہرالحق، حسرت موہانی، تصدق احمد خاں شیروانی وغیرہ کا تعلق اسی جماعت سے تھا۔ آپ کی اولوالعزمیوں کا یہ عالم تھا کہ صرف مسلمانوں کے سروسامان۔ ایثار وقربانی سے ملک کی آزادی کا قصر تعمیر کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ تحریک ریشمی رومال آپ کے اسی عزم کے سلسلے کی کڑی تھی۔ ۱۹۱۵ء میں آپ کا سفر حجاز بھی اسی عزم کی تکمیل کے لیے تھا۔ لیکن شریف حسین کی ترکی خلافت سے غداری اور ۱۹۱۶ء میں مکہ مکرمہ میں آپ کی مع آپ کے ساتھیوں (مولانا حسین احمد، مولانا عزیر گل، حکیم سید نصرت حسین، اور مولوی وحید احمد) کی گرفتاری اور ریشمی رومال تحریک کے افشا سے آپ کے عزائم میں ناکامی ہوئی۔

جون ۱۹۱۹ء میں آپ اسارت مالٹا سے رہائی پاکر ہندوستان لوٹے۔ اس

کے بعد بھی آپ کے شب و روز صحت کی خرابی کے باوجود قوم اور ملت کی رہنمائی میں بسر ہوئے۔ تحریک ترک موالات میں حصہ لیا۔ علی گڈھ اور دیوبند کو قریب لانے اور مغائرت کو دور کرنے کی کوشش کی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سنگ بنیاد آپ ہی کے مبارک ہاتھوں سے رکھا گیا۔

بالآخر ملت اسلامیہ کا یہ آخری رہنما، جنگ آزادی کا یہ سالار اور علوم و معارف قرآن و حدیث کا یہ غواص ملت کو سوگوار چھوڑ کر اعلیٰ علیین کی طرف روانہ ہو گیا۔ ارتحال کا حادثہ دہلی میں ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو پیش آیا نعش کو دیوبند لے جاکر دفن کیا گیا۔

آپ کے چند رسائل بھی یادگار ہیں لیکن آپ کا اردو ترجمہ قرآن مجید، معارف قرآن کی اشاعت میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔

مصطفےٰ کمال پاشا اپنی قوم میں اتا ترک (ترکوں کا باپ) کے لقب سے مشہور ہیں ۱۸۸۱ء میں سلونیکا (ترکی) میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام علی رضا آفندی تھا جو مصطفےٰ کمال کے بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ والدہ نے ان کی تعلیم و تربیت کا مناسب انتظام کیا اور ابتدائی تعلیم کے بعد انھیں فوجی تعلیم دلائی۔ فوجی تعلیم و تربیت کی تکمیل کے بعد جنوری ۱۹۰۵ء سے عملی طور پر فوجی زندگی کا آغاز کیا۔ مصطفےٰ کمال پاشا فوج کے مختلف عہدوں پر فائز رہے اور روز بروز ترقی کرتے چلے گئے۔ فوجی زندگی کے دوران میں انھیں ملک کے سیاسی حالات کا مطالعہ کرنے کا بھی موقع ملا اور ان کی ہر نئی ترقی سیاسی حالات اور ان کے پس منظر کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع فراہم کرتی رہی لیکن ۱۹۱۹ء کے آغاز ہی سے ایسے حالات پیدا ہوئے کہ وہ ایک بھرپور سیاسی زندگی کے مالک بن گئے۔ اور رجب جولائی ۱۹۱۹ء میں انھیں ملی کانگریس کا صدر مقرر کیا گیا۔ تو وہ ملک کی سطح پر ایک سیاسی مدبر کی حیثیت سے ابھرے۔ اس سال اکتوبر میں مجلس ملی کے اجلاس میں روم کی طرف سے وکیل ملت منتخب ہوئے۔ ۱۹۲۰ء کے آغاز میں علی رضا کی وزارت نے استعفا دے دیا اور صالح پاشا نے نئی وزارت بنائی اور قسطنطنیہ پر اتحادیوں کے قبضے کے بعد نئے حالات کے تحت تبدیلیوں کو مصطفےٰ کمال پاشا نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور بحوک ملت مجلس کے صدر کی حیثیت سے اعلان کیا کہ اب حکومت کی ذمہ دار تنہا یہ مجلس ہے تو حکومت کی طرف سے ان کی موت کا فیصلہ سنا دیا

گیا۔ اب اتا ترک کو دو محاذ پر لڑنا پڑا۔ بیرونی دشمنوں میں یونانی اور اتحادی قوتیں تھیں اور ملک کے اندر خود نام نہاد اور پابند عثمانی خلافت تھی۔ اتا ترک نے ہر محاذ پر اپنے ہر دشمن کو نیچا دکھایا۔ یونانیوں کو آرمینیا اور سقاریہ میں شکست دی۔ انگریزوں سے باطوم کا شہر لیا۔ اناطیر کو آزاد کرایا۔ اتحادی قوتوں سے اپنی قوت اور قومی حیثیت کا اعتراف کروایا اور معاہدہ سیورے کی ذلت آمیز شرائط کا خاتمہ کرو کے نیا معاہدہ کیا اور ۲۰ مارچ ۱۹۲۴ء کو عثمانی خلافت کا خاتمہ کر کے ترکی سے دوہرے نظام کو ختم کر کے ترکی جمہوریہ قائم کی اور ایک خاندان کی حکومت کی بجائے ملت کی حاکمیت کا حق منوایا۔ ہندوستان میں ان کے متعلق ایک زمانے تک بڑی غلط فہمی پائی جاتی رہی لیکن رفتہ رفتہ حقائق سامنے آئے اور یہ بات عام طور پر تسلیم کرلی گئی کہ مصطفیٰ کمال پاشا ترکی کا نجات دہندہ، جمہوریہ ترکی کا بانی، محسن قوم، اور واقعی اتا ترک اور ترکی قوم کا ابدی قائد تھا۔ انھیں ان کی وفات تک چار بار جمہوریہ ترکیہ کا صدر مقرر کیا گیا۔ ۱۰ نومبر ۱۹۳۸ء کو استنبول میں ان کا انتقال ہوا۔ اور انقرہ میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

مظہر الحق پٹنہ کے مشہور بیرسٹر تھے۔ ۲۱ دسمبر ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۸۸ء میں تعلیم کے لیے انگلستان گئے۔ اور ۱۸۹۱ء میں وکالت کی ڈگری لے کر وطن لوٹے۔ کلکتہ ہائی کورٹ کے جج، ایڈوکیٹ ہو کر بانکی پور میں پریکٹس شروع کی۔ متعدد عدالتی عہدوں پر بھی کام کیا۔ پھر وکالت کی۔ ترک موالات کے دور میں وکالت چھوڑ دی تھی اور "صداقت آشرم" قائم کرلیا تھا۔ پہلی بار وہ کل ہند سطح پر مچھلی بازار کان پور کی مسجد کے مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں ابھرے تھے۔ اس کے بعد ان کی شخصیت ہندوستان کے سیاسی مطلع پر ہمیشہ نمایاں ہی رہی قومی تحریک میں بہار میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ مرحوم کی قومی و سیاسی حیثیت تو الگ ہے ان کی علمی و اخلاقی حیثیت بھی کچھ کم قابل ذکر نہیں ہے۔ وہ فارسی سے واقف، عربی سے آشنا، انگریزی کے ادیب و خطیب اور فلسفہ کے نہایت دقیقہ رس طالب العلم تھے۔ ان کے علمی کارناموں کا آغاز طوفان نوح کی بحث سے ہوا۔ اپنچ پٹنہ اور وقت گورکھپور ان کے ابتدائی علمی مباحث کے جولان گاہ تھے۔ ان کی سب سے آخری علمی تحریر وہ ہے جو ابھی پونہ سے شائع ہونے والی انگریزی کی کتاب تصوف اور

روحانیت پر مقدم ہے۔ وہ نسباً فاروقی تھے۔ اس لیے ان کی اخلاقی قوت و جرأت کیا سلطنت اور کیا قوم دونوں کے مقابلے میں برابر تھی۔ ۲ر جنوری ۱۹۳۰ء کو وطن مالوف پٹنہ میں ان کا انتقال ہوا۔

معظم علی

معظم علی بی اے بیرسٹر ایٹ لا، مولانا محمد علی کے خسر اور چچا زاد بھائی عظمت علی خاں بن اصغر علی خاں کے بیٹے رام پور کے رہنے والے اور مولانا محمد علی کے منجھلے سالے تھے۔ علی برادران کے زمانۂ اسیری ۱۹۲۱ء ۱۹۲۳ء میں مرکزی خلافت کمیٹی کے جنرل سکریٹری رہے۔ باقی پوری میں بیرسٹری کرتے تھے۔ بعد کو رام پور اور اندور کی ریاستی ہائی کورٹوں کے چیف جج ہو گئے تھے۔

مہر، غلام رسول

ہندوستان پاکستان کے نامور صحافی، بلند پایہ مصنف، صاحب طرز ادیب اور شاعر مولانا غلام رسول مہر ۱۵ اپریل ۱۸۹۵ء کو ضلع جالندھر (مشرقی پنجاب) کے ایک گاؤں پھول پور میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام چودھری محمد علی خاں (ف ۱۹۱۷ء) تھا۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب میں ہوئی۔ میٹرک کا امتحان مشن ہائی اسکول جالندھر سے پاس کیا۔ بی اے اسلامیہ کالج لاہور سے ۱۹۱۵ء میں کیا۔

مہر صاحب نے عملی زندگی پایۂ گاہ وقار الامراء (حیدر آباد دکن) میں محکمہ تعلیم انسپکٹر آف اسکولز کی حیثیت سے شروع کی۔ تقریباً پانچ سال کے بعد ترک ملازمت کرکے وطن واپس لوٹ آئے۔ ۱۹۲۱ء میں زمیندار کے عملہ ادارت میں شریک ہوئے ۱۹۲۷ء سے اپنا اخبار انقلاب جاری کیا جو ۱۹۴۹ء تک جاری رہا۔ انھوں نے اگرچہ سیاست میں حصہ نہیں لیا لیکن ملک کی سیاسی تحریکات کو مختلف نشیب و فراز میں بہت قریب سے دیکھا اور مختلف رہنماؤں کے بارے میں ان کی خاص رائے تھی۔ اپنے عہد کے تمام اکابر سے ان کے قریبی تعلقات تھے۔ علامہ اقبال کے ہم جلیس اور مولانا ابو الکلام آزاد کے وہ بڑے معتقد تھے۔

انقلاب بند ہونے کے بعد ان کے اوقات گرامی کا بیشتر حصہ تصنیف و تالیف اور مطالعے میں بسر ہوتا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ سو تصانیف و تراجم اور مرتبہ کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں سیرت و اخلاق کے محاسن سے بھی سرفراز کیا تھا۔ ۱۶ر نومبر ۱۹۷۱ء کو لاہور میں ان کا انتقال ہو گیا۔

مولانا محمد علی اور مولانا مہر، دونوں کے انداز فکر میں بڑا فرق تھا۔ یہ فرق

مسئلہ حجاز کے متعلقات اور سلطان عبدالعزیز کے اصلاحی اقدامات میں بہت نمایاں ہو گیا۔ مہر صاحب کا تعلق مولانا آزاد اور پنجاب کے ان علمائے حق سے تھا جن کے خلاف محمد علی کا قلم آگ برساتا اور زبان شعلے اگلتی تھی۔ مولانا مہر صاحب زمیندار اور انقلاب میں ان کے دفاع اور ترجمانی کا فرض انجام دیتے رہے لیکن ذاتی تعلقات اور رشتۂ نیازمندی میں اپنی طرف سے فرق نہ آنے دیا۔

مسٹن، سر جیمس ۱۲ جون ۱۸۶۵ء کو اولڈ ابرڈین میں پیدا ہوئے۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا کی ملازمت اختیار کی ۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۳ء تک یوپی گورنمنٹ کے فنانشل سکریٹری رہے۔ ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۲ء تک ہندوستان کی مرکزی حکومت میں محکمہ فنانس کے سکریٹری رہے۔ ۱۹۱۲ء میں انھیں یوپی کا گورنر مقرر کیا گیا۔ ۱۹۱۹ء میں انھیں گورنر جنرل کی کونسل کا فنانس ممبر مقرر کیا گیا۔ ۱۹۱۹ء میں ملازمت سے سبک دوش ہو گئے۔ انگلستان واپس جانے کے بعد بھی وہ مختلف کمیشنوں اور سوسائٹیوں کے ممبر اور چیرمین بنائے گئے ۱۹۳۶ء میں انھوں نے لبرل پارٹی آرگنائزیشن بنائی اور خود ہی اس کے صدر بنے۔ ۷ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو انتقال ہوا۔

نذیر احمد، حکیم آبائی وطن امروہہ ضلع مرادآباد تھا۔ طب کی تعلیم دہلی میں حاصل کی۔ طبیہ کالج دہلی کے فارغ التحصیل تھے۔ حکیم اجمل خاں کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے اور آپ ہی کے مطب میں طب کی عملی تعلیم حاصل کی پھر اپنا الگ مطب بھی قائم کیا۔ طبیہ کالج دہلی میں پروفیسر بھی تھے۔ اہل دہلی کو ان کی ذات سے بڑا فائدہ پہنچا۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان آگئے تھے اور "پاکستان طبی کانفرنس" کے نائب صدر تھے۔ مئی ۱۹۶۴ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔

نشاط النسا بیگم برصغیر پاک و ہند کے مشہور سیاسی رہنما اور نغز گو شاعر مولانا حسرت موہانی کی اہلیہ تھیں والد کا نام شبیر حسن تھا تقریباً ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئیں۔ باحیثیت اور صاحب ثروت باپ کی بیٹی تھیں ناز و نعم میں پرورش پائی تھی۔ لیکن شوہر کی پر آلام و مصائب زندگی میں ایسا ساتھ دیا کہ ماں باپ کے گھر کی عیش و عشرت کو پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔

وہ خود بھی سیاسی ذوق رکھتی تھیں۔ کانگریس کی مجلس عاملہ کی رکن رہ چکی تھیں۔ ستمبر ۱۹۲۳ء میں کانگریس کے اسپیشل اجلاس میں بہ نفس نفیس شرکت کی تھی

مذہبی ذوق و جذبہ بھی قابل رشک تھا۔ مولانا شاہ عبدالوہاب فرنگی محلی سے بیعت تھیں متعدد حج کیے تھے ۸ اپریل ۱۹۳۷ء کو کان پور میں انتقال ہوا۔ مولانا حسرت موہانی کو ان کے انتقال سے سخت صدمہ ہوا۔ حسرت کی بعض غزلوں کا محبوب وہی ہیں انتقال پر ایک معرکہ آرا غزل لکھی جس کا ہر شعر درد و غم میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس غزل کا پہلا شعر ہے ؎

عاشقی کا حوصلہ بے کار ہے تیرے بغیر
آرزو کی زندگی بے کار ہے تیرے بغیر

نعیم مولانا مفتی محمد نعیم صاحب، لدھیانہ کے مشہور خانوادۂ علمی کے ایک اہم فرد، والد کا نام مولانا شاہ محمد اور دادا کا نام مولانا شاہ عبدالقادر تھا جنھوں نے اپنے چار بیٹوں اور بھائیوں کے ساتھ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں عملاً حصّہ لیا تھا اور چاندنی چوک دہلی کے معرکے میں دادِ شجاعت دی تھی۔ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد خاندان نے ایک عرصے تک روپوشی کی زندگی بسر کی۔ ان کی اولاد نے بھی علم دین کی اشاعت اور درس و تدریس کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی حصّہ لیا اور ملک و قوم اور ملت اسلامیہ کی بہترین خدمات انجام دیں۔ مولانا مفتی محمد نعیم صاحب رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے چچا اور مولانا محمد زکریا کے بھائی تھے۔ لدھیانہ اور پنجاب کانگریس میں مختلف عہدوں پر فائز رہے، اور تقسیم ملک تک جمعیتہ علمائے ہند کے نائب صدر رہے۔

مولانا محمد نعیم نہایت متقی، پرہیزگار، عابد و زاہد، بلند پایہ عالم دین، اعلیٰ درجہ کے مدرس اور علوم اسلامی کے ماہر تھے انھوں نے بلا امتیاز مذہب و ملت تمام اہل وطن کی خدمت کی۔ ملک کی آزادی کے لیے قید و بند کی سختیاں برداشت کیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور ان کے اخلاص و دیانت پر ہر شخص اعتماد کرتا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد مغربی پنجاب منتقل ہوگئے تھے۔ ان کے اخلاف سعید و صالح لائل پور، منٹگمری، رحیم یار خاں وغیرہ میں ہیں اور اپنے نامور آبا کی روایت کے مطابق اسلام اور قوم و ملت کی خدمت میں معروف ہیں۔

نور میاں مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے نام ایک خط میں محمد میاں کے نام کے ساتھ "چھوٹے صاحبزادے" کا لفظ آیا ہے۔ اس سے مراد محمد میاں کے چھوٹے بھائی نور میاں ہیں۔ اصل نام "محمد نور عبدالعلی" تھا۔ نور میاں کے عرف

سے معروف و مشہور تھے ۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی صاحبزادی کے بطن سے مولانا قطب میاں کے چھوٹے صاحبزادے تھے ۔ ۱۹۳۰ء میں جب تذکرہ علمائے فرنگی محل تالیف ہوا تو مدرسہ نظامیہ فرنگی محل میں قرآن مجید حفظ کر چکنے کے بعد درس نظامی کی تحصیل میں مصروف تھے ۔ مولانا محمد عنایت اللہ نے ان کے بارے میں لکھا تھا کہ "ذکاوت اور تیزی، شرم و حیا، شوقِ علم میں اپنے نامور محترم نانا کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔"

نہرو، پنڈت جواہرلال

آزاد ہندوستان کے پہلے وزیراعظم پنڈت جواہرلال نہرو سیاست داں ہی نہیں ایک مفکر اور بلند پایہ ادیب بھی تھے ۔ ۱۴ نومبر ۱۸۸۹ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کا انتظام گھر پر کیا گیا ۔ پھر انگلستان بھیجے گئے جہاں ہیرو، کیمبرج میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد انرٹمپل سے بیرسٹری کی سند حاصل کی اور ۱۹۱۲ء میں واپس ہندوستان آئے۔ عملی زندگی کا آغاز وکالت سے کیا۔ سیاست سے شروع ہی سے دلچسپی تھی ابتدا میں ہوم رول لیگ کی ہلکی پھلکی سیاست سے دلچسپی تھی ۔ پھر کانگریس میں شریک ہوئے اور آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے ۔ متعدد بار کانگریس کے صدر بنائے گئے ۔ آزادی کامل کا رزولیوشن ۱۹۲۹ء میں انھیں کی صدارت میں پاس ہوا ۔ آزاد ہندوستان کے وہ پہلے وزیراعظم تھے ۔ ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کو دہلی میں انتقال ہوا ۔ اپنی سمادھی کے پتھر (لوح مزار) کے لیے انھوں نے یہ الفاظ پسند کیے تھے ۔

"اگر میرے ملک کے عوام پسند کریں تو میں یہ کہلانا چاہوں گا ۔ یہ وہ آدمی تھا جس نے ہندوستان اور اس کے عوام سے محبت کی اور انھوں نے اس کے عوض اپنی بے پناہ محبت اس پر نچھاور کی۔"

مولانا محمد علی، جواہرلال کو پسند کرتے تھے ۔ جب وہ دسمبر ۱۹۲۳ء میں کانگریس کے صدر منتخب کیے گئے تو جواہرلال کو اصرار کر کے ایک جنرل سکریٹری مقرر کیا ۔ مذہبی خیالات کے اعتبار سے دونوں میں بعدالمشرقین تھا ۔ اس کے باوجود اخلاص و محبت اور وضع داری کا برتاؤ دونوں طرف سے موجود تھا ۔ مولانا محمد علی بزرگانہ شفقت سے انھیں جھڑک بھی دیتے تھے ۔ جواہرلال نے اپنی خود نوشت "میری کہانی" میں ان کا ذکر محبت اور عقیدت کے ساتھ کیا ہے ۔

نہرو، پنڈت موتی لال الہ آباد کے کشمیری النسل نہرو خاندان کے رکن رکین مشہور ایڈووکیٹ، سیاسی رہنما ۶ مئی ۱۸۶۱ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۹ء میں امرتسر کے اور ۱۹۲۸ء میں کلکتہ کے کانگریس کے اجلاسوں کے صدر رہے۔ ۱۹۲۸ء میں کانگریس نے جو دستوری کمیٹی بنائی تھی اس کے صدر پنڈت موتی لال نہرو تھے اور انہی کی نسبت سے اس کمیٹی کی رپورٹ کو "نہرو رپورٹ" کہا جاتا ہے۔ فارسی داں تھے، اردو نہایت عمدہ بولتے بھی تھے اور لکھتے بھی تھے۔ مسلم کلچر کے دلدادہ تھے۔ رئیس احمد جعفری نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ صحیح معنوں میں مدبّر اور سیاست داں تھے۔ مذہبی پابندیوں پر کبھی عامل نہیں رہے۔ علی الاعلان گوشت کھاتے اور مرغ مسلّم تناول فرماتے تھے۔ لباس بھی مسلمانوں کا پہنتے تھے۔ ان کے دوستوں کی فہرست میں ہندوؤں سے زیادہ مسلمانوں کے نام تھے۔ حق دوستی ادا کرنے میں وہ یکتا تھے۔ انھوں نے کبھی اپنے کسی دوست کو دھوکا نہیں دیا۔ ان کی شخصیت کا دوسرا پہلو یہ بھی تھا کہ بقول رئیس احمد جعفری "بلا کے ضدی، خود سر، خودرائے اور آمرانہ ذہنیت کے مالک تھے۔ گاندھی جی اگر کسی سے جھجکتے تھے تو وہ موتی لال ہی تھے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے ان کے مزاج و سیرت کے بارے میں لکھا ہے۔

"والد کسی چیز میں اعتدال پسند نہ تھے بجز سیاست کے، اور اس میں بھی ان کی طبیعت اپنا رنگ دکھا رہی ہے یعنی رفتہ رفتہ یہ رہا سہا اعتدال بھی غائب ہوگیا۔ ان جیسا قوی جذبات، جوشیلے مزاج مغرور طبیعت اور مضبوط ارادے کا آدمی اعتدال پسندی سے کوسوں دور تھا"

میرا خیال ہے اوّل الذکر مصنّف اور ثانی الذکر صاحب قلم بیٹے، دونوں نے ایک ہی بات کہی ہے۔

۶ فروری ۱۹۳۱ء کو لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ نعش کو الہ آباد لے جایا گیا اور وہیں ۷ فروری کو آخری رسوم ادا کی گئیں۔

نیرنگ، غلام بھیک غلام بھیک نام اور نیرنگ تخلص تھا۔ ستمبر ۱۸۷۶ء میں ضلع انبالہ (پنجاب) کے موضع دورانہ میں پیدا ہوئے۔

انبالہ اور لاہور میں تعلیم پائی۔ ۱۹۰۹ء میں سرکاری وکیل کی حیثیت سے عملی زندگی شروع کی۔ ۱۹۲۰ء میں تحریک ترک موالات سے متاثر ہو کر سرکاری ملازمت سے قطع تعلق کر لیا۔ اور تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات کو کامیاب بنانے کے لیے ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ سماجی خدمت کا شوق شروع ہی سے تھا اور متعدد تعلیمی، سماجی، اصلاحی انجمنوں کے روح رواں تھے اور صدر، سکریٹری کی حیثیت سے فرائض انجام دیے سرسید کی تعلیمی تحریک اور مسلم لیگ کی سیاسی تحریک کے سرگرم کارکن تھے۔ تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد ملک میں شدھی سنگھٹن اور تبلیغ کی تحریکات شروع ہوئیں۔ تو انھوں نے انبالہ میں انجمن تبلیغ الاسلام کے نام سے ایک انجمن قائم کی اور اس کے ذریعے شدھی کی تحریک کے اثرات سے مسلمانوں کو بچانے اور اشاعت و تبلیغ اسلام کی ملک گیر تحریک شروع کی۔

نیرنگ ایک سماجی اور سیاسی رہنما ہونے کے ساتھ بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ ان کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور چلے آئے تھے۔ یہیں ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو وفات پائی اور میانی صاحب کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں۔

وحیدالدین، سلطان

سلطان وحیدالدین سلطان محمد سادس کے لقب سے سلطان رشاد کے انتقال کے بعد ۳ جولائی ۱۹۱۸ء کو تخت نشین ہوئے۔ ان کا عہد بھی مصائب سے پُر تھا۔ سلطان مفاد پرستوں کے دام تزویر میں گرفتار اور اتحادی قوتوں کے آلہ کار بن گئے تھے۔ ترکوں میں ان کے خلاف اشتعال بہت بڑھ گیا تو ۱۷ نومبر ۱۹۲۲ء کو خفیہ طور پر ایک برطانوی جہاز میں سوار ہو کر ملک سے بھاگ کر جزیرہ مالٹا چلے گئے۔ ان کی جگہ خلیفہ عبدالمجید تخت نشین ہوئے۔ جو ۳ مارچ ۱۹۲۴ء تک منصب خلافت کے خاتمے تک خلیفہ رہے۔ ۳ مارچ کو انھیں خلافت سے معزول کر کے ملک سے باہر روانہ کر دیا گیا۔

وقار الملک

مشتاق حسین نام اور انتصار جنگ وقار الملک خطاب تھا جو انھیں ریاست حیدرآباد دکن کی جانب سے حسن خدمات کے اعتراف میں ملا تھا۔ ۲۹ محرم ۱۲۵۷ھ (۱۸۳۹ء) کو موضع سراوہ (ضلع میرٹھ) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ فضل حسین تھا۔ کچھ عرصہ سرکاری اسکول میں پڑھنے کے علاوہ قدیم طرز پر عربی اور فارسی کی تحصیل کی تھی۔ ان زبانوں میں بڑی مہارت اور

ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ ان کا تعلق اس جماعت سے تھا جس نے قدیم طرز پر تعلیم حاصل کی تھی لیکن اپنی اعلیٰ دماغی صلاحیتوں کی بنا پر جدید علمی و تعلیمی تحریک کی رہنمائی کی۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے انھیں "ہمارے کارفرما قافلے کا آخری مسافر" لکھا ہے۔

عملی زندگی کا آغاز ۱۸۵۹ء میں ایک مدرس کی حیثیت سے کیا۔ ۶۱-۱۸۶۰ء میں بہ زمانہ قحط سالی امروہہ کے محتاج خانہ کے منتظم مقرر ہوئے۔ یہاں سے ان پر کامیابی اور ترقی کی راہیں کھل گئیں اور اپنی قابلیت، دیانت، فرض شناسی اور مسلسل جدوجہد کی بنا پر نائب تحصیل دار کے عہدے تک ترقی کی۔ کچھ عرصہ سرسید احمد خاں کے ماتحت کام کیا تھا۔ انھوں نے ان کی اعلیٰ دماغی صلاحیت اور سیرت کے محاسن کی بنا پر حیدرآباد دکن کے بعض اعیان سے تعارف کرایا۔ اور اس طرح وہ حیدرآباد دکن پہنچ گئے ایک عرصہ تک ریاست کی ترقی میں دل و جان سے حصہ لیا اور ۱۸۹۲ء میں نیک نامی کے ساتھ پنشن حاصل کی۔ نواب محسن الملک کے انتقال کے بعد آپ کو علی گڈھ کالج کا سکریٹری مقرر کیا گیا۔ ۱۹۱۲ء میں اس ذمہ داری سے سبک دوش ہو کر امروہہ چلے گئے تھے۔

وقار الملک اعلیٰ پلئے کے محقق اور مصنف بھی تھے۔ تہذیب الاخلاق میں ان کے متعدد مضامین شائع ہوئے۔ سرسید کی تعلیمی تحریک کے وہ ایک باوقار رہنما تھے۔ نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے لکھا ہے۔

"میرے دل میں سرسید کے تمام رفقا میں ان کی عزت بلحاظ صداقت، کریکٹر کی مضبوطی اور دین داری کے سب سے زیادہ ہے"

سید سلیمان ندوی نے ان کے انتقال کو "اولوالعزمانہ اخلاق کی گمشدگی" سے تعبیر کیا ہے۔ وہ اپنے افکار کی سلامتی اور اخلاق کی بلندی کی بنا پر وقت کے اکابر علمائے دین تھے جن کا تعلق دیوبند اور دہلی کے شاہ ولی اللہی مکتبۂ فکر سے تھا۔ ممدوح محترم تھے مولانا عبید اللہ سندھی نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے ایماء و مشورہ سے اپنے کام کا مرکز دیوبند سے دہلی منتقل کیا اور نظارۃ المعارف القرآنیہ کے نام سے انقلابی قرآنی تعلیم کا مدرسہ قائم کیا تو شیخ الہند نے اس مرکز و مدرسہ کا سرپرست حکیم محمد اجمل خاں کے ساتھ نواب وقار الملک کو بھی بنایا تھا۔ یہ بات ان کی سیرت اور ان کے افکار کی بلندی کا بہت بڑا اعتراف اور جدید تعلیمی تحریک کے رہنما

پر بہت اعتماد تھا۔ محمد علی نے جس عقیدت و ارادت کے ساتھ ان کی خدمت میں خط لکھا وہ واقعی اسی عقیدت و ارادت اور احترام کے مستحق تھے۔

۲۸ جنوری ۱۹۱۷ء کو امروہہ میں انتقال فرمایا۔ علامہ اقبال نے تاریخ کہی۔ "وقار الملک انجام بخیر" اس سے سنہ ہجری ۱۳۳۵ نکلتا ہے۔

ختم شد

فہرست

تذکرہ رجال مکتوبات رئیس الاحرار

کتابخانہ / محمد بہاؤ الدین موسیٰ

مکتوباتِ جوہر

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کے نادر مکاتیب کا

ایک اور بے نظیر مجموعہ

نواب محسن الملک، سید محفوظ علی بدایونی، قاضی عبد الغفار، علامہ سید سلیمان ندوی، مسعود علی ندوی، مہاتما گاندھی، ڈاکٹر ذاکر حسین، نواب صاحب جاورہ محمد عرفان، ظفر الملک علوی، سید محمد جعفری، ضیاء الدین احمد برنی وغیرہ مشاہیر

اور

والدہ، بیوی، بیٹی اور متعدد دیگر افرادِ خاندان کے نام نادر خطوط

مولانا عبد الماجد دریا بادی کے نام در خطوط جو اُن کے اپنے مجموعہ "خطوطِ مشاہیر" میں بھی نہیں

سیاسی مسائل، مذہبی افکار، علمی نکات، گرد و پیش کے مطالعے، معاصرین کے بارے میں دلچسپ معلومات، بیرونِ ہند پاکستان کے مشاہدات اور زندگی کے تجربات سے بھرپور

ادب و انشا کا بے نظیر شاہکار اور زبان و بیان کی دل آویزی کا بے مثال مرقع

محمد علی کے جوشِ جذبات اور پختہ و بلند فکر کا حسین امتزاج

مولانا محمد علی جوہر کی اڑتالیسویں برسی کے موقع پر

۵ جنوری ۱۹۷۹ء کو ایک اور یادگار مجموعہ خطوط

مفصل مقدمہ، مفید حواشی اور رجالِ خطوط کا معلومات افزا تذکرہ